سامانِ وجود

بانو قدسیہ

فہرست

ابن آدم

جمیلہ اب کینچوے کی طرح کبھی آگے کبھی پیچھے سوچنے لگی تھی۔
کبھی دل میں خیال اٹھتا کہ بے جی کو ان کے کئے کی سزا کیوں نہ ملی؟ اللہ آخری لمحے تک ان پر کیوں مہربان رہا؟ پھر اس خیال پر گہرا پچھتاوا اٹھتا کہ میں بھی کیسی اولاد ہوں، اپنی ماں کے لئے میرے دل میں کیسے برے برے خیال اٹھتے ہیں۔ میں ان کی سزا کے لئے کیسا الٹا ارمان رکھتی ہوں۔
ایسے میں جمیلہ احساس جرم تلے پستی، اپنے سے جھگڑتی اور پھر جھلا جھل فرافر آنسو اس کے گالوں پر پھیلتے۔ بہت سال سے دولت کی ریل پیل نے اس کے مسائل آسان کر دیے تھے اور آنسو وافر تعداد میں یوں نہ بہتے تھے.....
لیکن بے جی کو معاف نہ کر سکنے پر اس کے دل میں اپنے ہی خلاف غم و غصے کی جو کیفیت اٹھتی، اس پر بھی اسے اختیار نہ تھا۔ ایسے میں اپنے آپ کو کوستی، ماں جی پر ترس کھاتی تو بے تحاشا آنسو فرش پر گرنے لگتے۔ احساس جرم فتنہ پرور اسے پینے لگتا۔
تب بھی سنگ مرمر کے چکنے فرش پر جا بجا جمیلہ کے آنسو بوند بوند پھیلے تھے۔ شاہد دفتر جانے لگا تو ڈریسنگ ٹیبل کے قریب بریف کیس رکھتے ہوئے اس نے پوچھا: "یہ فرش پر پانی کے قطرے کیسے ہیں، جمیلہ؟"
جمیلہ، تین جوان بچوں کی ماں، چپ چاپ پلنگ پر لیٹی رہی۔ برسوں سے وہ ناشتے کی میز پر نہ جاتی تھی۔ شاہد کب اور کیسے تیار ہو کر بزنس آفس جاتا، اس کی اسے خبر نہ تھی۔
"اپنے پیارے ملازموں سے کہئے جب پانی اندر لائیں تو احتیاط برتیں۔ فرش کی

ساری خوبصورتی ذرا سی گرد اور تھوڑے سے پانی سے برباد ہو جاتی ہے۔" شاہد کے نتھنے پھڑپھڑائے۔ وہ خشکی باز نہیں تھا لیکن ذرا سی کشیدگی میں اس کے نتھنے نمونیا کے مریض کی طرح لرزنے لگتے.... اس نے بریف کیس اٹھایا اور رُنکھا سا بغیر سلام دعا کے رخصت ہو گیا۔

اصل میں شاہد کا مسئلہ بھی سنگ مرمر پر پانی کے چھینٹوں کا نہیں تھا۔ وہ بھی اپنی تجویزوں کے گرداب میں گھمن گھیری کھا رہا تھا۔ اس کا بزنس ایک عرصے سے کامیابی کی رکاب پکڑے سرپٹ بھاگتا رہا۔ وہ ایک فیکٹری سے دوسری کی جانب بڑے حوصلے اور ثابت قدمی سے بڑھا۔ جاپان اور جرمنی کی کئی فرموں سے اس کا بزنس چل رہا تھا۔ اس وقت اس کی بارہ فیکٹریاں اور کئی پلازے تعمیر ہو چکے تھے۔ پھر وہ سٹاک ایکسچینج کا ممبر بھی تھا' وہاں کی آمدنی بے تحاشا تھی۔ سی این این پر وہ کئی بار بزنس نیوز کا حصہ بن چکا تھا۔

جمیلہ ہر طرح سے اس کی نصف بہتر تھی۔ جونہی فیشن کروٹ لیتا' وہ کاروباری طبقے میں سب سے پہلے رہن سہن اور آرائش بدل کر صف اول میں آ جاتی۔ سال بھر پہلے جب جمیلہ نے چپس کے پختہ فرش تڑوا کر سارے گھر میں اطالوی سنگ مرمر لگوایا تو شاہد کا ملٹی نیشنل بزنس ٹھیک ٹھاک تھا۔ سنگ مرمر بچھانے کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ صاف ستھرے فرش پولیوشن فری ہوتے ہیں جبکہ قالینوں سے ڈھکے فرشوں سے بُو اٹھتی ہے جو بالکل ہائی جینک نہیں.... درپردہ وجہ سٹیٹس تھی۔ جمیلہ اپنے شوہر کی حیثیت کا خوب خیال رکھتی تھی۔

سارے فرش لگ چکنے کے بعد چھوٹے چھوٹے ایرانی' پاکستانی' چینی قالین کمروں میں بچھائے گئے۔ کرسٹل کے چھوٹے بڑے ڈیکوریشن پیس اٹھا دیئے گئے۔ پیتل اور کانسی کے پرانے برتن' لکڑی کی چترالی بنچیں' سندھ کی رلی' بلوچستان کی شیشے جڑاؤ چادریں' کافرستان کے دروازے جابجا سجائے گئے۔ گھر کو محل کی طرح نوادرات کی مدد کے ساتھ نئے اور پرانے کے امتزاج سے میوزیم کی طرح پُرہول بنایا گیا جہاں پہنچ کر زائرین کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔

کرسٹل اور چپس کا عہد گزر گیا۔

لیکن جمیلہ اور اس کے کامیاب شوہر کو علم نہ تھا کہ انسان بھی کبھی کبھی وقت گزرنے پر ان فیشن نہیں رہ سکتا۔ اس کی کامیابی کا عہد بھی گزر جاتا ہے۔ جب جمیلہ کا گھر

میوزیم بن گیا تو پتہ نہیں کیوں اور کیسے شاہد کے حالات نے بھی پلٹا کھایا.... وہ اپنے میوزیم سے محل میں کسی گزرے عہد کا فرعون نظر آنے لگا۔ پہلے لیو کمپنی نے اس کے کاروبار سے سارا اثاثہ نکال لیا۔ پھر جرمنی کے طاقتور تاجر ہول برگ سے جھگڑا ہوا۔ تقریباً دس ملین کا سالانہ کاروبار چل رہا تھا' اب اسی قدر رقم آپس کے مقدمے میں صرف ہونے لگی۔ بارشوں کے تسلسل نے گلبرگ والے پلازے کی کمر توڑ دی۔ ایک روز چوتھی منزل کی چھت رات کے پچھلے پہر جواب دے گئی۔ سارا پلازا اپنے وزن سے چور چور ہو گیا۔ دکانداروں نے چھوٹے موٹے مقدمے تو کھڑے کیے ہی تھے' شاہد کا کروڑوں کا سامان جو تہ خانے میں دھرا تھا' ملبہ بن گیا۔

شاہد ساری عمر کامیابی کا مکٹ سجائے تجویز کا حامی' عقل کا پیروکار رہا۔ پے در پے کامیابیوں نے اسے اپنی قوت پر اعتماد کرنا سکھایا تھا۔ ہر تجویز کارآمد' پلاننگ بے مثل' ہائیر اینڈ فائر کی پالیسی درست۔ مایا داس کی طرح وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتا' سونا بن جاتی۔ سوچتا رہ گیا کہ آخر یہ ناکامی کی چیونٹی کہاں سے ہاتھی کی سونڈ میں داخل ہوئی۔ اسے ابرہہ پر گرنے والی کنکریوں کے سرچشمے کی تلاش تھی..... ساری کاروباری برادری کا خیال تھا کہ معاشی معاملات میں مارکیٹ کی سمجھ' پیسہ انوسٹ کرنے اور بیچنے خریدنے میں شاہد کی چھٹی حس اور اس کی فراست کا کوئی مدمقابل نہیں۔ مدھم رنگ' اوسط پڑھائی' درمیانے قد کا شاہد خود اپنے آپ کو Genius سمجھتا تھا۔ اسے اپنے تجربے پر بڑا مان تھا۔ بظاہر اس کی گفتگو میں حلم اور انکساری تھی لیکن درپردہ وہ شیخی باز' متکبر اور خود بین تھا۔ اس کی کامیابی نے اس کی انا کا پودا بہت پھل دار کر دیا تھا اور چھوٹی نارنگیوں کے پیڑ کی طرح اس کی ساری گفتگو "میں" سے لدی تھی۔ جب بھی وہ بات کرتا' کوئی جملہ کسی اور سے متعلق نہ ہوتا۔ میرا تجربہ.... میرا فیلڈ ورک..... میری پلاننگ.... میری چھٹی حس.... میری سیانپ.... وہ اونچی آواز میں بولتا نہ زیادہ گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ بس چھوٹے چھوٹے اشاروں سے گذشتہ سے پیوستہ حوالے دے کر تھوڑا تھوڑا وزن ڈال کر اپنے آپ کو نابغہ روزگار ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا۔

جس روز نسبت روڈ کے پٹرول پمپ میں آگ لگی' شاہد بہت اداس تھا۔ اسی روز ہول برگ دس ملین کا مقدمہ جیت گیا۔ تینوں بچوں نے بھی لندن سے واپس آنے سے

انکار کر دیا۔ اس دن شاہد کی انا کا غبارہ بری طرح پنکچر ہوا۔ اس نے مین ہال وے میں صوفے کے پاس فرش ہی پر بریف کیس رکھ دیا اور اطالوی صوفے پر سر ٹیک کر خالی الذہن ہونے کی کوشش کی۔

جمیلہ اس پُر اعتماد شخص کو یوں دیکھنے کی عادی نہ تھی۔

"کیا ہوا شاہد؟"

"کچھ نہیں..... بس۔" شاہد برسوں کے بعد رونا چاہتا تھا۔ "ایک اور نقصان۔" وہ منمنایا۔

"پھر بھی کچھ تو بتائیں؟....." جمیلہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ برسوں کی کامیابی نے ان میں ایسی یخ بستہ دوری پیدا کر دی تھی کہ وہ شاہد کا ہاتھ نہ پکڑ سکی۔

"نسبت روڈ والے پٹرول پمپ میں آگ لگ گئی۔" وہ جمیلہ کے اس قدر قریب نہ تھا کہ اسے ہول برگ والے مقدمے کا بھی بتا سکتا۔

جمیلہ کا رنگ پیلا پڑ گیا..... ابھی دوپہر کی ڈاک سے بچوں کا خط اسے ملا تھا اور وہی دھکا اس کے لئے کافی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بچوں والی بات شاہد کو معلوم نہیں، حالانکہ بچے فون پر ابو سے بات کر چکے تھے کہ وہ واپس آنا نہیں چاہتے۔

وہ گم صم شاہد کے پاس بیٹھی رہی۔ ان دونوں کے درمیان ایسی برف لگی حدود قائم ہو چکی تھیں کہ کسی بے ساختگی، تجاوزات، من مانی کی گنجائش نہ تھی..... خاموشی کا لمحہ صدیاں بن کر گزرا۔

"جس نے پہلے دیا شاہد، وہ پھر دے گا..... وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔"

شاہد سارے کا سارا تڑپ گیا۔ "تم ہر بات میں اپنے اللہ کو بیچ میں نہ لایا کرو..... یہ مولوی پنا چھوڑ دو جمیلہ! یہ سب طفل تسلی ہے....."

اس کامیاب کاروباری ٹائی کون کی ناکامی جمیلہ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے اس گھڑی لندن والے بچے بھول گئے۔ اس کا جی چاہا کہ شاہد کا سر اپنے سینے سے لگا لے، لیکن شاہد کی سطح کے یاس زدہ آدمی کو کسی معمولی تنگ زیست کی طرح تسلی، نصیحت یا تلقین نہیں کی جا سکتی۔ شاہد جس طرح کامیابی میں بے عدیل تھا ویسے ہی اب ناکامی میں کلی طور پر تن تنہا تھا، لیکن جمیلہ پر نہ جانے کیا گزری..... اس وقت اس نے ایک احمقانہ غلطی

کی اور شاہد کا غم غلط کرنے اور اس کا دھیان بٹانے کی خاطر اس کے منہ سے نکلا: "شاہد! رزق اور عزت کا وہی ضامن ہے۔ رزق میں بڑھوتری ہو کہ گھاٹا، ٹوٹا، سب اس کی طرف سے ہے۔ ہم کمزور گوشت پوست سے بنے لوگ اتنا وزن کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ اس کی پناہ لو شاہد، اس پر وزن ڈالو۔"

شاہد بھڑک کر اٹھ بیٹھا۔ "تم ایسی باتیں کر سکتی ہو جمیلہ کیونکہ تم نے محنت نہیں کی، تم نے میری محنت کا ثمر کھایا ہے..... میں اپنی ساری محنت، تجویز، ہمت کو کیسے بھول جاؤں؟ یہاں تک پہنچنے میں مجھے جو کچھ برداشت کرنا پڑا..... جو مشکلات، ذلتیں، کٹھنائیاں میں نے برداشت کیں..... میری ان تھک کوشش..... وہ..... سب اکارت گئی....."

جمیلہ عام طور پر گفتگو کو مناظرے میں بدلنے سے پہلے خاموش ہو جایا کرتی تھی، پر اچانک اس کے منہ سے نکلا..... "کوئی شخص از خود نہ تجویز کر سکتا ہے نہ کوشش..... تمہارے پلان، کوشش، تجویز، اللہ کی عطا تھی..... اس نے چاہا تو تمہیں کام کی توفیق ملی، نہ چاہتا تو....." یکدم شاہد کا چہرہ دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

"مجھے فلسفہ نہیں چاہیے۔ مجھے کسی مولانا صاحب کا دینی لیکچر بھی درکار نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں..... میں ہی کیوں؟..... اتنی شکست، تباہی و ناکامی کے لئے صرف مجھے کیوں چنا گیا؟"

جمیلہ کم گو تھی، اس کے حسن نے عموماً اسے بڑی مراعات بغیر جھگڑے بہم پہنچائی تھیں۔ وہ تند آواز میں بولی..... "شاہد! جو لوگ اپنے ہر عمل کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں، وہی یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ "میں ہی کیوں؟" جہاں کامیابی کا سہرا اپنے سر اور ناکامی کا الزام دوسروں پر ہو وہاں "میں ہی کیوں" نہیں پوچھا جا سکتا۔ ہم لوگ انا کے مارے، شیخی خورے..... ہمیں تو کوئی بڑا "قربانی کا بکرا" چاہیے، بڑی کھونٹی جس پر ہم اپنی ناکامی کا بھاری اوور کوٹ ٹانگ سکیں۔ اس قدر مضبوط نہ بنو شاہد! وہی دولت دیتا ہے، وہی عزت عطا کرتا ہے۔ تم اپنے اعمال کا، بد نصیبی کا بوجھ اس پر ڈال کر تو دیکھو..... یہ فیز نکل جائے گا۔ یہ بُرا وقت ختم ہو جائے گا..... ہماری کوشش ضمنی ہے۔ وہ پھر توفیق دے گا۔ بڑی ریل پیل ہو گی۔"

کھلے پیانو کے سروں پر شاہد نے زور سے مکا مارا۔ بڑے دھماکہ خیز سُروں نے سارا

گھر بھر دیا۔

"وہ..... وہ تمہارا خدا پلازے بنانے آیا تھا؟ شاک ایکسچینج پر وہ کام کرتا ہے؟ رات دن فیکٹریاں تمہارا رب چلاتا ہے؟ وہ بال سفید کرتا ہے اپنے سوچ سوچ کر؟..... ٹھیک ہے گفتگو میں سارا کریڈٹ میں تمہارے خدا ہی کو دیتا ہوں، لیکن ڈونٹ فارگیٹ میں نے اتنی محنت کی ہے، اتنی محنت کی ہے....."

شاہد نے مُنہ دیوار کی طرف کر لیا۔ جمیلہ اس کا چہرہ دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں شاہد کے حصے کی معافیاں بھی گڑگڑانے لگیں..... "اللہ جی! یہ ناکامی کی آخری چٹان پر کھڑا ہے۔ اسے اس دیوانگی کی سزا نہ دینا پروردگار..... یہ سزا کا مستحق بھی ہو تو اسے اللہ میاں جی صرف معاف ہی نہ کرنا بلکہ..... جزا دینا..... اس کے دن پھیر دینا..... اس کی تجویزوں نے، اس کی محنت نے اسے چھوٹا سا فرعون بنا دیا ہے..... جو ہر کامیابی کو اپنے سے منسوب کرتا ہے..... میرے مولا! اس Genius کو فرعون ہونے کی سزا نہ دینا..... اسے ناکامی کے دریا میں ڈبونہ دینا میرے آقا....."

اس روز کے مناظرے نے جمیلہ اور شاہد کے فاصلے کچھ اور بڑھا دیئے۔ دونوں سوشل فنکشنوں پر پاس پاس اور تنہائی میں ایک دوسرے سے دور دور رہتے تھے۔ شاہد نے ایک بڑا سہارا ٹھکرا کر اور سارے الزامات اپنے سر لے کر اپنے آپ کو توڑنا شروع کر دیا۔ کس وقت میں نے کون سی غلطی کی، کہاں چوک ہوئی، کون سے فیصلے غلط کئے؟ وہ ایک بار پھر اپنی انا کے چھلاوے کے آگے احساس جرم میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ ناکامی سے دوچار ہو کر وہ اپنے رب سے ناراض ہو گیا۔ لاڈلے بیٹے کی طرح اپنی من مانی کرتے رہنے کے بعد اس کا یہ خوف بھی جاتا رہا کہ اسے عاق بھی کیا جا سکتا ہے!

جمیلہ کو پتہ نہیں کیوں یقین تھا کہ اولاد نافرمان بھی ہو اور ناشکر گزار بھی لیکن دنیاوی والدین کی طرح اللہ اپنی مخلوق کو کبھی عاق نہیں کرتا۔ جمیلہ اور شاہد جب بیڈ روم میں اکیلے ہوتے تو ان کی خاموشی کے "لاکر" ہمیشہ دو کنجیوں سے کھلتے..... ایک ساتھی کی رضامندی، دوسری اپنی منشا..... ان دو چابیوں نے خاموشی کے لمحے بڑے لمبے کر دیئے تھے۔

خاموشی کے زحمتی وقفے سے نبرد آزما ہو کر ایک دن شاہد بولا: "شاک ایکسچینج کا اس حکومت نے بھٹہ بٹھا دیا..... جو شیئر سو کا تھا اب دس پر ہے..... میرا ارادہ ہے کہ کینیڈا

کی امیگریشن لے لوں۔ اب یہاں ساکھ بحال نہیں ہو گی جمیلہ....."

"بیٹیاں لندن بیاہی گئیں، بیٹا امریکہ میں پڑھ رہا ہے۔ آپ کینیڈا چلے ہیں؟ آپ کو جانا ہی ہے تو لندن چلے جائیں....."

"لندن تو ایسی کساد بازاری میں جا رہا ہے کہ اللہ بچائے..... تم میرا ساتھ نہ دینا چاہو تو نہ سہی۔ میری تو قسمت ساتھ چھوڑ گئی، تم کس شمار میں!"

"ہمیں ابھی بھی کسی چیز کی کمی نہیں شاہد! گاڑیاں، کوٹھی، پیسے کی ریل پیل۔ اس بڑھاپے میں ہم کیوں جلا وطن ہوں؟ اللہ میاں سب ٹھیک کر دے گا شاہد!"

وہ اس خیر خواہی سے بھڑک گیا۔ "مہربانی فرما کر آپ اللہ میاں کی سفارش نہ کریں۔ آپ کا اللہ میاں کبھی آدمی تو رہا نہیں کہ وہ جان سکے جب انسان اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہو جاتا ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو تھانیدار کے حواری بھی ہوں اور جیل بھی بھگتیں..... شادی بھی تیلی سے کریں اور کھائیں بھی سوکھی..... پیارے بھی ہوں اللہ کے اور ذلت بھی سہیں..... نو تھینک یو..... نو تھینک یو..... میں ایسے محبوب سے تنہا ہی بھلا۔ میں دوستی میں آزمائش کا قائل نہیں..... میں اگر کامیابی میں تنہا تھا تو ناکامی میں بھی اکیلا رہوں گا۔"

پتہ نہیں یہ ڈھٹائی تھی کہ برسوں کی رفاقت..... جمیلہ نے جرات کر کے کہا: "شاہد! ہر معاملے میں تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ تمہیں بتانے کی تو ضرورت نہیں لیکن شاید بات کا اعادہ کرنے سے کچھ فرق پڑ جائے۔ بھلا روز ازل کیا ہوا تھا! لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ابلیس کا گناہ فقط تکبر ہے..... لیکن میرا خیال ہے کہ تکبر کا حاصل مایوسی ہے۔ جب ابلیس اس بات پر مصر ہوا کہ وہ مٹی کے پتلے کو سجدہ نہیں کر سکتا تو وہ تکبر کی چوٹی پر تھا لیکن جب تکبر ناکامی سے دوچار ہوا..... تو ابلیس اللہ کی رحمت سے ناامید ہوا..... حضرت آدمؑ بھی ناکام ہوئے، وہ بھی جنت سے نکالے گئے لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے..... یہی تو ساری بات ہے۔ شاہد! ابلیس نے دعویٰ کر رکھا ہے میں تیری مخلوق کو تیری رحمت سے مایوس کروں گا۔ ناامید، مایوس لوگ میرے گروہ میں داخل ہوں گے..... اللہ جانتا ہے کہ اس کے چاہنے والوں کا اغوا ممکن نہیں۔ وہ کنویں میں لٹکائے جائیں، آگ پر جلائے جائیں، صلیب پر لٹکیں لیکن وہ مایوس نہیں ہوں گے....."

وہ کچھ دیر ہنستا رہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے..... پھر وہ طعن بھری آواز میں بولا: "اسی لئے میں آپ کو منع کرتا تھا کہ درس لینے نہ جایا کریں لیکن آپ کو اپنے وقت کا کوئی بہتر مصرف نہیں سوجھا۔ اب آپ کی شخصیت ایسی ہو گئی ہے جیسے کسی مولوی نے دوپٹہ اوڑھ رکھا ہو۔ آپ وہاں موجود تھیں جب ابلیس اور اللہ کے درمیان امید پر ڈائیلاگ ہوا؟ پہلے آپ نے فلسفہ پڑھا' اب دینی رسائل اور ان ہفتہ وار درسی لیکچروں نے آپ کا بیڑا غرق کر دیا۔ پہلے میں بھی تکلیف کے وقت اللہ کو پکارا کرتا تھا' لیکن اب نہیں..... اب میں جانتا ہوں کہ میرے فیصلوں نے مجھے کامیاب بنایا اور میرے ہی فیصلوں نے مجھے ناکام کر دیا۔ اس میں کسی سپرنیچرل فیکٹر کو دخل نہیں۔ جو لوگ اولاد کے لئے اور اپنے لیے درست فیصلے کرتے ہیں' انہیں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا۔ میں نے ضرور کہیں کوئی بڑی غلطی کی ہے..... جس طرح کچھ احمق اچھی تعلیم دیئے بغیر اولاد کو معاشرے میں چھوڑ کر پچھتاتے ہیں.... ایسے ہی کہیں میں نے کچھ کیا..... کوئی غلط فیصلہ' کوئی ناکام پلاننگ....."

"اگر آپ اس انا کا پیچھا چھوڑ دیں' تو شاید..... باجی نے کن مصیبتوں سے اپنے بیٹوں کو ڈاکٹر بنایا.... چار سال سے بیکار بیٹھے ہیں اسلم اور سلیم۔ کبھی تو سوچ لیا کریں انسانی تجویز کے علاوہ کوئی اور فیکٹر بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں کہیں انسانی تجویز اچانک کیوں فیل ہو جاتی ہے شاہد! سوچا کریں..... غور کیا کریں۔"

"واہ جی واہ! یعنی تم اتنی احمق ہو کہ اپنے خدا کو اب بے انصاف بنانے پر تلی ہوئی ہو..... یعنی تمہارے رب کو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ اتنی کڑی محنت کا کچھ اجر بھی ہونا چاہیے۔ ہم سرمایہ دار ہی تمہارے رب سے بہتر ہیں جو محض اس کے حکم کو سن کر پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کرتے رہتے ہیں..... پہلے حکم سن کر ایسے کرتے تھے' اب ہیومن رائیٹ سمجھ کر کرتے ہیں۔"

یہ باتیں سن کر جمیلہ خاموش ہو گئی۔ معاً اُسے خیال آیا کہ وہی شاہد سے بحث کر کے یہ کفر کے کلمے کہلوا رہی ہے۔ جی ہی جی میں معافیاں مانگتی وہ غسل خانے کی جانب چلی۔ آنسو جو اس کی آنکھوں سے نکلے' سنگ مرمر کے فرش پر چکتے ڈالتے گئے۔

لاکر دونوں کی خاموشی سے ایک عرصہ تک بند رہا.....

پھر اچانک ایک واقعہ رونما ہوا۔ ایک ملٹی نیشنل فرم کے مالک نجم رضوان کے گھر ایک دعوت پر جانا پڑا۔ نجم اس قدر امیر تھا کہ اسے کسی حجاب کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس چپڑ قناتیے' چیچوڑے کی تمام اچھی اور بری عادتیں اب سب کے سامنے تھیں۔ وہ اپنی کمینگی' ہرزہ گوئی' جھوٹ اور بے پر کی داستانیں سنا سنا کر لوگوں کو حیران کرتا رہتا تھا..... اس کی دولت نے اسے لائسنس دے رکھا تھا کہ وہ جنسی لطیفوں سے لے کر ٹیکس کی چوری کے قصے تک محفلوں میں بڑے تکبر سے سنائے۔

اس دعوت کے بعد مشہور و معروف گلوکار فقیر حسین کا گانا تھا۔ اس گائیک کی شہرت ملک اور بیرون ملک جنگل کی آگ بن کر پھیل رہی تھی۔ امریکہ' یورپ' انگلستان' دوحہ' شارجہ' دبئی کون سا ملک تھا جو اس نے اپنی آواز کے جادو سے فتح نہ کیا۔ غزل' نیم کلاسیکی گیت' ٹھمری' دادرا' خیال سبھی قسم کی موسیقی پر حاوی تھا۔ اس کی مانگ کا یہ عالم تھا کہ اس سے تاریخ لینے کے لئے کئی کئی مہینے انتظار کرنا پڑتا۔ اس کا سودائی سا مینجر اب تین لاکھ روپے فی فنکشن پہلے وصول کرنے لگا تھا۔ پھر فقیر حسین فنکشن کے دوران کسی کی فرمائش قبول نہ کرتا۔ وہ اور اس کے سازندے ہمیشہ فائیو سٹار ہوٹل میں رہتے۔ فنکشن کرانے والوں کو حکم ملتا کہ فقیر حسین کے لئے دیسی گھی میں کھانا پکوایا جائے کیونکہ وہ اپنے گلے کے معاملے میں بڑا محتاط تھا۔ اگر حاظرین ذرا بھی غیر سنجیدہ ہو کر بھنگڑا ڈالنے لگتے یا کوئی ٹکڑی آپس میں باتیں کرتی تو فقیر حسین فوراً اٹھ کر چلا جاتا..... اس کی کج ادائیوں' سرگشتہ حرکتوں پر لوگ اور ہلا ہلا کر اس کے پیچھے بھاگتے اور اس کی نازک مزاجی کو فخر سے آپس میں بیان کرتے۔ امیر لوگوں کا خیال تھا کہ اس بت کے پیچھے بھاگنے میں کوئی قباحت ہے نہ کمتری بلکہ الٹا ان کے بارے میں یہ مشہور ہو جائے گا کہ وہ فن کے بے حد شیدائی ہیں جس کے درپردہ یہ معنی ٹھہرے کہ انہیں قلبی طور پر روپے پیسے کی ہرگز پروا نہیں۔

شاہد اپنے کاروبار کی ناکامی کے باعث کسی بھی فنکشن میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ جس وقت جمیلہ کے ساتھ وہ بہت لیٹ شامیانے تلے پہنچا' سارا پنڈال رنگ برنگ بتیوں اور شہر کے وی آئی پی حضرات سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ گو اس کی ناکامیوں کی داستانیں پھیل چکی تھیں' پھر بھی اقلیم دولت کے اس سردار کے لئے لوگوں نے راستہ چھوڑا اور وہ

دونوں عین سامنے والے صوفوں پر جا پہنچے۔ نجم رضوان نے پروگرام میں کچھ تبدیلی کر دی تھی۔ پہلے دور میں ہلکی پھلکی موسیقی اور کافیاں.... پھر رات کا کھانا اور اس کے بعد کلاسیکی موسیقی کی محفل برپا ہونی تھی۔

فقیر حسین کندھے پر پشمینے کی چادر بے پروائی سے لٹکائے تان پورے کے سروں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ باقی سازندے بھی نظریں ملانے اور سروں کو تال میل میں لانے کی فکر میں تھے۔

معاً فقیر حسین کی نظر جمیلہ پر پڑ گئی۔ دبلا پتلا' لمبا' سانولا فقیر حسین اپنی نشست سے کسی راہب کے وقار کا مجسمہ سا اُٹھا۔ اس نے بڑے مودب انداز میں ہاتھ جوڑے، نظریں گرائیں اور بلند آواز میں کہا.... "اجازت ہے بی بی جی؟...."

جمیلہ نے سر پر دوپٹہ اُوڑھ کر ہاتھ جواباً جوڑے اور خوش ہو کر کہا: "جی اجازت ہے۔" کنسرٹ شروع ہو گیا.... شاہد نے آواز گرا کر جمیلہ سے پوچھا.... "تم فقیر حسین کو جانتی ہو؟" جمیلہ نے کھسر پھسر میں کہا: "شاید اسے غلطی لگی ہے ورنہ اتنے بڑے فنکار کو جاننے کا میں تو دعویٰ نہیں کر سکتی۔"

پنڈال میں تجسس اور سکینڈل کی ہوا چلنے لگی۔ اب خوش فکرے دولت مند جمیلہ اور شاہد سے از سرنو بات کرنے کے شوق میں کھسکنے لگے۔ شاہد کی ناکامیاں اسے بارڈر لائن پر گھسیٹ لائی تھیں۔ وہ وقت دور نہیں تھا جب فیشن ایبل وی آئی پی طبقہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا۔ لیکن ایک "اجازت ہے" نے تجسس کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔ انٹرول تک لوگ مسٹر اینڈ مسز شاہد کے گرد گھیرا ڈال کر ان سے فقیر حسین دی گریٹ لیجنڈ کے بارے میں ذاتی معلومات اکٹھی کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ شاہد کے تیز دماغ نے بھی ایک خوبصورت کہانی گھڑ لی۔ وہ سب کو بتانے لگا: "پچھلے سال جب میں کروم ویل اسپتال میں جنرل چیک اپ کے لئے گیا تھا تو فقیر حسین بھی وہیں داخل تھے۔ ان دنوں فقیر حسین بڑے پریشان تھے.... گلے کے سرطان کی وجہ سے.... سارا سارا دن ہم بیٹھے تاش کھیلتے رہتے۔ انہیں میٹھی سپاریوں کا بہت شوق ہے۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود یہ مجھ سے مانگ مانگ کر سپاریاں کھاتے تھے۔" اس کے بعد ایک جاندار قہقہہ اور نجم رضوان کے جنسی لطیفے.... یکایک شاہد کے ہاتھ میں "پرومیتھیوس کی آگ" آ گئی۔ وہ اخباروں کے رنگ

دار صفحوں سے حاصل کردہ انفریشن کو اپنے تخیل سے ملاقاتوں میں بدل رہا تھا۔ فقیر حسین اس وقت مائیکل جیکسن سے بھی زیادہ میڈیا کا پیارا تھا۔ اس کے انٹرویو، تصویریں، حالات زندگی قریباً سارے میڈیا پر چھائے ہوئے تھے۔ گولڈن ڈسک تو بن ہی چکی تھی، اب اس کی پلاٹینم ڈسک بننے کی تیاری تھی۔ گینز بک آف انفریشن میں اس کا نام دنیا کے مشہور ترین سنگر کے طور پر چھپ چکا تھا۔ میڈونا اور مائیکل جیکسن اس کے ذاتی دوست تھے۔ فقیر حسین کو موسیقی کی دنیا میں "ماں سومک" کی طرح اعجوبہ روزگار سمجھا جاتا تھا۔

وہ مشاہیروں کا مشاہیر.... اور گائیکوں کا گائیک تھا۔

ہفتہ وار مذہبی درسوں نے جمیلہ کی زندگی کی تو سدھ نہ لی تھی' البتہ سوچنے اور باتیں کرنے کی قوت آ گئی تھی۔ اپنی موسیقی میں گم، سروں کی ادائیگی میں سرگرداں فقیر حسین کو جمیلہ کبھی سٹیج پر دیکھتی اور عش عش کرتی، کبھی اس کی آنکھیں شامیانے کی چھت پر جا ٹکتیں اور وہ سوچنے لگتی کہ واقعی وہ جسے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے، جسے چاہتا ہے دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ وہ نہ چاہے تو شہرت ملتی ہے نہ دولت.... اور جب وہ چاہے تو خود بخود سامان پیدا ہونے لگتے ہیں، خود ہی اسباب اکٹھے ہوتے ہیں۔ آپ ہی آپ توفیق مل جاتی ہے، مشقت نہیں کرنا پڑتی۔ سب کچھ از خود چالو ہو جاتا ہے۔

شامیانے تلے بزنس کمیونٹی اور شامیانے کے پیچھے خلاصی طبقہ، ڈرائیور' بیرے سارے فقیر حسین کے سحر میں آئے ہوئے تھے۔ استھائی ہو کہ انترہ، بلمپت ہو کہ درت اس کا ہر سُر اللہ کے فضل کی طرح اس پر تنا تھا۔ کہیں کوئی نگاہ ایسی نہ تھی جو اسے ذاتی طور پر جاننے کی آرزو مند نہ تھی۔ یہ توجہ، آرزو مندی، خواہش ان امیر لوگوں کے پیسے سے ممکن نہ تھی....

جمیلہ بھی فقیر حسین سے ملنے کی خواہش مند تھی لیکن اس کی وجہ کچھ اور تھی.... شاہد اس رات اپنے ہم چشموں میں فقیر حسین کے ساتھ اپنی پرسنل ملاقاتوں کے بیان میں مشغول تھا۔ کروم ویل اسپتال کی اولین ملاقاتیں اور امریکہ کے قیام میں اس سحر ساز فنکار کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے اس کی مبالغہ آمیز گفتگو کا نچوڑ تھے۔

جمیلہ نے پورے تیس سال بعد فقیر حسین کو دیکھا تھا۔ اس دوران جمیلہ نے اس کے متعلق مضمون پڑھے، اس کی تصویریں دیکھیں، اس کے ٹی وی کے پروگرام ڈسکس

کیے، کیسٹ سنے لیکن اس نے کبھی کسی کو نہ بتایا کہ وہ فقیر حسین کو قریب سے جانتی ہے..... اس وقت سے جب اس کے ابا جی ریڈیو سٹیشن پر پروڈیوسر تھے اور بیس بائیس سال کا تپ دق زدہ فقیر حسین ان سے پروگرام مانگنے آیا کرتا تھا۔

ان دنوں جمیلہ کے ابا جی کشمیری بابا کے مزار کے پچھواڑے ایک تنگ سی گلی میں رہتے تھے۔ گھر کی اوپر والی منزل میں لکڑی کے فریم ورک میں چلمنوں، کھڑکیوں سے ڈھکے شہ نشین تھے اور بڑے پھاٹک کے بغل میں چھوٹا سا دروازہ تھا جس سے آنے جانے والے، خاص کر فقیر حسین جیسے سر جھکا کر صحن میں داخل ہوتے تھے۔

ریڈیو پاکستان کے پروڈیوسر میر شبیر کا کشمیری گھرانا حسن کی کان تھا اور جمیلہ ان خوبصورت لوگوں پر بھی مستزاد تھی۔ کشمیری چائے سی گلابی گلابی، نمکین نمکین، دراز قد، مغلیہ عمارتوں کی سی روشن، چنار کے درختوں کی طرح متناسب، اس کا انگ انگ سُر میں تھا۔ ڈل لیک میں چپو چلنے کی آواز اس کے گلے میں بیٹھی تھی۔ جب وہ گنگناتی، سب چپ ہو جاتے۔ بے جی باورچی خانے کی باسی تھی۔ گو لاش، کھٹے بینگن، آب جوش بھگارتی وہ رک کر جمیلہ کا فلمی گانا سننے لگتی۔ دم بخود ہو کر بے جی سوچتی..... جمیلہ تو جادو گرنی ہے، کہیں جو اس کی آواز کسی کے کان پڑ گئی تو قیامت آ جائے گی۔

کشمیری لوگ سردیوں میں لمبا سیزن بند کمروں میں گزارنے کے عادی رہے ہیں۔ وہیں انہوں نے کشیدہ کاری، قالین بافی، اخروٹ کی لکڑی سے دل بہلایا۔ وہیں اپنی تنہائی کے پیتل کو صبر کے ریگ مال سے چمکانا سیکھا۔ بے جی میں بھی اپنے پرکھوں کا لہو تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ خواہش کے چڑھے پانیوں کے آگے بند باندھنے سے پانی چڑھ آتے ہیں۔ تھوڑا بہت نکاس ہوتا رہے تو طوفان نہیں آتے۔ اسی لئے بے جی نے کبھی جمیلہ کو گانے سے نہ روکا۔

ایک دن جمیلہ کالج سے لوٹی تو بڑی ناخوش تھی۔ وہ باورچی خانے کے دروازے میں چوکھٹ ہی پر رُک گئی۔ بے جی اس وقت گوشت کوٹنے کے عمل میں تھی۔

"کیا ہوا جمیلہ؟"

"کچھ بھی نہیں، بے جی۔"

"کچھ بھی..... روئی ہو؟" بے جی کو اپنی اولاد سے بات کرنا بڑا مشکل لگتا تھا۔ ان

لوگوں کی جذباتی اعانت کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

"اوہ بھائی پھر بھی بتا تو روئی ہے تو؟"

"آپ لوگوں کو کیا! سارا دن ابا ریڈیو سٹیشن رہتے ہیں، شام کو دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہیں۔ آپ کو باورچی خانے نے قید کر رکھا ہے۔ میں کیا کروں؟"

"تمہیں کیا کرنا ہے جمیلہ؟"

"آج ہمارے کالج میں نعت خوانی کا مقابلہ تھا، میں سیکنڈ آئی۔" اس کی آواز تھرا گئی اور آنسو جھلا جھل آنکھوں میں اکٹھے ہونے لگے۔

"مبارک ہو، لو بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ تمہاری آواز ہی ایسی ہے، سیکنڈ تو آنا ہی تھا۔ اللہ کا شکر کرو جمیلہ....."

جمیلہ بپھر گئی..... "جی نہیں، میں شکر وکر نہیں کر سکتی۔ مجھے تو فرسٹ آنا تھا۔ جو لڑکی فرسٹ آئی ہے اس کی آواز تو خاک بھی نہیں، ہاں۔ ماسٹر اسے موسیقی سکھانے آتا ہے..... جج صاحبہ نے کہا کہ میری آواز کچی ہے..... اگر میں تھوڑی سی ٹیوشن لے لوں تو کمال کر سکتی ہوں۔"

بے جی کے مُنہ کو تالا لگ گیا۔

بھلا میر شبیر گانے کی ٹیوشن پر کیسے مانیں گے؟ ایسی روایتی محلے داری، پھر کشمیری بابا کے سامنے ٹبی کا علاقہ..... گھر میں کشمیری لوگوں کی روایات کا ایک پورا پیٹرن، زندگی جینے کی ایک پوری اساس!

"بے جی! ابا جی سے کہیں مجھے کسی اُستاد کی ٹیوشن لگوا دیں۔ ان کی پروڈیوسری کب کام آئے گی؟"

بے جی کو آگ لگ گئی..... "ہم تجھے کالج اس لئے نہیں بھیجتے کہ تو نت نئے مسائل لے کر آ جایا کرے گھر..... میں نے سو بار میر صاحب سے کہا اسے نعت خوانی کی اجازت نہ دیں۔ چھوٹی اجازت سے بڑا حوصلہ کھلتا ہے۔ پر وہ تو تیرے آگے بولتے ہی نہیں....."

جمیلہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی رہی۔

"اماں! بس تھوڑی دیر ٹیوشن لگوا دیں..... میں زاہدہ کو ایک بار ہرا دوں، پھر آپ بے شک خود ہی ٹیوشن بند کر دینا اپنی مرضی سے..... مجھے کچھ سُر تال کا تو پتہ چلے، لے تو

پکڑنی آئے....اماں! جب آپ کو اعتراض ہو، خود ہی ٹیوشن بند کر دینا....جو میں نہ بولوں تو آپ مجھے جوتے ماریں، شوق سے۔ پلیز بے جی، پرومس۔"

اس وقت جمیلہ کے دماغ میں ایک ہی بھڑ گھسی تھی اور وہ تھی زاہدہ کو نیچا دکھانے کی۔ جس طرح ٹرافی اٹھائے غرور سے مسکراتی وہ جمیلہ کے پاس سے گزری تھی، اس لمحے نے اسے پچھاڑ دیا تھا۔

جمیلہ مڈل کلاس لڑکی کی طرح پنجابی میں پلیز اور پرومس کہہ کر چپ ہو گئی لیکن اس کے اندر سے بذات خود ٹرافی اُٹھانے کا خواب کبھی چپ نہ ہوا....میر شبیر کے گھرانے کو زیادہ اصرار کرنے کی عادت نہ تھی۔ وہ خواہشوں کو دبانے، احتجاج کو دم پخت کرنے اور واضح کو غیر واضح کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنی ساری خوشیاں کھانے پکانے، رینھنے پرونے کے حوالے سے ترتیب دی تھیں جہاں آگ پر چڑھنا اور ڈھکنے لگا کر پکتے رہنا بنیادی عمل تھا۔ ویسے بھی دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر جو قومیں مرد اور عورت کے اختلاط میں آزادی نہیں برتتیں اور اس رشتے کو جو باہمی قلبی لگن سے پیدا ہوتا ہے مقدس فریضہ سمجھ کر اس کی پاسداری کرتی ہیں، ایسی قوموں کی جنسی خواہش راستہ بدل کر معدے میں گھس جاتی ہے۔ پھر فرداً فرداً اور من حیث القوم عام طور پر وہ شدت اور جذبات جو وہ جنس مخالف کے لئے محسوس کرتے ہیں کھانے کھلانے میں ان سے خلاصی مل جاتی ہے اور یہی کھانا پینا ان لوگوں یا قوموں کے لئے شاستری بدھی سمان رسم و رواج کا ستون بن جاتا ہے۔ دسترخوان وسیع اور کھانے والے خوش خوراک ہو جاتے ہیں۔ یہ خوش خوراکی جسم بھدے اور ست الوجود کر کے افراد کو بڑے کاموں کے لئے نااہل کر دیتی ہے۔ مذاہب میں سب سے زیادہ پابندی جنسی اختلاط پر ہونے کی وجہ سے لوگ جھوما جھومی سے اجتناب کرتے، لیکن صنعتی انقلاب نے صورت حال بدل دی۔ جب دھندے ان گنت ہوئے اور کرنے والوں کی مانگ بڑھی، مرد اور عورت کو ساتھ کام کرنے اور وقت گزارنے کی مجبوری نے دل اچاٹ کر دیئے تو مذہب کی طنابیں بھی ڈھیلی پڑ گئیں۔ لبرل اور غیر مذہبی ہوئے بغیر صنعتی ترقی ممکن ہی نہ تھی۔ گھروں میں باہمی میل جول کم ہوتا گیا۔ فیکٹریوں، بسوں، سب ویز، ہوٹلوں میں ہر جگہ خلق آپس میں خلط ملط ہونے لگی۔ جنسی خواہش کا نکاس آسان ہو گیا۔ لیکن جو قومیں یا لوگ ابھی مذہب کے پابند تھے، انہوں نے

اس درد دیرینہ کو پیٹ میں چھپا لیا اور اس پیٹ پوجا کے سہارے مجلسی بھی ہو گئے اور جنسی خواہش سے قدرے آزاد بھی!

میر شبیر کے خاندان نے خواہشات کے نکاس کے لئے ایک بنیادی اُصول بنا لیا تھا۔ یہ لوگ بڑی خواہش میں سے تھوڑی سی ہوا نکالنے کے قائل تھے۔ خواہش کا راستہ نہ بدلتے، بس اسی خواہش کو تھوڑا بہت بیچ بچاؤ کا راستہ دے کر اس کی شدت کم کر دیتے.... جس طرح ٹائر میں سے تھوڑی سی ہوا نکال دیں تو گاڑی اچھلتی، چھلانگیں لگاتی نہیں چلتی۔

"ابا جی.... پلیز میری ایک بات مان لیں.... پرومس، بس جس وقت آپ چاہیں گے بلکہ جب امی کی مرضی ہو وہ ٹیوشن بند کر دیں جی.... پرومس.... پلیز۔" رات کو جمیلہ باپ کے پاؤں دبا کر اُٹھی تو ابھی تک زاہدہ ٹرافی اُٹھائے اس کی نظروں کے سامنے تھی۔

"کیسی ٹیوشن؟" میر صاحب نے شطرنج کے مہرے اُٹھا کر پوچھا۔

جمیلہ نے نعت خوانی کا واقعہ پھر تفصیل سے بیان کیا اور آزردگی سے بتایا کہ کیسے زاہدہ ٹرافی اُٹھائے اس کی کرسی کو جان بوجھ کر ٹھڈا مار کر گزری تھی۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے.... یہ بھی درست ہے کہ میں ریڈیو سٹیشن پر پروڈیوسر ہوں اور ٹیوشن کے لئے ماسٹر ڈھونڈنا مشکل نہیں.... لیکن تم خود ہی خیال کرو.... یہ دو قدم پر کس قسم کا بازار ہے....اور محلے والے کیسے جہلا ہیں!؟"

"ابا جی جب میں کالج گئی تھی تب بھی آپ یوں ہی کہتے تھے۔ بتایئے کوئی طعنہ، الاہنا آپ کے کان سے گزرا....پرومس، میں چھ مہینے میں اپنے سرتال ٹھیک کر لوں گی۔ مجھے "لے" پکڑنا آ جائے۔ مجھے پروفیشنل نہیں بننا ابا جی.... میں صرف نعت خوانی میں فرسٹ آنا چاہتی ہوں۔ صرف ایک بار.... پلیز.... ابا جی پرومس.... پلیز۔"

ابا میر شبیر بڑے لحاظ والے آدمی تھے۔ جمیلہ کے آگے جھکنے میں کچھ وقت لگا لیکن ناصبور بیٹی کے آگے آخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ریڈیو سٹیشن پر اُستاد مراد خان سے بات کی۔ اُستاد صاحب بڈھے پھونس، آنکھ سے دکھے نہ پاؤں میں چلنے کی سکت۔ پروگرام مانگنے عموماً میر شبیر کے پاس آتے رہتے۔ پکا گانا ایک زمانے میں خوب گاتے تھے، اب نقلی دانتوں کی وجہ سے تان کے ساتھ سیٹیاں بھی بجتی تھیں۔ تان پورہ بھی لرزتا، آواز بھی کانپتی، سم پکڑنے میں بھی چوک جاتے۔ میر صاحب کا خیال تھا کہ اُستاد مراد خاں خود ٹیوشن کے لئے

آئیں گے لیکن اُستاد صاحب نے اپنے آٹھ بچوں میں سے سب سے چھوٹے بیٹے فقیر حسین کو میر صاحب کے گھر بھیج دیا۔

یہ بھی زندگی کا عجیب چلن ہے کہ جب غلطی ہونا ہو تو کسی نہ کسی طور پر ہو کر رہتی ہے۔ ایک دروازہ تھوڑا سا کھلتا ہے اور انسان دھڑام سے غلطیوں کی غلام گردش میں داخل ہو جاتا ہے۔ فقیر حسین سردیوں کی شام میں جھٹپٹے کے وقت ایسے آیا کہ سر پر دوہرا کمبل تھا۔ بے جی بغیر چشمے کے آئیں، سمجھیں بڈھا اُستاد مراد خان ہے۔ دروازہ کھول کر رنگین شیشوں والی نچلی بیٹھک میں بٹھا دیا.... جمیلہ سے یہ بھول ہوئی کہ وہ سمجھی اباجی نے فقیر حسین ہی کو بھیجا ہوگا اس لئے اس کا ذکر کسی سے کرنا بیکار ہے۔

فقیر حسین دوہرا کمبل سر پر اوڑھے بیٹھک میں داخل ہوا۔ تپ دق کا مریض، ایتھوپیا کا باشندہ، بے حد دبلا پتلا، قیدی سا خوفزدہ، بمشکل تمام بائیس برس کا ہوگا۔ لمبے لمبے بالوں میں تیل لگنے کی وجہ سے لمبی ستواں ناک نے اس کے چہرے کا پروفائل اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ اس کے لئے میر شبیر کی بیٹھک کسی محل سے کم نہ تھی.... کین کے صوفے پر کپڑا چڑھا تھا، مینٹل پیس پر کالے کپڑے پر موتیوں سے کڑھی بطخ بڑے جلال سے گھور رہی تھی۔ پیتل کے گلدان نقلی پھولوں سے لدے تھے۔ کمرے کی اکلوتی دری جابجا سے مسک گئی تھی۔ فقیر حسین کے گھر کھانے کو کبھی تھا کبھی نہ تھا لیکن اس کے باپ نے فقیر کو آدھے پونے سر لگانے کی مشق نہ کرائی تھی۔ اُستاد مراد خان سر کا ساگر تھا، اس نے آخری عمر میں اپنے بیٹے کو امیرالبحر بنا دیا تھا۔

"سلام علیکم سر...." جمیلہ نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"وعلیکم سلام، بیٹھئے بی بی...."

جابجا مسکی ہوئی دری پر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے.... جمیلہ کہیں سے ایک پرانا ہارمونیم لے آئی۔ پھٹ پھٹ ہوا دے کر جب فقیر حسین نے سرگم نکالی تو جمیلہ اپنے سارے حسن کے باوجود حقیر سی ہو گئی۔ سرگم میں اتنی موسیقی بند ہے، اس بات کا اسے علم نہ تھا۔ دو چار پلٹے فقیر حسین نے لیے تو جمیلہ کو اپنے آپ پر ترس آنے لگا.... بھلا اس اعتماد کے ساتھ وہ گا سکتی ہے....؟ نعت خوانی کی ٹرانی کچھ لمحوں کے لئے دھندلا گئی۔

میر شبیر صاحب پروڈیوسر ریڈیو پاکستان کو جب فقیر حسین کا علم ہوا تو اسے ٹیوشن

دیتے ہوئے پانچواں ہفتہ تھا۔ اس عرصے میں جمیلہ بسنت بہار گانے لگی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" میر صاحب بے جی پر گرجے۔

"لیں آپ ہی نے تو اسے بھیجا تھا۔ میں کیا بتاتی؟"

"مولی گاجر کے بھاؤ تک بتا دیتی ہو، یہ ذکر کرنا ہی بھول گئیں کہ جوان جہان فقیر حسین گھر آتا ہے اور وہ بھی تان پورہ اُٹھا کر! حد ہو گئی.... کیا سوچتے ہوں گے محلے والے؟.... بیٹی کو کیا بنانا ہے ہمیں؟"

"یہ تو اس وقت سوچنے کی بات تھی جب آپ نے اپنی لاڈلی کو ٹیوشن کی اجازت دی...."

اب مشکل یہ آن پڑی کہ فقیر حسین کا کردار، پابندی وقت، تعلیم دینے کا منفرد سلیقہ، کوئی ایسی سقم والی بات نہ تھی کہ اچانک بیٹھے بٹھائے اس پر کوئی الزام لگا کر نکالا جا سکے۔ یہ بھی زندگی کا عجیب چلن ہے کہ جب کوئی شخص شدت سے کسی آرزو میں مبتلا ہو جائے تو متعدد بار خواہش پوری ہونے کے اسباب خود بخود پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جمیلہ کی خواہش بھی اسی شدت نے پوری کی۔

اس روز فقیر حسین شام کو دیر سے آیا۔ سردی کا موسم تھا۔ بارش کچھ دیر پہلے رکی تھی اور سرکتی سسکتی ٹھنڈی ہوا سارے گھر میں نقطہ انجماد کو بکھیرتی پھر رہی تھی۔ فقیر حسین کھیس اُوڑھے، تان پورہ اُٹھائے دری پر آ کر بیٹھ گیا۔ جمیلہ نے ہارمونیم پر ہاتھ چلا کر اُوپر نظر کی تو فقیر حسین لرز لرز کر دانت کٹکٹانے کے عمل میں تھا۔ پھر وہ تان پورے سمیت کھیس تانے، بے ہوش، دری پر لڑھک گیا۔ جمیلہ نے اُٹھانے کی کوشش کی لیکن فقیر حسین بے سدھ تھا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو نہ جانے کتنا تیز بخار تھا کہ جمیلہ گھبرا کر اندر گئی اور بے جی کو ساتھ لے کر ترنت آئی۔ دونوں نے تنو تھمبو کر کے فقیر حسین کو کین کے صوفے پر لٹایا۔ سر کے نیچے تکیہ دیا اور اُوپر لحاف اُوڑھایا۔ فقیر حسین کی آنکھوں کی صرف سفیدی ہی نظر آ رہی تھی۔ وہ رضائی کی گرمی پا کر بے ہوشی سے گہری نیند میں چلا گیا، لیکن دونوں ماں بیٹی ششدر دری پر کھڑی رہ گئیں۔ خاصی دیر چپ رہنے کے بعد بے جی کے اندر کا اُبال مُنہ تک آ گیا۔ انہیں شبہ بھی نہ تھا کہ فقیر حسین جس کے لمبے بازو اور ٹانگیں صوفے میں سما نہ رہے تھے، کچھ سننے کا اہل ہے.... وہ بلک کر بولیں:

"لے جمیلہ، تیری ضد نے تو میری ناک کٹوا دی۔ اب جو میر صاحب ریڈیو سٹیشن سے آ گئے تو میری تو شامت آ جائے گی۔ مجھے تو اس کے گھر کا بھی پتہ نہیں ورنہ ٹیکسی پر ہی چھوڑ آتی!"

"کیوں، شامت کیوں آئے گی بے جی؟" جمیلہ نے ان بھول پوچھ لیا۔

"ایک اجنبی نامحرم.... اور ہم دونوں اکیلی ہیں.... اس حال میں۔"

جمیلہ نئی تعلیم سے آراستہ تھی اور بے جی جتنی ڈرپوک بھی نہ تھی۔

"بے جی! اُستاد جی کو تیز بخار ہے۔ ابھی ہوش میں آ گئے تو گھر چلے جائیں گے۔ اس قدر آنکھیں پھاڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

بے جی طیش میں آ گئیں۔ "چلے جائیں گے.... آ گئے تھے.... یہ تو کیسے بول رہی ہے جمیلہ.... معمولی میراثیوں کا لڑکا اور تو اس کی اتنی عزت کر رہی ہے، کیوں؟.... تیرے ابا جی سن لیں تو میری چمڑی اُدھیڑ دیں گے۔"

نہ جانے کیوں جمیلہ کی آواز اُونچی ہو گئی۔ "بے جی! یہ میرے اُستاد ہیں۔ ٹیچر ہیں میرے.... میں ان کی عزت نہ کروں؟ پھر ان کا علم مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔"

اب ماں بیٹی جھگڑے کی حدود میں داخل ہو گئیں اور انہیں بھول گیا کہ فقیر حسین کہیں سنتا ہی ہو۔

"میں پچھلے دنوں سے یہ دیکھ رہی ہوں جمیلہ! تیرے تیور بدل گئے ہیں۔ جو بات بیٹی کے دل میں ہوتی ہے، ماں کے ناخنوں میں ہوتی ہے۔ مجھے کوئی ایسی ان پڑھ جاہل نہ سمجھنا۔ جو کچھ سات پردوں میں چھپ کر تو سوچتی ہے، مجھے سب معلوم ہوتا ہے۔" ماں گرجی۔

"لیں، میں نے کیا سوچا ہے کبھی.... کیا کیا ہے میں نے کہ آپ بپھر رہی ہیں؟" جمیلہ معترض ہوئی۔

ماں غصے میں چند ثانئے چپ رہی، پھر گردن اکڑا کر بولی: "ضروری ہے کہ کچھ کرے تو پتہ چلے۔ تیرا رویہ ہی ایسا ہے جیسے مری جا رہی ہے.... اب اُستاد جی کے لئے کشمیری چائے بن رہی ہے، اب مٹھائی جا رہی ہے، اب گلاس مانجھا جا رہا ہے، اُستاد جی کا گلا نہ خراب ہو جائے۔ بھئی خدا کو کسی نے دیکھا نہیں، مانتے سبھی ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بے جی!" جمیلہ کے سر سے چھت اُڑ گئی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ابھی تو میر صاحب نے تجھے فقیر حسین کو دری پر سے اُٹھاتے نہیں دیکھ لیا۔ وہ دیکھ لیتے تو قیامت آ جاتی.... فلمی شاٹ لگتا تھا۔"

پتہ نہیں کیا بات تھی لیکن جمیلہ بھی کبھی کبھی لمبے سفر لمحوں میں طے کر لیتی۔

"زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا بے جی! زیادہ سے زیادہ میں اُستاد جی سے شادی کر لوں گی ناں.... ایسا فنکار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے، بڑا اعزاز ہو گا میرے لئے...."

زناٹے سے ایک تھپڑ جمیلہ کے مُنہ پر آیا۔ فقیر حسین یکبارگی صوفے سے ہاتھ باندھ کر اُٹھا۔ "آپ انہیں کچھ نہ کہیں بے جی.... میں چلتا ہوں۔"

بے جی کا شاور بند ہونے میں نہ آ رہا تھا۔

"جمیلہ ہم نے تیری خواہش کا احترام کیا.... سارے اُصول توڑ کر.... ہم نے تجھے یہ آزادی نہیں دی تھی کہ اس بے عزت کنگلے کو ہمارے مُنہ کی کالک بنا دے...."

"آپ ہی تو کہا کرتی ہیں عزت اور دولت خدا دیتا ہے.... وہ کسی کی سفارش سے تھوڑی دیتا ہے، ان کو بھی دے گا بے جی...."

"آج تک تو نے کبھی میرے سامنے مُنہ نہیں کھولا جمیلہ اور آج اس بھک منگے مراثی کی خاطر میرے مُنہ آ رہی ہے۔ لعنت ہو تجھ پر...."

فقیر حسین اور جمیلہ دونوں چپ ہو گئے۔ پھر فقیر حسین نے رضائی کو پرے ہٹایا، تان پورہ اُٹھایا اور لڑکھڑاتے قدم باہر کی جانب اُٹھاتا ہوا بولا: "بے جی رضائی دھلوا لیجئے گا...."

"ٹھہرو.... ٹیوشن کا حساب کر کے جاؤ...."

"ریڈیو سٹیشن پر لے لیں گے جی۔ اچھا جی خدا حافظ۔"

فقیر حسین کانپتا لرزتا، پسینے میں بھیگا، کھیس میں تنبو سا بنا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

جمیلہ کو فقیر حسین سے محبت نہ تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساری زندگی تو کیا ایک دن گزارنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔

جمیلہ خوابوں والی لڑکی بھی نہ تھی۔ لیکن اس وقت فقیر حسین کی بے چارگی نے

اس کے دل پر بڑا گہرا زخم چھوڑا۔ اس نے اپنے ہوش میں کبھی بے جی سے ایک سخت جملہ بھی نہ سنا تھا۔ اب نوبت جھڑپ تک آ گئی۔ اس کا جی جان سے جمیلہ کو ملال تھا۔ اس رات وہ دیر تک جائے نماز پر بیٹھ کر روتی رہی۔ اسے فقیر حسین کو حاصل کرنے کا شوق تھا نہ وہ بے جی پر اپنی معصومیت ثابت کرنا چاہتی تھی۔ بس رہ رہ کر اس کے دل سے ایک ہی صدا نکل رہی تھی: "یا میرے مولا! جیسی بے عزتی سے تو نے اُستاد جی کو نکالا، ایسے ہی بڑی عزت سے انہیں یہاں لانا.... عزت اور رزق تو ہی دیتا ہے میرے مولا.... مجھے یہ دن دکھانا ضرور.... میرے آقا! میرے گھر والوں، دنیا والوں کو یہ ضرور جتانا کہ عزت اور رزق تو ہی دیتا ہے، اس پر کسی کا اجارہ نہیں۔"

شاید یہ گھڑی قبولیت کی تھی.... شاید اس کے آنسوؤں نے ساتویں آسمان میں بلڈوز کر کے بڑا سوراخ کر دیا تھا.... ہو سکتا ہے اسی لمحے جمیلہ کی معصومیت نے اُوپر والوں سے پرومسری نوٹ لکھوا لیا جس کی عندالطلب تاریخ کا خانہ خالی تھا۔

فارن سوٹوں میں ملبوس، ناگ پھن ٹائیاں لہراتے، آرام دہ اطالوی جوتوں میں ڈٹے، تمباکو اور خوشبوؤں میں بسے بزنس ٹائی کون، سٹاک ایکسچینج کا مُنہ موڑنے والے، بیرون ملک فائیو سٹار ہوٹلوں میں چھٹیاں گزارنے والے، بچوں کے سکول، تازہ سکینڈل اور غیر ملکی سیاحتوں کو گفتگو کا حصہ بناتی ہوئی خوش باش گرومڈ عورتیں.... کھانے کی چیزوں کے اِردگرد براؤن، بروز اور گولڈ کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اس حیثیت پرست، خودپسند اور خود آگاہ دولت مندوں کی نگری میں پشمینے کی چادر کو اپنے نحیف کندھوں کے گرد لپیٹتا ایک جادوگر آ گیا تھا۔

اس کے پاس شہرت کی بانسری تھی.... وہ اپنے فن میں یکتا تھا اور اس کی اکیتائی کو دولت کی باڑھ توڑ نہ سکتی تھی۔ فقیر حسین نے دھڑی دھڑی کر کے سارے شہر کو لوٹ لیا۔ مرد حضرات پھر بھی کچھ دھانسے لیکن عورتیں تو اس دھری کے گرد گوپی رنگ اکٹھی ہو گئیں۔ نیوز رپورٹر کی طرح ہر عورت اپنے لئے ایک الگ کہانی خارج داخل کرنے کی فکر میں تھی۔ کچھ بے پر کی افواہیں، کچھ رسالوں سے اخذ کی ہوئی خبریں، انٹرویوز، فضا میں پھیلے تھے.... جمیلہ ان پری وش خواتین میں راہ بناتی فقیر حسین تک پہنچی۔

اس کے آنے پر فقیر حسین نے نگاہیں نیچی کر لیں اور ہاتھ پرارتھنا کے انداز میں جوڑ لیے۔

"بی بی کیسی ہیں آپ؟"

کچھ ابرو تحیر، کچھ تجسس میں اُٹھ گئے.... آرٹ سے محبت کرنے والی خواتین کے لئے یہ ایک نیا سکینڈل تھا۔

"اچھی ہیں آپ؟...."

"جی...."

"اور بے جی....؟"

جب سے میر شبیر حسین فوت ہوئے، بے جی فالج سے پڑی تھیں۔ جمیلہ کو میکے گھر جانے کی فرصت کم کم ملی۔ بے جی کے لئے ایک بڑھیا نوکرانی رکھ دی تھی جس کی تنخواہ اور اخراجات جمیلہ باقاعدگی سے ادا کرتی.... لیکن اس کی زندگی کا ڈھچر ہی کچھ ایسا تھا کہ کشمیری بابا کے محلے کی طرف جانے کا اتفاق کم ہوتا۔ جمیلہ بے جی کا نام سن کر گم صم ہو گئی۔

"اور بے جی؟...."

"وہ بھی ٹھیک ہیں جی.... آپ کو یاد کرتی ہیں۔" پتہ نہیں جمیلہ کے مُنہ سے کیوں نکلا؟

"میں حاضری دینے آؤں گا جی.... آپ کی طرف۔ اور میر صاحب؟"

"اباجی تو.... فوت ہو گئے...."

دونوں نے تھوڑی دیر خاموشی سے سر جھکا لیا.... جیسے کسی بڑے آدمی کا ریفرنس ہو۔

سنا ہے شہرت اور دولت میں ایک صفت میلہ گھومنی کی بھی ہے۔ یہ پھوار کی طرح پڑتی ہیں، شبنم کی طرح اُڑ جاتی ہیں اور چھوا چھپ غائب ہو جاتی ہیں۔ جب ستارہ پیشانی فقیر حسین نے سارے لوگوں کے سامنے جمیلہ کے آگے عاجزی دکھائی تو پتہ نہیں کیسے شہرت اور دولت کی روٹھی ہوئی آبشار کے چھینٹے شاہد پر بھی آ پڑے۔ اس بھولے بسرے جوڑے کا گلیمر ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔ کچھ نے سکینڈل کی زبان میں کھسر پھسر کی۔ کچھ نے دست بدست تجسس کی تھالی پھرائی۔ کچھ نے آپس میں سوچا کہ شاہد کو از سرنو

راستہ دکھانے کی ضرورت ہے.... سنا ہے دینے والا بڑی حکمت سے دیتا ہے۔ جونہی شاہد کا مردہ ذکر زندہ ہوا، اس کے دن پھرنے لگے.... بدنصیبی کے ہاتھی کو کنکر لگتے ہی موت آ گئی۔ شاہد کا حسن بصیرت، سکیمیں، حسن انتظام، تدبیر سب کو نخلخہ سونگھایا گیا.... ہولے ہولے شاہد اپنی تجویزوں کا قائل، اپنی ذات پر بھروسہ کئے پہلے سے زیادہ خوش فہمی اور تکبر سے شہر کے وی آئی پی طبقے میں شامل ہو گیا۔ اسے لمحے بھر کو بھی گمان نہ گزرا کہ شاید اس میں مشیت کا بھی کوئی ہاتھ ہے....اور رضائے الٰہی بڑی ادا اور حکمت سے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔

لیکن یہ اور بات ہے کہ جس روز فقیر حسین بے جی کے پاس پہنچا، ان کا جنازہ گلی سے نکل رہا تھا۔ جمیلہ کو ایک ہی رنج تھا کہ بے جی نے فقیر حسین کی شان و شوکت کیوں نہ دیکھی۔ پتہ نہیں چھوٹے فرشتوں نے معاملہ غلط کیا کہ دعا کا پرومسری نوٹ بے وقت تھا.... پتہ نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے تحت بے جی کو اپنے کئے کی سزا نہ ملی.... تکبر مین سنا ہوا، شیخیوں کی آتش بازیاں چھوڑتا شاہد پھر اپنی دولت اور شہرت پر بحال ہو گیا۔

یہاں تک تو وہ سمجھ پائی تھی کہ عزت اور شہرت اللہ کے اذن سے ملتی ہے لیکن یہ بات ابھی اس کے دماغ میں نہ آئی تھی کہ کبھی کبھی بے قصور کو سزا ہو جاتی ہے اور کبھی بھاری غلطیاں کرنے والے ہری سنگھ نلوہ جیسے لوگ بچ جاتے ہیں.... شاید وہ روز حساب کے فلسفے پر پورا ایمان نہ رکھتی تھی اور اس کی اہمیت نہ جانتی تھی، ورنہ وہ شاہد اور بے جی دونوں کو معاف کر دیتی!

اسی لئے تو کبھی کبھی جب اسے ہجرت زدہ بچے بہت یاد آتے، اپنی بے مقصدیت اور بے معنویت سمجھ نہ آتی تو سنگ مرمر کے فرش پر جابجا اس کے آنسو چھینٹے بن کر گرتے جنہیں دیکھ کر شاہد کو غصہ آجاتا اور وہ اُونچی آواز میں تکبر سے کہتا.... "پتہ نہیں یہ گھر کب منظم ہو گا۔ پانی کے چھینٹوں سے فرش کی خوبصورتی تباہ ہو جاتی ہے۔ تم نے مجھ سے کچھ نہ سیکھا جمیلہ.... نہ پلاننگ، نہ وقت کا استعمال، نہ بندوبست، نہ تجویز.... مجھ سے سیکھو جمیلہ.... مجھے مانو...."

منسراج کا بین ؎

سُرت میں لاویں تو وے سال بڑا مینہ برسے رہا۔ سکل وخت بارش "ترم تو ترم تو" اُترے۔ شام سمے گھنا اندھیرا ہو جاوے۔ اودے کالے بادل بھیتر باہر ایک کر دیں۔ پھر رات بھر بارش دبہہ ڈرائے دھمکائے۔ رینی رات بھر بولے۔ بارش کنی بوند نہ گرے۔ سمندر اُتر آوے لہراں سمیت۔

دھیان میں لاویں تو اسی سال میں بہو زنت رانڈ ہوئے رہی۔ سارے پھل پھول پتر جھڑ گئے۔ اندر سے چھیلی چھمک نکل آئی۔ اسے دیکھ تو بیٹے کا گم بھی من سے بھاگا پھرے۔ زنت پٹی پر ماتھا پھوڑ پھوڑ لہولہان روتی رہے۔ پھر چادر تان لیٹ جاوے۔ چاروں بچے رینگ رینگ کر کبھی اِدھر سے چادر کھینچیں کبھی اُدھر سے، پر وہ موہ کی تاپ میں جلتی کرلاتی اپنے گھور اندھیرے میں بھٹکتی رہوے۔ جو میں اس کے دُکھ کو ہلکا کہوں تو رب سے ڈر لگے، جو بھاری کہوں تو جھوٹ لگے.... ہمارا اکیلا جاہد جب گھر سے چارپائی پر نکلا تو پوری دھرتی پیروں سے نکال لے گیا آسمان سمیت۔

سوچوں تو اسی سال میرے بیرن کے جڑواں بچے ہوئے۔ ایک بچہ بھائی پاس رہا پر مر گیا۔ جو میری ماں نے اپنی گود ڈالا کبھی ایک تاپ بھی اسے نہ چڑھا۔ میرے بھائی کی گھر والی جنمی ہو کر بانجھ رہی.... دوسرا بچہ اس کا ہو کر نہ پلا.... ہاں جی.... سچ ہووے

پانی بھرن پنہاریاں رنگا رنگ گھڑے
بھریا اس کا جانئے جس کا توڑ چڑھے

ایسے بھیگے دن.... سورج بادل کا کھیل۔ جیون ابھی کھانڈے کی دھار نہ بنا ہووے۔

؎ منسراج (من۔ سراج) جہانگیر کا پالتو ہرن

بڈھے بسیرے کی پنسن سے روکھی سوکھی چلا کرے۔ ایک دن مسجد سے واپسی پر بسرے نے چوکھٹ میں کھڑے چادر تانی بہو کنے دیکھا۔ اپنا جوان بیٹا اچانک جمین میں گڑ گیا، پر اس کو بہو کی چوٹ جیادہ لگی۔ نہر کنارے اُونچے پلازے کی تیسری منزل پر کانڈی بٹھل اُٹھائے جاہد کا پاؤں رپٹا۔ پاڑ سے گرا۔ تین پہر ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا پھر مکتی ہو گئی۔ اب متھا پھوڑنی بہو نہ بولے نہ چالے، بس چادر تانے الانی منجی پر مردہ پڑی رہے.... آتے جاتے بسیرے کو یہی درشن۔

ایک دن بڈھے بسیرے نے کھنکار کر چادر اُتاری مجھے للکاری آواج دی...."دیکھ ری جو بیدہ اسے تو دندل پڑی ہے۔ کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ پرانا کھونسڑا لا کر سونگھا، بہو ہوش میں آوے.... اپنے"

بڈھے سسرے نے گھٹنے پر سر رکھا۔ پوری بتیسی تالے بند۔ میں جوتا سونگھایا۔ پل بھر گزرا آنکھ کھولی۔ بسیرے نے کٹوری میں عرق گلاب ڈال کر پلایا۔ میں پاؤں کی تلیاں جھسیں، ہاتھ بازو ملے۔ زنت بدھی میں آئی۔ بیٹھی ماں کو دیکھ کر بچے رینگتے کھسکتے آ گئے۔ کوئی گود کوئی کندھے چڑھا۔ سسرے کو پاس جان کر کپڑوں کی سرت آئی۔ سر کی چدر ٹھیک کی۔ نجریں گالوں سے جوڑ لیں۔ سوگ کی ماری جندہ گڑیا نجر آنے لگی۔

اب بسیرے نے مت دینا شروع کیا.... "دیکھ جاہد کی بی بی! تجھ کو تیرے سنجوگ کا پھل مل گیا۔ تیرے آگے چار کھیلتے ہیں۔ اُدھر ہم دونوں کنے دیکھ.... ایک ہی بیٹا، نہ آگے نہ پیچھے۔ ساری عمر کی کمائی اپنے ہاتھوں جمین میں دبا دی.... اس کی اچھیا اس کے کام۔ کوئی پوچھے بسیرے ڈپٹی کمشنر کے دفتر سنگ پنسن پائی؟.... ہاں جی پائی! تو میو جاتی کا ان پڑھ، اِدھر آ کر تعلیم ہاتھ آئی؟.... ہاں جی آئی! ساری عمر کالی صندوقڑی اُٹھائے کر صاحب کے سنگ سنگ کوٹھی گیا۔ پہرہ رہے چوبیس گھنٹے۔ کتا بھی نہ بھٹکے اُدھر کوٹھی کے سامنے۔ پر اِدھر کے سپاہی لوگ بسیرے کو دیکھ دروجہ کھول دیتے رہیں.... کوئی پوچھے اجت پائی بسیرے؟ ہاں جی بہت پائی! .... پر کس بھاؤ زنت بی بی.... چاروں کھونٹ نجر چلا.... کیا ملا تیرے سسرے کو.... اپنے ہاتھ دروجہ کھول کر قبرستان لے گیا سارا مال.... کھد ڈالا جمین تلے.... اور تجھے کیا پتہ زنت بی بی.... کیا ہوا میرے ساتھ۔ چپ کر جا۔ نہ رو۔ تیرے آگے تو چار کھیلیں ہیں...."

اب بسیرے کے بھی آنسو بہے۔ مکھ پر لمبی لمبی جھریاں، سوکھے ہاتھ پیر، گیروا گہرا

سانولا رنگ، سفید بھنویں، ٹوٹے گرے دانت، آنسو گرے تو مکھ اور ٹوٹ پھوٹ جاوے۔ میری رانڈ بہو نے ترنت کھدر کی چدر میں موتی سمیٹے اور اپنی آنکھوں کو لگا لئے۔ اکھڑ راجپوت بولے گیا.... "زنت بی بی ہم میو لوگ.... کرنال بستی سے اُٹھ کر ایدھر آئے۔ سیخوپورہ کی دھرتی کو دیہہ سے لگایا.... ہم میو لوکاں کا کیا کام پڑھنے لکھنے سے، پر نئی دھرتی کی ریت دیکھ کر پڑھے.... سکول گئے، ماشٹروں کی مار کھائی۔ آٹھ جماعتاں پاس کی۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں چپراسی لگے رہے۔ دورے پر صاحب جاوے تو بسیرا ساتھ.... کوٹھی سدھارے تو بسیرا ساتھ۔ پر تیرے گھر والا سکول چھوڑ بھاگ گیا.... میں دل میں کھوب جانا یہ میو جاتی کا پرکھ ہووے، مانے پر مانے ناں.... چھوڑ دیا.... بس محنت مزدوری کو جا لگا۔ کیا دیا گارے چونے کے بٹھل نے؟ پاڑ سے گرا.... اِدھر آ گیا دفن ہونے کو ہمارے پاس.... لے میں کوئی روتا ہوں.... اکیلا تھا میرا جاہد۔ کوئی نیر بہا میری آنکھوں سے؟ کوئی جبر جستی کی میں نے اپنے مالک سنگ؟"

مینہ کے تیز تیز چھینٹے بسیرے کے نینوں سے گرے۔ میری رانڈ بہو نے اپنے سالو سے ترنت اس کی آنکھیں پونچھیں۔ اُٹھ کر پانی کا گلاس لائی۔ سسرے کے مُنہ سے چھوایا۔ بڈھے سے پیا نہ جائے۔ بہو کبھی ہاتھ جوڑے کبھی پاؤں پکڑے۔ آخر کو دونوں اِک دوجے کو چپ کرا کر پرانیاں باتاں کرنے چل پڑے۔ وہ کھاٹ پر بچہ گود میں لے کر بیٹھا۔ زنت چوکی گھسیٹ بیٹھ کر پیر دبانے لگی۔

یوں ہی جب جاہد کو میں سمجھا بجھا سکول بھیجا کروں ناں تب جاہد جانا نہ چاہے سکول میں۔ بولے اوکھے اوکھے سوال دیا کرے ماشٹر.... میں کہوں "تو نکال تو سہی، دیکھ تیرا ابا آٹھوں کر گیا ناں۔" پر جاہد تو سلیٹ پر پھر لکھے پھر مٹاوے.... لکھے پر پھر مٹاوے۔ میں پوچھوں "کیا ہوا رے، کیوں لکھ لکھ کر مٹائے جات، کچھ جم کر کام کر!".... جاہد اکھاں بھر کر بولے "میا طریقہ تو ٹھیک ہووے پر جباب ٹھیک نہ آوے۔ سوچوں رقم ہی گلط لکھی رہی نا تب۔"

ایسے ہی میرے من میں رات گئے گلط جباب آویں۔ سوچوں، دھیان میں لاؤں۔ کئی رقمیں جوڑوں۔ اے پالن ہار! ساری عمر بسیرے سنگ کٹ گئی، پر اب کیسے جباب گلط نکلا؟ سوچوں تو کوئی رقم ہی گلط لکھی گئی۔ طریقہ تو میرا بھی ٹھیک ہووے۔ اب میرے

مٹائے تو غلط رقم مٹے ناں۔ وہی جب چاہے تو مٹاوے۔ آدمی کے اپنے کنے تو کوئی اپائے ناں۔ وہی رب سچا جوبیدہ کی رقم مٹائے تو مٹے۔

لو پر سوچ کا بھی کچھ ٹھیک ناں۔ اِدھر سوچوں اُدھر بھول جاؤں۔ جو بھول جاؤں تو پھر سوچوں۔ عمر ثاپی عورت کو ہر گھڑی سوچ بچار۔ سب موسم ملے بیٹھے۔ ہر گھڑی نویں بھی پرانی بھی.....

سائیں سے سب ہوت ہے بندے سے کچھ ناہیں
رائی سے پربت کرے، پربت رائی ماہیں.....!

روتی کرلاتی تاؤ کنے جب میں پہنچی تو اس کی سمجھ میں کچھ آوے کچھ ناں آوے۔ میں بھی کیا بتاواں؟ بتانے کو کچھ ہووے تو مُنہ کھولاں۔ مُنہ کھولاں تو آنکھوں کی ندی چڑھ آوے۔ نیر نیر ندی نالا ملے تو دریا بہے۔ ندی ندی جڑتی جائے تو گھم گھیر دریا ہو..... دریاؤں کے جل مل جل کر سمندر بناویں۔ اب آنسو آنسو کی کتھا تاؤ کو کیا بتاویں؟ اتنا بڑا گم کا پوکھر کیسے بنا جس ماں ڈوب جانے کو من چاہے.....اس کی کتھا تاؤ کو کیسے بتلاویں؟..... نیر تو جب بہیں، بے کار بہیں۔

بس تاؤ جمیل سمجھائے رہا۔ "دیکھ تاؤلی! سارا تو تیرا سر سفید ہوا۔ مُنہ مین دانت کہیں ہووے رہا کہیں ناں۔ آواج تیری سننے کو اپنے کان کو ہتھیلی کی پیالی بنا کر لوگ سنیں۔ کھوہ میں گری کنکری کا پتہ لیویں۔ پھر ایسا کٹھور دل بھلی مانس تجھ سے تو بسیرا ابھلا۔ بہو بچوں کے سر پر ہاتھ دھرے سے جائے..... اپنی پیڑ بھول..... پرایا گم بہو کا سہے۔ کٹھور جالم یہ عمر کوئی اپنے لئے جینے کی ہووے؟ ایسا پتھر کر دیا تجھ کو جاہد کی موت نے۔ کسی دوجے کا دُکھ تیں کو نجر نہ آوے پل بھر کو۔ اتنے برس جب تیں لاہور گجار لئے تب اب کاہے منسراج کی لاٹ تلے آ بیٹھی..... اُو رے پالن ہار کچھ اثر نہ گھیرے اس بڑھیا کے من ماں..... تو ہی کچھ سمجھا اس کٹھور کنے۔"

اب تاؤ کے سامنے کیا سینہ پیٹوں۔ کیسے بتاواں تاؤ کو سارا راج پاٹھ چھن گیا؟ ٹوٹی کھاٹ، نہ بان نہ بسترا۔ کوئی دن کو ٹھہر جا تاؤ چولہے کا بالن بن جاؤں، کیا بتاواں تاؤ کنے؟ چولھے چونکے پر زنت بی بی کا قبجہ ہوا۔ بڈھے بسیرے کو نہ میرے مرنے کی پھکر نہ جینے کی۔ آگے جب میں چولھے آگے سے گھٹنا پکڑ کر اُٹھوں تو بسیرا اپنا ناڑیوں بھرا سوکھا ہاتھ

بڑھاوے۔ اپنا جور لگا کر کھڑا کر دے۔ اب بیٹھ موڑ زنت کے بچوں کو آواجاں مارن لگ جاوے۔ تاؤ تیرے سنگ کیا بتاواں۔ کدھر سے سروع کراں۔ اور جو بتاواں تو تاؤ سمجھے کیا؟ میرے اماں باوا تو پاکستان ہی نہ پہنچ لئے۔ راہ میں ہی گل کٹینن نے ڈھیر کر دیئے۔ ماں کی کھون بھری چدر سر پر اُوڑھے میں باڈر پہنچی..... ساری عمر لہور میں گجر گئی بسیرے سنگ۔ اب سر پر چدر ہی نہ رہی۔ تاؤ کو کیا بتاواں کیوں آئی رہی میں من سراج کی لاٹ تلے۔ میرا تو سارا مال ہی جمین نے کھا لیا۔ اب تو پالن ہار کو آواج نہ دے سکوں، تاؤ کی رہی دوسری بات..... وہ تو ہو لیا بسیرا ساتھ..... بڑھاوا دیوے تو بسیرے کوں..... میری بات کب سمجھے؟ میرا تو سارا مال ہی لاہور کی جمین نے کھا لیا۔ میں کوئی خوشی سے تو نہ آ رہی من سراج کی لاٹ تلے!

کیسے بتاواں یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ چھوٹی باتاں سے بڑی باتاں جنم لیں۔ زنت کا سب سے چھوٹا گلزار رو رو ہلکان، منی کے دانت نکلتے ہوئیں، وہ جدا اُوکھی۔ بڑے کا کے کے آنکھ دکھنے آئی رہی۔ چاروں بھیں بھیں کر کے روئیں تو لگے گھر کا تختہ اُلٹ گیا۔ چاروں کو گھیر گھار، سیٹی کا لالچ دے دلا میں گلی میں نکلی۔ ایک ڈھاک پر، ایک اُنگلی لگی، دو روں روں کرتے ساتھ چلے۔ بھکانے والا سائیکل پر ہووے۔ اس کے کنے پلاسٹک کی غلیلیں، چھوٹی چھوٹی قینچیاں، بھکانے، پلاسٹک کی پستولیں، پٹاکے، بچوں کو پچکارنے لئے انت کا سامان ہوا کرے۔ وہ تو فر سے آگے نکل گیا۔ میں واجاں مارتی رہ گئی۔ میرے گھٹنے سے شتابی چلا نہ جائے۔ رونے بچوں کا ساتھ۔ کھسکاتی کھسکاتی، دوڑتی رکتی سائیکل والے کے مگرے مگرے گئی۔ پر وہ تو سائیکل پر ہووے۔ گلی کی نکڑ پر جائے کے دیکھاں تو وہ رن وانا، شتاولا موڑ کاٹ اُونچے اُونچے آواز لگاتا پکی سڑک پر ہو لیا۔ بچے تو گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگے۔ بڑے نے تو ابا ابا کہہ کر بلکنا سروع کر دیا۔ میں کو چپ کرانا مسکل۔ جھوٹے وعدے، اگلیاں پچھلیاں باتاں میں لگا گھر مڑی۔ گلی سے تین سیڑھیاں اُونچا ہمارا دو کمروں کا گھر ہوا کرے۔ ہرا دروجا ادھ کھلا چھوڑ گئی۔ وہ ٹوٹے دانت سمان پڑا جھانکے۔ آنگن میں پاؤں دھرا تو بسیرا کی آواج آئی۔ وہ آلا اودل گائے رہا۔ جوانی میں بسیرے کی آواج سن کر من میں خواب جاگیں۔

لو پھر یہ بات بھی بتائے رہوں۔ بسیرے کے کھاندان سنگ میرے تاؤ کا کوئی

سمبندھ ناں۔ تاؤ ہمارا لڑکوں کی کھوج میں پھرے۔ پھر کسی نے ٹوہ دی۔ لڑکا جوان گیروے سانولے رنگ کا' آٹھوں پڑھا لکھا' لاہور کے ڈپٹی کمشنر کا چپراسی لگا ہووے۔ تاؤ کی اپنی تین ٹانڈے جیسی دھیاں' اُوپر سے میں چوتھی مالک نے لادی۔ تاؤ میرا پالن ہار کے کاموں پر نربھر۔ نہ کبھی رویا نہ گلہ سکایت کی۔ بسیرے کو بلایا سیخوپورے ماں۔ تاؤ کا کھاندان اس سے منسراج کی لاٹ کے پچھواڑے کچی پکی بستی کی سکل میں رہت بنائی رہے۔

بسیرا آیا۔

یہ لمبا قد' سر پر راجپوتی صافہ' لمبے باجو والی گھیرواں قمیض' کانوں میں گول گول سنہری بالیاں' کلائی پر گھڑی۔ چلے تو مور تھرکے' بیٹھے تو راجہ لگے۔ تاؤ بولا..... "لے جوبیدہ بارش آئی کھڑی' بھادوں کا بادل جانے کتنی دیر بہے..... تو شتابی پوڑے بنالے' دیر نہ کریو۔ گھنا بادل ہووے' بسیرے کے صاجب نے لمبی چھٹی نہ دی' گھڑی کو لوٹے گا۔ جلدی پوڑے بنادے۔"

میں تاں بیٹھی مال پوڑے کا آٹا گھولن۔ باہر بسیرے نے آواج نکالی' گھر والوں کو آلااودل سنانے لگا۔ آواج سن کر میرے تو ہاتھ نہ چلیں۔ پاؤں جمین نے پکڑ لئے۔ دل کی آواج کانوں کو آنے لگی۔

بسیرا جانے کتنے پوڑے کھا گیا۔ ہر بر کی سنگ اُونچے اُونچے بولے "واہ!....." ہم چاروں کھی کھی ہنسنے لگیں۔

جب بسیرا لاہور چلنے کو ہوا تو تاؤ بولا..... "لے بھائی بسیرے! ہم سارے اُجڑ بگڑ کے اِدھر آئے رہے' بڑی بوڑھیاں ہماری مرکھپ گئیں۔ پر سرع میں کیسی سرم۔ تو اپنے مُنہ سے بول' تیں کو کون سی اچھی لگی چاروں ماں سے؟"

بسیرا گھنی دیر چپ رہا' پھر بولا..... "اچھی تو ساری ہیں پر لے تو نے پوچھ ہی لیا تاؤ جمیل تو میں کو اس کا ہاتھ پکڑا جس نے یہ میٹھے رسیلے پوڑے پکائے..... جو کبھی ہاتھ چھوڑ دوں تو بسیرا نام نہیں....." لو جی اس کے بعد تو بیاہ تک سب ہی مجھ کو پوڑے والی پکارا کریں چھیڑنے کو۔ تاؤ کی تینوں دھیاں نے میرا نام جوبیدہ پوڑے آلی رکھ دیا۔

پھر بات تو ادھ میں رہ گئی..... اس بڑھاپے کا ستیاناس مارا جائے۔ کبھی کچھ یاد آوے کبھی کچھ۔ پوری بات خود کو یاد نہ آوے تو تاؤ کو کیا سمجھاویں! ہاں تو تاؤ سن:

دھیاں جنوائی لے گیئوں اور بہواں لے گئیں پوت
او رے بسیرے جانگلی! تم رہے اوت کے اوت

بسیرے جانگلی کو معلوم ناں جو بہواں نرے پوت ہی لے جاویں تو جان بچے۔ وے تو بیاج' اصل کوڑی کوڑی سمبرلیں۔ پائی نہ چھوڑیں کسی کے ہاتھ..... میں جو آنگن میں چاروں رینگتے کرلاتے بچوں سمیت آئی تو بڑا "ابا ابا" کہہ کر بلکے' سنا نہ جائے۔ جوانی میں بسیرے کی آواج کھڑک دار باجے بھرے ڈھول جیسی ہوا کرے۔ اب تھوڑا گلا بیٹھ گیا' پر اب بھی اس کی آواز میں آلااودل سن کر پاؤں دھرتی سے نہ اُٹھیں۔ رکنا پڑے۔ اندر گھس کر دیکھوں۔ بسیرا بنیان دھوتی پہنے چولہے کے پاس رنگیلی پیڑھی پر بیٹھا گائے۔ اس کا گہرا سانولا گیرو رنگا مکھ چھپر کی چھاؤں تلے خوشی میں دمکتا ہووے۔ سر پر وے نے مہندی لگا رکھی۔ سلور کی بڑی تھالی میں بڑا گول پوڑا لئے چسکوں سے کھائے رہا۔ زنت نے چولہے پر توا چڑھا رکھا میرے جہیز کا۔ نواں توا چولہے پر چڑھائے رہا اور پان کے پتے سے پوڑا برابر کر رہی۔ مجھے دیکھ آنکھیں گالاں سے لگالیں۔ چوراں مافق نظر نہ اُٹھائے۔ بچے پکوان دیکھ ماں پر لپکے۔ بھول بھال گئے کون سی دادی کیسی دادی! ماں نہ بولے نہ چالے بس پوڑا سدھراتی جائے۔ مجھے دیکھ کر ناں بسیرا بولا..... "اِدھر آجا جوبیدہ..... لے ری شتابی آ۔ ہمارے تو بھاگ کھل گئے۔ کیسی سیکھی سکھلائی جنت مل گئی۔ ہم نے تو ساری جندگی پوڑے میں انڈہ نہ ڈالا۔ اس نے سالم چار انڈے ڈالے پھینٹ کر۔ کھا کر دیکھ کیک کا سا مزہ آوے۔ تو بھی سیکھ لے اس سے۔ کیا غضب ڈھائے رہی' ایک سے ایک گول رسیلا پوڑا..... واہ..... واہ"

بچے سب سے پہلے پہنچے۔ پھر میں گود والے کے ساتھ چھپر تلے گئی تو بڈھا بسیرا پھولوں والے روغنی پیالے سے سڑک سڑک چائے پیوے تھا۔ سانولا گیروا رنگ دغ دغ کرے تھا' شام سمے کی سرخی جیسا..... "یہ ساتھ والی کشمیرن سنگ سبز چاہ بنانا سیکھ آئی ہماری جنت..... گھونٹ بھر پی کے دیکھ جوبیدہ..... ہماری تو قسمت جاگ گئی بھلی لوک..... عیش ہو گئے عیش۔ رسیلے پوڑے..... سبز چاہ..... واہ واہ..... واہ وا"

پھر بسیرے نے بڑی چاہت سے میری اور پیالہ بڑھایا۔ وہ تھوڑا بہت لجا گیا.....

"لے پی..... دیکھ جوبیدہ سورگ کا جھوٹا ہوئے رہا....."

پل بھر میں میرے پاؤں جمین نہ پکڑیں- ساری دیہہ ریت کی بن گئی- نیں کمرے بھیتر جانے کو چاہوں.... "بس بسیرا میں کوں تاپ چڑھنے کو آوے، لیٹن دے.... ہڈی ہڈی دُکھے آج تو-"

ان دن سے میں اناڑی کا چولہا چونکا چھوٹا- زنت بہو کو کبھی پیاز چھیل دیئے، کبھی آٹا گوندھ پرات دھو دیوار سے لگائے دی- سل بٹے پر مسالہ بنائے دیا.... ہاتھاں سے ڈوئی چھوٹ گئی- پہلے پہل جھوٹ موٹھ کمر درد سے پڑی رہوں- پھر چاروں بچوں کی گھسیٹ اُٹھانے کمر میں درد ٹھہرائے دیا- کھاٹ ہی اچھی لگے- ہوں ہوں کروں تو آرام آوے-

پھر بھی بسیرے کا حقہ تازہ کر کے اس کے آگے دھروں- ایک دن نیم تلے کھاٹ پر پڑی سوتی رہی- زنت نے حقہ تازہ کیا، لال انگارے چلم میں دھرے اور دھو مانجھ کر حقہ بسیرا آگے کیا- بس گڑگڑ کی آواج سن کر جاگی- آنکھ کی جھری سے دیکھا- مہندی لگے لال لال بال، گیروے سانولے رنگ میں کوئلے دِکھیں- بسیرا بولا

"واہ جنت تیں اس حقے پر بھی جادو کر دیا...."

"کچھ نہیں گلزارو کے دادا.... گندا تھا، مانجھ دیا- چلم میں بھی راکھ بیٹھی ہوئے، وہ بھی جھاڑ دی-"

"ناں ناں.... مانجھنے سے کوئی خوشبو تھوڑی آنے لگے.... میرا تو سارا سینہ خوشبو سے بھر گیا- بھلی لوک گلاب کا تختہ کھل گیا بھیتر...."

"گلزارو کے دادا تھوڑا عرق گلاب ملایا تھا حقہ تازہ کرتے سمے، اس کی خوشبو ہو گی-" زنت بولی-

"عرق گلاب تیں کوں کہاں سے ملا....؟" ابھاگا رنگیلا بولا-

"لے بھول گیا؟ پچھلے بدھ کو لایا نہیں تھا تیں جب گلزارو کی آنکھیں دُکھنے آئیں-"

"ہاں بھئی ہاں لایا تھا- بڑی سگھڑ ونتی ہے تو زنت- ساری چیز وستو سنبھال لے، کچھ ضائع نہ کرے.... ہاں جی ہاں لایا تھا، لایا تھا"

تس دن بعد قسم لیئو جو بسیرے کا کوئی کام میرے جے لگا ہووے- ہولے ہولے زنت نے کٹی پتنگ کی ساری ڈور سمیٹ اپنے کھیسے میں ڈالی- لمبے باجو کی آستین میں کلائی

پر چوڑیاں بھی سینت سینت وہی ڈالے تھی- صافے کو مایا لگانا، مٹی دھول میں سنی جتی کو صاف کرنا، کاناں کی بالیاں چمکانا سب کام چلتی پھرتی ترنت ترنت زنت کر دیتی- اور ہر کام میں ستھرائی صفائی سگھڑ پن.... ماں کی کھال اُدھیڑنے کو چاروں روں راں بچے آگے پیچھے رہ گئے- بال کھینچیں، دھموکے ماریں، سلیپر چھپاویں، تکیہ گھما کر سر میں ماریں، کھوپری ہل جاوے میں بڑھیا کی.... تس پر نہ مارنے کی اجاجت نہ گھرکنے کی- ترسیلا بسیرا ڈھے ڈھے جاوے، رو رو بولے.... "او ری جوبیدہ! ہمارا غمی کا گھر، تیں ان مجلوم یتیموں کو برا بھلا کہہ کر کیوں عاقبت برباد کرنے بیٹھ گئی؟ انتر کو کیا جباب دے گی پاک رسول کوں؟"

دیکھتے دیکھتے میں جوبیدہ سے بڑھیا ہو گئی- جب بلاوے بسیرا، بڑھیا کہہ کر آواج دے- سوچوں تو میں تو ایسی چھڑیا ہوئے رہی جس کا سہارا لینے والا کھاٹ کا ہو رہے- کونے میں کھڑی، جالے میں تنی- کبھی نالی کھولنے، کتے بھگانے، بچے دھمکانے، فقیرنی ڈرانے، چھپکلی مارنے کو چھیڑیا اُٹھائی، پھر کرموں جلی کونے میں اچاٹ من کھڑی کی کھڑی- بھولی بسری کی کوئی بات نہ پوچھے!

سروع سروع میں جب زنت کو دندل پڑا کرے تو بسیرا ترنت میں کو آواج دے- پھر ہولے ہولے وہ خود ہی کافی ہو گیا- بسیرا مرے جاہد کو رونے لگتا تو زنت میری بہو آواجیں دے کر بلاتی- کچھ دناں بعد اس کوں بھی چپ کرانے کا ڈھب آ گیا- چادر تان کر سونا ختم ہو گیا- سوکھی ڈالی ہری ہونے لگی- زنت پاؤں کی ہلکی، ہاتھ پیر کی چست رہی- سارے گھر میں پھرکی سی گھومے پھرے- کبھی پنڈلی کھجلائے کبھی سر، کبھی تالی بجائے کبھی چٹکی- چلے تو لمبا پراندہ کبھی دائیں کولہے پر کبھی بائیں جاتا ہوا.... آواز میں ترنگ، آنکھوں میں لو-

بسیرے کو رات دن بہو بچوں کی دبدھا، ان کا دھیان.... سارا دن کبھی سکول، کبھی کھلونے، کبھی چاٹ مسالے چارپائی پر دھرے بولے.... "او ری جوبیدہ اُٹھ کچھ ہمت کر بے چاری سارا دن اکیلی جان کھپاوے- بھلے جو اس کے گھر والے کل کو سنیں تو کیا کہویں! کوئی نوکرانی تو ناں لائے ناں- دو چار برتنوں کو ہاتھ ڈالے تیرے ہاتھ تو نہ گھس جاویں-"

سرم کی ماری میں بڑھیا اُٹھوں- سارا کھرا تھالی کٹوریوں سے بھرا مانجھ مونجھ رکھوں- پرات ہانڈیاں دھو بنا ٹھکانے پر رکھے جاؤں- بسیرا گھر لوٹے تو جلدی پیڑھی گھسیٹ

کھرے میں جا بیٹھے زنت بی بی۔ بسیرا آگے بڑھے تو لمبی آہ بھرے۔ زنت کبھی مُنہ پر آئی لٹ پرے کرے، کبھی پاؤں دُکھ سے کھجائے۔ گڑیا سی بن جائے، پلکیں جھکائے۔

میں نیم تلے کھاٹ پر لیٹی چاروں بچوں میں گھری.... سوچوں تو زنت کا بڑا دُکھ لگے، نہ سوچوں تو اپنا دُکھ اُٹھائے نہ اُٹھے۔ سارا دن میں مرن ہاری کو نہ جاہد کا غم نہ راج پاٹھ چھن جانے کا روگ.... چار آفتی بچے اپنے بھاگ پھل کو روئیں، میں کو جھنجھوڑیں، توڑیں، مانو پرانی لاش کو گیدڑ.... ہے ہے ماروں تو کٹھور.... لاڈ کروں تو بگاڑنے والی.... سوچوں تو اپنے پر ترس آوے، نہ سوچوں تو اُوپر والے بلوان سے لڑا نہ جائے۔

پھر سردیوں کے دن آئے۔ ٹوٹی پھوٹی رجائیوں میں تن ٹھنڈا رہووے۔ رات پانی کے گھڑے باہر ہوویں تو صبح کہرا جمے ہوئے ان میں۔ ان ہی ٹھٹھرتے دنوں میں زنت کی میا بیٹی سے ملنے آئی۔ وہ بھی ہرن مینارے کے پچھواڑے نئی بستی میں رہووے، تاؤ کی بستی سے میل بھر دور.... کیسری جوڑا، مینڈھیاں گندھی ہوئی.... گلے میں چاندی کا زیور۔ چلے تو پازیب بولے، بیٹھے تو ہاتھی دانت کا چوڑا کھنکے۔ جنوائی اور گھر والا ایک سال مرے، پر وے کہے کوئی مرے ہوؤں کے ساتھ تھوڑا مر جاویں لوگ.... جندہ ہوویں تو جندہ لوگوں کی آگیا لے کر تو نہ جیویں۔ چندن بی بی تو نکھری نکھری جوان، مدھ بھری نجر آئی میں کوں۔ کچھ روج دانتوں میں ماچس پھیرتے، لمبے لمبے ڈکار لیتے، بستی والوں کی باتاں کرتے ہمارے گھر گزری۔ پھر ایک رات جب سارے کمرے میں بند کھاٹوں پر آدھی نیندوں میں ڈھے رہے ناں تب چندن بی بی کا چوڑا چھنکا۔ وے بھی پلکیں جھکا گالوں سے لگا گڑیا بن جاوے بولے۔

"دیکھ بھائی بسیرا لوکاں کہے ہیں.... بات دل میں نہ رکھو، خمیر لگ جاوے بات کوں" بسیرا چارپائی پر لیٹا حقہ گڑ گڑائے۔ ٹھونکے کیل سا اُٹھ بیٹھا.... "چندن بہن! بول بول، کیا بات ہے۔ دل میں نہ رکھ.... یہاں کون سا غیر ہوئے رہا۔"

"چل رہن دے بھائی بسیرا...." پازیب چوڑا سنگ سنگ بولا۔

"ناں اب تو کہہ گزر...." بسیرا بولا۔

سوچوں تو بھلا کوئی عورت بولا کرے اور مرد کے کان نہ سنیں.... نہ سوچوں تو نہ کوئی سنے نہ کوئی بولے، بس ایک رولا پڑا رہووے جگ میں۔

چندن نے ماچس کی تیلی دانتوں میں پھرائی، پھر ڈکرائی اور بولی "جب سے میں آئی رہی، ایک ہی بات دیکھوں بھیا.... کام بہت ہے جنت کو۔ شادی سے پہلے یا کھیلے یا منجا توڑے.... میں مانوں بڑا پہاڑ سا دُکھ ٹوٹے اس پر.... پر تیں بھیا کانچ کی گڑیا کنے پلید بلی بنا دی نالیاں میں مُنہ مارنے والی۔ جو تو آگیا دے تو مہینہ دو کو لے جاؤں اُسے.... جرا جان تگڑی ہو جاوے تو لے آنا.... کوئی سدا سدا کو نہ بٹھا رکھوں اپنے پاس۔"

بسیرا چارپائی سے اُٹھا۔ اب تو اس سے بیٹھا نہ جائے "لے یہ چلی جاوے تو ہم بڈھوں کو کون دیکھے۔ جوبیدہ کی تو کمر جباب دے گئی، مردے سمان پڑی رہووے ہے کھاٹ پر.... اب تو چندن اس کا ہمارا ایک پنتھ.... ایک ڈار کے پنچھی کب جدا ہوویں۔ پر جو کوئی تنگی ہو تو بتلا دے، اپنے پلے برابر تو میرا وعدہ پورا زور لگاؤں...."

چندن بی بی کئی کروٹ بیٹھی، پھر ہاتھوں کے کڑا کے نکالے اور آخر کو بولی....

"لے بھائی بسیرا! وہ باقی سب تو جنت کے بس کا ہے۔ کام کاج میں بھی وہ ہٹیلی ناں.... پر روپے دو روپے کو بھی ہاتھ پھیلانا کبھی ساس آگے کبھی تیرے۔ اس نے تو جاہد موہرے بھی ہاتھ نہ پھیلائے کبھی۔ آخر ہم بھی راجپوت ہوئے رہیں، ہم کو بھی آن نے مارا.... لے تو انصاپھ کر دے۔ روپے دو روپے واسطے کوئی ہاتھ جوڑتا ہے۔ جمانہ بدل گیا بسیرا۔ آج کون گھر کا خرچ مانگے روج روج.... سارا سال؟"

"لے یہ بات ہے تو اس کا بھکر نہ کر چندن.... میں ساری پنسن جنت کے ہاتھ پر رکھوں ہوں آج کے بعد.... لے تو لمبی بات چھوڑ۔ میں کل ہی پنسن چڑھاؤں جنت کے نام۔ آپی لاوے، آپی خرچ کرے.... ہم دونوں کو کیا لینا ہے پنسن سے۔ کیوں بڑھیا؟ دو وخت کی سوکھی روٹی بھی دے تو دُعا پاوے.... ہمارا کیا کام پنسن سے۔ لے میں ٹنٹا ہی مکاؤں۔ آج سے پنسن تیرے نام ہوئی زنت.... کھلا لا.... سب کو کھلا۔ اللہ اللہ کھیر سلا۔"

لے اب تاؤ کو کیسے بتلاؤں!.... ساری عمر میں کو پتا نہ چلا کہ بسیرے کی تنخواہ کتنی ہووے۔ ریٹائر ہوئے پر پنسن نہ دکھائی کبھی۔ روپیہ دس روپیہ اکٹھے دے دیتا۔ گھر چلتا جائے قطرہ قطرہ قدم قدم.... کبھی پچاس روپے کا نوٹ بھی نہ دیا کھسی ساتھ اور پنسن بہو کے نام لکھوانے پر راضی خوش.... تھرکتا پھرے!

ابھی گھر پر جاگ نہ ہوئی تھی۔ میری کھاٹ پر چاروں بچے اُوندھے سیدھے پڑے۔

ہوویں۔ رات کو نیم تلے چٹائی بچھا میں گچھا مچھا پرانی دری اُوڑھ سوئی۔ ابھی اذان نہ ہوئے تھی۔ میں خرچ کے بچے پیسوں کو جوڑا۔ بائیس روپے کی اٹھنیاں چونیاں چراگ کے پاس طاق میں رکھ دیں۔ اپنے دو جوڑے گٹھڑی میں گانٹھے، ہرا دروجا کھولا.... اور تاؤ جمیل پاس منسراج کے پچھواڑے میولوکاں کی بستی میں آ رہی۔

تاؤ جمیل نہ پوچھا کب آئی، کب جائے گی۔ تاؤ کبھی سوالاں میں پڑا ہی ناں.... بس کوٹھڑی کھول کر بولا.... "تیں کو جب تک رہنا ہو، رہووے جا جوبیدہ، پر تیری آنکھ بتاوے تیں بسیرے پاس جانے والی ناں۔ جو میری مانے تو شام کو واپس لے چلوں۔ میرے سامنے بسیرا اُونچا سانس نہ لے۔ پر جو الاد بن ماں باپ پلے، وے کی آنکھ میں کٹھور تا ہووے تیرے جیسی.... ہیں بھلی لوک تیں اپنا جاہد بھی یاد ناں، تیں بہو کا ساتھ کیا دیوے؟ میو جاتی کی سوانیاں تو بھولے سے بھی گھروالا نہ چھوڑیں.... یہ نئی مٹی کا اثر ہووے، جمانہ ہی بدل گیا.... نئی رت نئی دھرتی.... تیری نجر تو تلوار بھئی.... لے لیٹ جا، میں روٹی لاؤں۔"

میں تاؤ کو کیا جباب دوں؟ کھاٹ پر ڈھیر ہوئی رہی۔

سوچوں تو ساری دُنیا اندھیر ہو گئی، نہ سوچوں تو سارا بدن ہولے ہولے سینک دے، اندر کا سوچنا بند ہو جاوے۔ ایسے ویسے میں کئی سال گزرے۔ میں کو ملنے بسیرا کیا آتا، وے تو تاؤ کو دیکھنے بھی نہ آیا۔

سالوں پیچھے بارشوں میں ہرن مینارے کی دیواراں ماں دراڑیں پڑ گئیں، پر سرکار کو سالاں بعد کھبر ہوئی۔ اس کے کارندے آئے، باہر کی دیوار تو تھمبو کر کے اساری۔ پر منسراج کی لاٹ سے جو انٹیں گریں، ان کا کسی کو ہوش ہی ناں۔ اینٹوں پر بکریاں چڑھیں، گدھے رینگیں۔ مرے ہرن کا جو سینک ہووے تو مرے راجہ جہانگیر کو.... پڑھی لکھی سرکار کنے کون ہرن؟.... کون راجہ؟ من سراج کی لاٹ ساری ڈھے جاوے تو سرکارے دربارے خبر نہ پہنچے۔

سوچوں تو آدمی کا من بھی زمانہ ہے، جو بھول بھال جائے تو پچھلیاں باتاں خواب میں بھی نہ آویں.... کون جوبیدہ کیسی جوبیدہ؟.... پر جو نہ سوچوں تو اپنا پچھلا وقت لمبی پرچھائیں بن کر ساتھ رہے.... اُٹھوں بیٹھوں سوؤں ساتھ رہے.... نجر سے اوجھل ہو تو خواب میں گھس جاوے۔

سال گزرے پر تاؤ نہ پوچھا کب آئی، کب جائے گی۔ ایک دن تاؤ کی منجھلی بھی اُجڑ کر آ رہی تو اُسے کوٹھڑی کا دروجا کھول کر اندر کرتے تاؤ بولا.... "پتہ نئیں جمانہ بدل گیا کہ ایدھر کے دانہ پانی میں کچھ ہے۔ کچھ موسم بدل گیا، میرے گھر کی لڑکیاں کٹھور ہو گئیں۔ منجھلی کی آنکھ بھی جوبیدہ جیسی کٹھور ہو گئی۔ تیں سے تو بسیرا اچھا جوبیدہ، ساری پنشن زنت کے نام لگوا دی.... کھد بنک جاوے زنت، کھد پنسن لاوے۔ سنا ہے ایک کوڑی کبھی نہ مانگے بہو سے.... مرے بیٹے کا حق ادا کر دیا۔ سنا ہے چار میل پر بچوں کا سکول ہے۔ کھد چھوڑنے جاوے، کھد لینے۔ سب سے کہتا پھرے ہے میرے جاہد کا دُکھ زنت کے دل سے ڈھل جائے تو سمجھ لینو میں جیتا بچا۔ زنت کے بچے پل جاویں، لکھ پڑھ جاویں تو جان لینو بسیرا مکت ہوا...."

اب تاؤ جمیل کو کیسے بتلاویں ساری عمر ایک دن پوری تنخواہ ہتھیلی پر نہ رکھی بسیرے نے تو پنسن ہوئے پر کیسی پنسن؟ کس کی پنسن؟ جو روئیں تو کس کے آگے، نہ روئیں تو سارا بدن آنسو بن جاوے۔ جی میں اِک کھیال رہووے تھا کہ آج بسیرا آوے گا.... صبح کی شام کروں، شام کی صبح.... کہیں دھیان میں اِک بسواس تھا کہ جیسے میرا جاہد تنگ تھا زنت کے ہاتھوں ویسے ہی بسیرا بھی تنگ آ جاوے کہیں۔ پر مرد جات جو پہلی سنگ نہ کریں وہی دوجی ساتھ جرور کریں۔ دوجی کا لاڈ نخرا جرور اُٹھاویں۔ تاؤ جمیل بتائے رہا قرض اُٹھا کر بسیرے نے چاندی کی ہنسلی بنا دی زنت کو.... بے رت کی سبزیاں لائے بسیرا.... کپڑا بھی زنت ریشمی پہنے، ناک میں لونگ بھی ڈال رکھے.... میرے جاہد سنگ زنت مرنے تھوڑا لگی ہووے.... چندن ٹھیک کہوے تھی۔

جب تاؤ کی تینوں اُجڑ کر کوٹھڑی میں آ بسیں تو سردی کی ایک رات تاؤ کمبل کی بکل مار دہلیز میں آ بیٹھا۔ دیر تلک گڑگڑی پیتا رہا۔ پھر ہرے چاند کو دیکھے آہ بھری اور بولا.... "پتہ نہیں یہاں کی مٹی میں کچھ ہے یا پھر جمانہ بدل گیا.... تم چاروں کی نجر کٹھور ہوئی۔ جو تم چاروں میں سے ایک بس جاتی تو منے تمہاری تائی کا غم بھولے۔ پر آدم زاد کا کیا ہے.... اللہ کی مٹی میں شیطان کا خمیر.... پھولے ہی پھولے وقت کے ساتھ ساتھ....

لو سنو میری جائیو.... اور تو بھی سن میرے بھائی کی اکلوتی نشانی جوبیدہ! جب میو جاتی ادھر کو چلے تو پتہ نہ تھا کدھر جائے ہیں اور کاہے کو جائے ہیں۔ راستے میں تین بیٹے

میں گنوائیں۔ جوبیدہ کے ماں باپ گل کٹیئن نے ڈھیر کر دیئے۔ ادھر آئے تو ہانک کر لوگاں نے سیخوپورہ میں لا ڈالا۔ یہ جو سامنے ہرن مینارہ نجر آوے تو یہ شکار گاہ ہوا کرے راجہ جہانگیر کا.... جب بادشاہ کشمیر جاوے ادھر ٹک کر شکار کھیلے۔ ادھر کوئی بستی شہر نہ ہووے تب، جنگل اُجاڑ۔ بڑے لوگاں کی بڑی باتاں .... بادشاہ کے پاس ایک کالا ہرن ہوا کرے، ریشمی کھال والا کالا چیتل.... ہرن پر راجہ کی نجر ٹکی رہووے۔ پل کو جدا نہ ہووے۔ ساتھ ساتھ رکھے چیتل من سراج کو۔ ہرن بھی چوکس، چونچال۔ کبھی قدموں میں لوٹے، کبھی نجر کا بان چلاوے.... ایک دن صبح سویر راجہ جہانگیر سکار کو نکلا۔ سنگی ساتھی ساتھ بندوق اُٹھائے۔ رانی نور جہاں گھوڑے پر سوار۔ صبح ابھی اندھی رہی، جیادہ روشنی نہ ہوئے تھی۔ بس آدھی روشنی ماں تارے آنکھیں ماریں۔ جنگل بیابان.... ایک ہرنوں کی ڈار گجری، راجہ جہانگیر نے بندوق داغی۔ سارے ہرن بھاگے رہے، ایک ڈھیر ہوا.... گھوڑے دوڑائے سنگی ساتھی بھاگے۔ خود راجہ سکار تک پہلے پہنچا تو میری جائیو!.... اور میرے بھائی کی آکھری نشانی سن! اپنی گولی سنگ راجہ نے لے پالک من سراج ڈھیر کر لیا۔ راجہ نے سینہ پیٹ لیا۔ کشمیر جانے کا کھیال بھولا۔ خود اُٹھا کر ہرن مینارے لایا من سراج کوں...."

منجھلی نے گرمی کھائی۔ پتہ نہیں مٹی کا اثر ہوئے رہا کہ جمانہ بدل گیا۔ وے بولی .... "ناں ابا تیں کو گلتی لگ رہی۔ من سراج گولی سے نہ مرا۔ وے تو بہت دیر بیمار رہا۔ بڑے حکیم بید آئے، آخر کو مر گیا...."

تاؤ جمیل بھی گرمی کھائے رہا، بولا.... "تیں کو جیادہ پتہ ہے کہ ماں کو؟ جیادہ پتہ رکھنے والیاں لوٹ آویں ہیں گھر کوں۔ گولی لگی جب عین اس گھڑی منسراج کے مُنہ سے آواج نکلی.... دُکھ بھری۔ سنا ہووے جب کالا سیاہ چیتل مستی میں ہووے ناں تب ایسی آواج نکالے۔ بھلا راجہ آواج نہ پہچانے اپنے چیتل کی۔ مرن ہارا بھی دُکھ میں نہ رویا.... مستی میں رویا۔ راجہ نے من سراج کو سینے سے لگا کر بین کیا.... لے بھائی مرنا کوئی تیرے سے سیکھے.... پریم میں سیس کٹانا تو کچھ اور ہی مجا دے.... اپنے پیارے کے ہاتھوں مرنا تو ہر ایک کے بس کی بات ناں.... پر تم چاروں کو کیا پتہ.... من سراج کا بین کیا تھا!؟"

منجھلی چاند اوجھل ہوئے پر بھی لڑے تھی کہ تاؤ گلط کہانی سنائے رہا۔ پر میں باہر

نکلی۔ بستی کے گھروں سے نکل کر من سراج کی لاٹ اور بھاگے گئی۔ ساری سیڑھیاں ایک ہی سانس میں چڑھ گئی۔ آخری جھروکے ماں سے ہرن مینارہ نجر آوے سارے کا سارا۔

اس سمے ماں بھیتر سے ایک بین نکلا.... میں اُونچے روئی پہلی بار "او میا تیں نے راہ میں گردن کٹالی۔ بیٹی کی کوئی سدھ نہ لی۔ جو کہیں میں کو پوڑے پکانا ہی سکھا دیتی تو میں بسیرے کے ہاتھوں نہ مرتی.... اپنے کے ہاتھ سے مرنا کتنا مسکل کام ہے.... یہ تیں کوں کیا پتہ ماں...." میں ابھاگن کی چیخ دور راجہ جہانگیر کی سکار گاہ تک سسکارتی گئی۔

دن چڑھے بستی سے اجان کی آواج آئی تو میں لوٹی۔ کھاٹ پر لیٹن لگی تو میں کوں منجھلی نے بتایا تاؤ تو آدھی رات کا میں کو ڈھونڈن نکلا ہووے۔ لو جی اس رات بعد نہ تاؤ ملا نہ اس کی پرانی لالٹین۔ بہت ڈھونڈن نکلے بستی والے پر تاؤ ہم چاروں سنگ نہ پھٹکا۔ گاؤں والے بولیں جس رات منسراج کی لاٹ میں ہرن کی آتما آوے، چیتل مستی میں دُکھ بھری آواج نکالے وے رات کوئی مسافر رستہ بھولے۔ سوچوں تو کبھی کبھی من کا دیا بڑی آندھی میں نہ بجھے.... اور نہ سوچوں تو من سراج کے مُنہ کی آئی ہائے جندگی کی آس بجھا دے.... سوچوں تو تاؤ میری چیخ پہچان کر نکلا ہووے، نہ سوچوں تو لگے تاؤ جمیل کا گھور اندھیرا اسے اوجھل کرے ہم سے.... اس کے من کا چراغ سالوں پرے بجھ گیا تو وہ کیسے گھر ڈھونڈے اپنا۔ لو جی آدمی جب بھی چلے اپنے من کے اُجالے ہی میں تو چلے ناں؟....

نیو ورلڈ آرڈر

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا۔

طاہرہ گیلری میں کھڑی تھی۔ یہاں ان ڈور پلانٹ دیواروں کے ساتھ سجے تھے۔ فرش پر ایرانی قالین کے ٹکڑے تھے۔ دیوار پر آرائشی آئینہ نصب تھا۔ لمحہ بھر کو اس آئینے میں طاہرہ نے جھانک کر دیکھا۔ اپنے بال درست کیے اور کھلے دروازے سے ڈرائنگ روم میں نظر ڈالی۔

ابھی ڈنر شروع نہ ہوا تھا اور مہمان کچھ کھڑے کچھ بیٹھے قسم قسم کا ڈرائی فروٹ اور چپس کھاتے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اخباروں کے رسیا سیاسی پیش بندیاں کر رہے تھے۔ کچھ اہل دل صاحب کرامت بنے معاشرے کے عبرت ناک انجام کی پیش گوئیوں میں مصروف تھے۔ بزعم خود دانشور فلسفیانہ دور اندیشیوں میں محو خود کلامی کے انداز میں ساتھیوں پر رعب گانٹھ رہے تھے۔ بوڑھے، بوڑھیاں ماضی کی یاد میں مگن Nostalgia کا شکار متلائے ہوئے انداز میں موجودہ عبوری دور کے نقائص بیان کرنے میں ساری قوت لگا رہے تھے۔ خوش وقتی کے طالب اٹکل سے کبھی ادھر کبھی ادھر ہونے والی گفتگو میں موج میلہ منانے میں مشغول تھے۔ مہمان باتوں میں ایک دوسرے کو بہلا رہے تھے، رگید رہے تھے، شیشے میں اتار کر ہم خیال بنانے کے شغل میں مصروف تھے۔

طاہرہ اس مجلس دوستاں کے خلا ملا کو چھوڑ کر گیلری میں آگے نکل گئی۔

یہ ڈنر مسرت بھابھی اور سعید بھائی نے اپنی شادی کی سالگرہ منانے کے لیے دے رکھا تھا۔ نہ جانے کیوں طاہرہ ڈرائنگ روم سے آگے دادی اماں کے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ اس نے جمعہ گوٹھ میں رہ کر کئی باتیں سیکھی تھیں۔ اچار گوشت پکانا، ڈوپٹوں کو ٹائی

اینڈ ڈائی کرنا اور گھر میں داخل ہوتے ہی بزرگوں کو سلام کرنے جانا — آخری عادت بیس پچیس سال لاہور رہ کر کمزور پڑ گئی تھی لیکن اس کے سندھی پلاؤ اور اچار گوشت کی ابھی تک دھوم مچی تھی۔

پچھلے چھ ماہ سے اسے احساس جرم کھائے جا رہا تھا۔ وہ جب بھی سعید بھائی کے گھر آتی، کبھی دادی اماں کو ملنے کی تکلیف گوارہ نہ کرتی۔ لیکن اس رات بیڈروم کے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اندر چلی گئی۔

دادی اماں کڑھائی کیا ہوا سفید ڈوپٹہ اوڑھے خالی ذہن صوفے پر بیٹھی تھی۔

"کون ہے — ؟" آدھی سوئی آدھی جاگی، آدھی مری آدھی زندہ دادی نے اپنی گول آنکھیں پھرا کر پوچھا۔

"کون ہے بھئی — ؟"

"میں دادی میں — " اسی "میں" نے پچھلے چھ ماہ سے دادی کا چہرہ بھی نہ دیکھا تھا۔

"بھائی میں کون — ؟" دادی اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پہچاننے کے مرحلے میں تھی۔

"دادی جی — میں — طاہرہ اگرو — مسرت کی دوست"

"وعلیکم سلام، لیکن مسرت کون ہے — ؟" ایک اور سوال دادی نے ہوا میں پھینکا۔

"آپ کی بہو، دادی جی — سعید بھائی آپ کے بیٹے کی بیوی — مسرت"

"اچھا — کون سی بہو — ؟" سوال دادی اماں کا پیچھا سارا دن نہ چھوڑتے۔ ان ہی سوالوں کی مدد سے وہ اپنی گڈ مڈ دنیا میں ایک ربط قائم کرنا چاہتی تھی۔

"چھوڑیں دادی ماں، ایک ہی تو بہو ہے آپ کی — "

دادی ماں شرمندہ سی ہو گئی۔ سر جھٹک کر بولی — "ہاں تو اچھا — بیٹھو — تم طاہرہ ہو نا — میں پہلے ہی پہچان گئی تھی۔"

"جی بالکل — "

دادی اماں ایٹ ایز ہو گئی۔ اس کی عمر سمجھنے کی تھی نہ سمجھانے کی۔ پل بھر پہلے کی

بات بھی اسے یاد نہ رہتی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جوانی کے کچھ واقعات اسے ازبر تھے۔ ان کی تفصیلات کو وہ کبھی نہ بھولتی اور بار بار ان کو دوہرانے پر بھی رتی بھر فرق ان کے بیان میں نہ آتا۔

طاہرہ دل میں شرمندہ سی ہونے لگی — یہ کیسی مصروفیات ہیں جو ہمیں اپنے بنیادی فرائض بھی بھولتے جا رہے ہیں.... یہ کیسے ہوا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے مسرت کے گھر آتی رہی اور دادی ماں کا اسے خیال تک نہ آیا۔

"آپ کو مبارک ہو دادی جان —" طاہرہ نے احساس جرم تلے کہا —

"کیسی مبارک —؟" دادی نے پوچھا۔

اسی وقت مریم ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔

"کون ہے —؟"

"میں دادی ماں — اپنی ورسری کا کیک لائی ہوں —" مریم نے کہا۔

"کیک —؟ وہ کیوں —؟" بھولی بھلائی دادی ماں نے پوچھا۔

"بس جی آپ کیک کھائیں — کیوں کیسے کے بکھیڑے میں نہ پڑیں — بڑا سوفٹ چاکلیٹ کیک ہے دادی، چبانا نہیں پڑے گا —"

مریم نے ٹرے تپائی پر رکھ دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی حکم کے تحت آئی ہے، اپنی خوشی سے کیک نہیں لائی۔ دروازے میں رک کر مریم بولی — "آنٹی طاہرہ پلیز آپ اندر آجائیں — امی آپ کا انتظار کر رہی ہیں —"

مریم دادی کو دیکھے بغیر چلی گئی — تیس برس کی یہ لڑکی بڑی تندرست، پراعتماد اور صاحب رائے تھی۔ وہ اپنی زندگی دو فیز میں بانٹ چکی تھی۔ کچھ عرصہ وہ آئس کریم، کوک، برگر، چائنیز کھانے، ملائی ملی سلادیں، چیز کیک اور مرغن دعوتی کھانے کھاتی۔ اس کی جلد چمکدار، نچلا حصہ گھوڑے کی طرح مضبوط، ہاتھ پاؤں میں لچک اور چال میں کتھک ناچنے والی کی سی پھرتی آجاتی۔ ان دنوں میں وہ مائیکل اینجلو کا ماڈل لگتی۔ صحت کے اشتہار بنے ابھی کچھ ہی دن گزرتے تو اسے انچی ٹیپ اور وزن کرنے والی مشین یاد آجاتی۔ اس کی سہیلیاں، ملنے والیاں بھی جلد ہی یاد دلا دیتیں کہ کمر پر ٹائیر بڑھ رہے ہیں اور وہ ماڈل گرل سے زیادہ مڈل کلاس کی گرہستن نظر آتی ہے۔ اب مریم ڈائٹنگ پر اتر آتی۔ صرف

جوس پر اکتفا کرتی۔ کبھی کسی سلمنگ پارلر سے کھانے کا پرنٹڈ پروگرام خرید لاتی۔ خوب ورزش سے بدن تھکاتی۔ وزن گھٹانے کا ہر Fad استعمال کرتی۔ ایسے ہی جنونی عہد میں اس نے ورزش کے لیے ایک ورزشی سائیکل بھی خرید لی تھی۔ اپنے جسم پر غیر معمولی جور و ستم کرنے کی وجہ سے وہ اینورکسیا کی مریض نظر آتی — آنکھیں اندر دھنس جاتیں، رنگ سنولا جاتا۔ اٹھنے بیٹھنے میں چستی نہ رہتی۔ سر میں درد ٹھہر جاتا اور سب سے بڑی بات ایسے دنوں میں جب وہ ڈائٹنگ کے فیز میں ہوتی تو اسے بہت غصہ آتا۔ وہ سیلولر فون کی ایک کمپنی میں مارکیٹنگ اسسٹنٹ تھی۔ ڈائٹنگ کے دنوں میں اس کا جھگڑا مارکیٹنگ مینجر، باقی سٹاف خاص کر فون آپریٹر اور لفٹ مین سے ضرور ہوتا۔ ان دنوں میں اس کی سیلز بھی کم ہو جاتی اور اسی وجہ سے اس کی کارکردگی کو ہیڈ آفس کے نوٹس میں لایا جاتا۔ ان دنوں میں اسے سب سے زیادہ غصہ اپنی جان پر آتا جو پچھلے دس بارہ سال کی کوشش کے باوجود اس کے لیے ایک معقول رشتہ بھی تلاش کرنے سے معذور رہی تھی۔ ایسے ماں باپ کا کیا فائدہ جو اسے بیٹوں کی طرح پیروں پر کھڑا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن زندگی کے لمبے سفر کے لیے سہارا مہیا نہ کر سکے۔

"یہ کون تھی —؟" دادی نے کیک کو غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"مریم — دادی جی"

"مریم —؟ وہ کون ہے؟"

دادی کی عمر سمجھنے سمجھانے کی نہ تھی۔

"یہ — یہ کیوں چلی گئی فوراً —؟"

"دادی جی — آپ کی پوتی اتنی تندرست و توانا ہے، اتنی انرجی ہے اس میں کہ وہ کسی جگہ زیادہ دیر تک کر بیٹھ نہیں سکتی — اس کا اندر اسے لڑائے پھرتا ہے —"

آج کل مریم تندرستی کے فیز میں تھی!

"جب میں اس کی عمر کی تھی تو اس کا باپ سات برس کا تھا۔ اس کی ماں کو کچھ فکر نہیں۔ بیٹی دھرتی دہلائے پھرتی ہے۔ یا تو کھانے کو کم دے — ہماری اماں ہمیں کبھی انڈہ کھانے کو نہیں دیتی تھیں اور یہ پورا چکن روسٹ کھاتی ہے سالم — کہیں باندھ دے اسے طاہرہ — صبح کار ساتھ لے جاتی ہے، نہ جانے کہاں کہاں پھرتی ہے ماری ماری —"

بھبھول رنگت دادی کے پاس طاہرہ بیٹھ گئی۔ آج اسے اس مرن مٹی پر پیار آ رہا تھا۔ بوڑھی دادی کے ہاتھ کی نسیں انگلیوں سے بھی نمایاں تھیں۔ طاہرہ نے دادی کا ہاتھ پکڑ کر سوچا.... کبھی اس دادی کو دیکھنے کے لیے کسی کی آنکھیں ترستی ہوں گی۔ وہ راستوں میں، کھڑکیوں سے، دروازوں کی آڑ سے، پُر اشتیاق نظروں سے دادی کو گھورتا ہو گا — دادی بھی اپنے گورے چٹے رنگ، درازقد، لمبے بالوں پر نازاں ہو گی۔ بناؤ سنگھار کی چیزوں سے دادی نے بھی ٹوٹ کر پیار کیا ہو گا۔ کپڑے لتے پر جان دی ہو گی۔ دادی کو دیکھ کر یہ سوچنا مشکل تھا کہ اس چرُ مرُ، پانسہ پلٹی، بلا بدتر، بساندھی سی چیز پر کبھی کسی نے جان بھی وار دینے کو معمولی بات سمجھا ہو گا — دادی بھی دلہن بنی ہو گی۔ اس کے ہاتھوں پر بھی مہندی کے گل بوٹے ابھرے ہوں گے۔ اس نے بھی شرمالجا کر کسی کو اپنی محبت کا تعویذ بنایا ہو گا.... حسن — عشق — غیرت — شہرت نہ جانے کیا کیا وقت کی لہروں پر بہہ گیا۔ جس محبت کا چرچا بکھیڑا، اشانتی جوانی ہڑپ کر جاتی ہے وہ محبت بڑھاپے میں کہاں جاتی ہے؟ — دادی کو تاکنے جھانکنے والے جو آج اسے دیکھ لیں تو اس کا کیا آگت سواگت کریں؟ — کیا محبت اس درجہ جسم کی مرہون منت ہے؟ — وہ بھی نوجوان جسم بلکہ نوجوان خوب صورت جسم کی!

انسان کی ساری خوبیاں بڑھاپے میں کہاں جاتی ہیں — کہاں اور کیوں — ؟

"تم ہی ذرا میری بہو بیٹے کو سمجھاؤ.... بیٹی بھی مشین کی طرح ہے، بہت جلد پرانی ہو جاتی ہے — ابھی تو مریم پر آنکھ ٹکتی ہے، پھر پھسلے گی — سن طاہرہ! تیرا ملنا ملانا بہت ہے — تیرا میاں وہ —" وہ پھر گم ہو گئیں۔

"ڈاکٹر ہے جی —"

"لو میں کوئی بھولی ہوں فضل کو — میرا بلڈ پریشر چیک کرنے آتا ہے۔ بہت لوگ آتے ہیں اس کی کلینک پر.... کوئی بر تلاش کرو تم دونوں مریم کے لیے — میری بہو تو اُوت ہے اُوت —"

شادی بیاہ کی بات ہو یا سسرالی رشتے داروں کی غیبت — دادی ماں کی سوچ فوراً سیدھی ہو جاتی۔ پھر نہ کوئی تفصیل بھولتی نہ یادداشت اڑنگے لگاتی۔ اچانک دادی اماں نے کچھ اس ڈھب سے فلسفیانہ انداز میں مربوط گفتگو کی کہ طاہرہ بھی بیاہنے جوگ مریم کے

فکر میں گھلنے لگی۔

گولڈن اینی ورسری کا فنکشن رات ساڑھے بارہ بجے ختم ہوا۔ اس کے بعد بھی چند مہمان سیاسی صورت حال کو باہم ڈسکس کرتے رہے۔ عورتوں میں غیبت کا سیشن شروع ہوا۔ بڑی باریک بینی کے ساتھ اپنی ہی جنس کو باہم تکا بوٹی کرتے ہوئے وہ بہت خوشی محسوس کر رہی تھیں — کسی مرد پر کوئی عورت حرف نہ دھر رہی تھی۔ آخر مہمانوں کو وداع کرنے جب سعید بھائی اور مسرت باہر کاروں تک آئے اور آخری جوڑا طاہرہ اور ڈاکٹر فضل اگرو کا رہ گیا تو طاہرہ نے موقع غنیمت جان کر پوچھا — "مسرت! بھلا مریم کی کیا عمر ہے — ؟"

مسرت نے کان کھجلا کر کہا — "اس جون میں تیس کی ہو جائے گی —"

ڈاکٹر فضل اگرو ابھی ڈرائیور سیٹ پر بیٹھے تھے۔ گاڑی بند کر کے باہر آ گئے۔ اب یہ چاروں گاڑی کے ارد گرد کھڑے مریم بوٹی پھڑکنی کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

"بھئی کچھ بیٹی کے متعلق بھی سوچو کہ یہ اپنی اینی ورسریاں ہی منانے میں مگن رہو گے —" ڈاکٹر فضل اگرو نے کچھ مذاق کچھ سنجیدگی سے کہا۔

سعید بھائی کھسیانی ہنسی ہنس کر بولے — "لو ہم نہیں سوچتے بھلا۔ ہم نے تو اتنا سوچا، اتنا سوچا کہ اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ مرد کی طرح کماتی ہے، کسی کی محتاج نہیں — سوچ رہی ہے باہر جا کر پی ایچ ڈی کر آئے —"

"اور شادی — سعید بھائی، وہ کون کرے گا — ؟" طاہرہ نے سوال کیا۔

"تم تو الٹا ہمیں چور سا بنا رہی ہو طاہرہ — اس کو تو کوئی پسند ہی نہیں آتا — اوپر سے نوکری کر لی ہے، ہنسنے بولنے کو وہاں ہم عمر مل جاتے ہیں جوب پر — اگر بن گائے پالے دودھ ملے تو یہ بتاؤ گائے کیوں پالے مریم، کس لیے؟ — کسی قسم کی Dependency تو رہی نہیں مرد پر، پھر شادی کیوں کرے؟ مرد عورت کا رابطہ ہو، ماں بچے کا رشتہ ہو، دوستی ہو — بھائی جہاں کسی کی محتاج ہی نہ ہو، وہاں جھنجھٹ ہی کیوں مول لے کوئی؟ —" مسرت بولے گئی۔ یوں لگتا تھا وہ اندر ہی اندر اپنی کوششوں سے تھک چکی تھی۔

"اچھا بھائی آپ لوگ مجھے بتائیں کیسا لڑکا پسند کرے گی ہماری مریم — ؟"

"ایک تو وہ کہتی ہے کہ لڑکا دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہو۔ امریکن ایکٹر جیسا نہ سہی پر لوگ باگ اس کے قد، رنگ، شکل پر پھبتیاں نہ کسیں۔"

"سنا تو یہی ہے کہ مرد کی شکل نہیں، اس کی کمائی دیکھی جاتی ہے لیکن خیر — اکیسویں صدی کا ورلڈ آرڈر یہی ہو گا — اور؟ —"

اب سعید بھائی کھنگارے اور دبی آواز میں بولے — "دوسرا بھئی کھاتا پیتا ہو۔ شادی کے بعد وہ سارے سکھ مریم کو مل سکیں جو اس کے بوڑھے ماں باپ نے دے رکھے ہیں۔ وہ کسی کنگلے کے ساتھ زندگی کی جدوجہد میں شامل ہونا نہیں چاہتی۔ وہ جن کمفرٹس کی عادی ہے، وہ اسے ملنی چاہئیں۔"

"رائٹ —" طاہرہ نے سمجھنے کے انداز میں کہا — "میں سمجھ گئی۔ لڑکا سیلف میڈ نہ ہو، یہی مطلب ہے نا — نہ سیلف میڈ ہونے کے خواب دیکھے — بنا بنایا ہو۔"

"سمجھو نا طاہرہ — ٹھیک کہتی ہے مریم — بھلا تیس چالیس برس مریم نے مرد کو بنانے میں گزارے تو اس نے کیا انجوائے کیا —" محبت سے ڈاکٹر فضل اگرو نے کہا۔

طاہرہ نے تعجب سے ڈاکٹر صاحب پر نظر ڈالی۔ جب ڈاکٹر صاحب سے اس کی شادی ہوئی تھی تب فضل اگرو معمولی ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ وہ کیمبل پور کے ڈپٹی کمشنر کی بیٹی تھی، پر ماں نے بڑی محبت سے سمجھایا تھا کہ ڈاکٹر دین کا پابند اور شرافت کا پاسدار ہے.... رزق کا اللہ مالک ہے، وہ ہر جگہ بہم پہنچائے گا۔ پہلی پوسٹنگ کوٹری جنکشن سے آگے جمعہ گوٹ میں ہوئی۔ یہاں کوئی سوشل لائف تھی نہ جگمگاتے بازار گلیاں۔ طاہرہ کو ڈاکٹر فضل اگرو کے ساتھ وقت گزارنے کا کنواں بھرپانی میسر آیا جس میں ڈول ڈال ڈال کر وہ اپنی تنہائیاں سیراب کرتی رہی۔ سندھی ڈاکٹر نفیس آدمی تھے۔ لطیف بھٹائی کے سچے عاشق، بابا بلھے شاہ کے شیدائی — نہ تو انہوں نے طاہرہ کی زندگی میں زہر گھولا، نہ ہی طاہرہ نے کبھی کیمبل پور کی زندگی کو یاد کر کے آنسو بہائے۔ اتنی فراغت، تنہائی، غریبی کے ہوتے ہوئے وہ ساتھ رہنے کو زندگی کی سب سے بڑی عیاشی سمجھتے رہے۔ شاید طاہرہ پرانے خیالات کی تھی یا ممکن ہے فضل اگرو کے ساتھ وقت ہی ایسے گزرا کہ وہ سمجھنے لگی ساتھی کو کھلا کپڑا ہونا چاہیے — اس کی کتر بیونت — سجاوٹ، ناپ سب کچھ اپنے دوسرے ساتھی پر چھوڑنا چاہیے۔

"اچھا جی اور کچھ؟ —" تھوڑی سی ہار کر طاہرہ بولی۔

"ہاں بھئی ہاں — یاد آیا۔ اس کا Exposure ضرور ہو۔ کنویں کا مینڈک نہ ہو، اپنے ہی گن گانے والا — بلکہ اگر ہو سکے تو انٹرنیشنل لیول کا Exposure ہو۔ بھلا ایسے آدمی کا بھی کیا فائدہ جو کراس کلچر نہ جانتا ہو۔ چھوٹی کھوپڑی والے سے کیا لینا —!" سعید بھائی بولے۔

طاہرہ نے کہنا چاہا کہ زیادہ Exposure بھی کبھی کبھی خطرناک ہو سکتا ہے لیکن طاہرہ کو علم تھا کہ سعید بھائی بڑے باتونی تھے۔ ان کے پاس ڈسکوری، اکونومسٹ، نیوز ویک، ٹائم، ایشیا ویک، جیوگرافیکل میگزین اور ایسے ہی کئی رسالے مروجہ علوم اور انفارمیشن سے بھرے آتے تھے۔ وہ کئی ملکوں کی سیاحت بھی حکومتی خرچ پر کر چکے تھے۔ ایک وقت تھا جب وہ پرائم منسٹر کی تقریریں بھی لکھتے تھے اور سیاسی حالات پر ان کی بصیرت ثقہ بند تھی — لیکن یہ سارا لکھنا پڑھنا، انفارمیشن سے پُر دماغ وہ اس لیے تروتازہ رکھتے کہ انہیں بولنے کا شوق تھا۔ وہ پینٹاگن سے لے کر سی آئی اے تک اور کلوننگ سے لے کر پانچ ہزار سال پرانے مردے پر ریسرچ تک گفتگو کر کے محفل کو ہراساں اور حیرت زدہ کرنے کا فن جانتے تھے۔

مریم بھی سعید بھائی کی طرح بڑی پڑھاکو تھی۔ اس کے پڑھنے لکھنے کے پیچھے بھی یہی تحریک تھی۔ وہ بھی ہم چشموں کو اپنی انفارمیشن سے دنگ کرنا چاہتی تھی۔ مردم بیزار مریم لوگوں کو پسند کرنے میں خاصی دقت محسوس کرتی۔ کوئی لڑکی اس کے معیار پر پوری نہ اترتی.... کیوں کہ لڑکیاں عام طور پر فیشن، بازار، بیوٹی پارلر، گھر کی آرائش، چغلی غیبت سے آگے گفتگو روانی سے چلانا نہ جانتی تھیں۔ اردو میڈیم کی پڑھی ہوئی لڑکیاں خاص طور پر اس کے پیمانے پر پوری نہ اترتیں۔ خراب انگریزی لب ولہجے رکھنے والیاں اسے جھلاہٹ میں مبتلا کر دیتیں۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ایک پرانی سہیلی سے مریم بازار میں ملی۔ اس وقت مریم بڑے سٹائل سے ملک شیک پی رہی تھی۔

ایک سیاہ کار زناٹے سے گزری۔ پھر کچھ آگے بڑھ کر سکرچیں مارتی کار رکی اور پوری سپیڈ سے Reverse میں لوٹی۔ مریم تھوڑا سا گھبرا گئی۔ اخباروں میں دہشت گردی

کے واقعات پڑھتے پڑھتے اس کا دھیان اب خیر کی طرف کم ہی منعطف ہوتا تھا۔ کار اس سے تھوڑی ہی دور جا کر رکی۔ ایک نوجوان عورت اس میں سے برآمد ہوئی — سیاہ لباس، سیاہ چشمہ، سیاہ سوئٹر، چہرہ بلیچ شدہ، بالوں میں Streaks، چہرے پر میک اپ ماسک کی طرح چپڑا ہوا — مریم کی سہیلی کسی بیوٹی کلینک کا ماڈل نظر آ رہی تھی۔

آصفہ نے بھاگ کر ملک شیک پیتی مریم کو جپھی میں لے لیا۔ پھر اسے گھما پھرا کر دیکھا۔ محبت سے دایاں گال چوما اور بڑے جذبے سے انگریزی میں بولی — "بھائی مریم کہاں ہوتی ہو تم — میں نے تو کئی دوستوں سے پوچھا، کسی کے پاس سے نہ تمہارا فون نمبر ملا نہ ایڈریس۔ اولڈ گرلز کے فنکشن میں بھی تم نہیں آئیں۔ کمال ہے — تم تو مکمل طور پر بلیک آؤٹ ہو گئیں سنگدل!"

"میں تو یہیں تھی لاہور میں — میرا تو مستقل ایڈریس بھی وہی ہے جو کالج میں تھا۔"

آصفہ نے ابرو اٹھا کر تعجب سے کہا — "یہ کالج والے بھی عجیب آدمی ہیں۔ ایک اولڈ سٹوڈنٹ کا پتہ نہیں کر سکے۔"

پھر آصفہ نے کار میں اچھل کود کرتے اپنے بچوں کو ڈانٹ پلائی — "دو منٹ تم لوگ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔ کیا قیامت آ گئی، چپ چاپ بیٹھو ورنہ پٹائی ہو گی —" بچوں پر برس کر وہ تازہ مسکراہٹ لیے مریم کی طرف متوجہ ہوئی — "یار اس کارٹون چینل نے تو بچوں کی سائیکالوجی ہی بدل دی ہے — لیونارڈو آرام سے بیٹھو — ماما آ رہی ہے —"

پتہ نہیں بچے تین تھے کہ چار لیکن سارے ہی تھوڑی دیر کے لیے دبک گئے۔

"تمہارے کتنے بچے ہیں مریم —؟" آصفہ کی جانب سے سوال آیا۔ جب بھی یہ سوال مریم سے پوچھا جاتا، وہ عجیب طرح کی خفت محسوس کرتی گویا وہ جسمانی طور پر کسی قسم کی نااہلیت میں مبتلا تھی۔

چند لمحے توقف کے بعد مریم بولی — "میرے بچے —؟ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی —"

"تت تت تت — بھئی جلدی کرو، زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ یہ سب بے حیا مرد لوگ

بھی نوجوان بلونگڑیاں پسند کرتے ہیں — تم سوچ کیا رہی ہو آخر —؟"

مریم کچھ ہل سی گئی — "سوچ کچھ نہیں رہی، میرے مطلب کا آدمی ابھی ملا نہیں — ایویں کیویں کے ساتھ زندگی خراب ہو گی —"

آصفہ نے چلّا کر اپنی اچھلتی کودتی فوج کو دبکا مارا — "نو ٹنڈو بہت مار پڑے گی گھر چل کر، آرام سے بیٹھو سب —" پھر وہ مریم کو تنقید بھری نظروں سے دیکھ کر بولی — "ہم دونوں کی سالگرہ ایک ہی دن آیا کرتی تھی۔ یاد ہے نا کیفے ٹیریا میں سالگرہ منایا کرتے تھے — تھرٹی کی تو ہو گئیں ہم دونوں اب — سوچ کیا رہی ہو مس پڑھاکو —"

"سیلولر فون کی ایک کمپنی میں کام کرتی ہوں۔ مجھے اچھی تنخواہ ملتی ہے —"

جھینپ کر مریم نے اپنی وجہ عزت بیان کی۔

آصفہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ پھر ٹاپک بدل دیا۔ تھوڑی دیر وہ پرانی سہیلیوں، کالج کی پروفیسروں، سیاسی حالات کی باتیں کرتی رہیں۔ اتنی دیر میں بچوں نے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ بس میں شادی کی چنگاری ڈال کر اللہ حافظ کہتی ملین ڈالر کی مسکراہٹ بکھیرتی آصفہ اپنے سپرمین، مائیکل اینجلو، نو ٹنڈو، بیٹ مین لے کر رخصت ہو گئی۔

بہت سارے وعدوں کے باوصف دونوں پھر ایک دوسرے کو مل نہ پائیں۔ موجودہ عہد کی زندگی نے جہاں اور بہت ساری چیزوں کو ختم کر دیا تھا، وہاں یہ ذاتی فراغت کی موت کا باعث بھی ہوئی تھی۔ کھاتے پیتے گھرانوں میں بنک، مارکیٹ، سوشل فنکشن، فیشن، سیاحت کے لیے تو وقت تھا لیکن کتاب پڑھنے، میل جول کے لیے وقت نہ چھوڑا تھا۔ بچے، بوڑھے بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔ مصروفیت ہی اس قدر تھی کہ معاشرے کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور وہ بدل بدلا کر رہ گیا۔ آصفہ سے ملاقات کے بعد مریم سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ کہیں اب واقعی دیر نہ ہو گئی ہو۔ آصفہ کے بچے دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

اب تک جتنے امیدوار وہ مسترد کر چکی تھی، سب کو سنی سنائی پر Reject کیا تھا۔ کبھی کسی سے ملاقات نہ کی تھی۔ اس قدر ضرور ہوا کہ مریم بر دکھوے کی رسم پر مان گئی اور پہلی بار مسرت نے سکھ کا سانس لیا کہ کم از کم مریم نے اتنی حامی تو بھری کہ ٹرولی دھکیلتی اندر ڈرائنگ روم میں آ جائے گی۔ ساری عمر تو وہ اسے چیپ حرکت سمجھتی رہی۔

اب خود بردکھوے میں شامل ہو کر جواب دے گی۔ فوراً مسرت نے فون ملایا اور حلیہ نویس طاہرہ سے تفصیل کے ساتھ مریم کی پسند اور ناپسند کی اطلاع دی۔

ڈاکٹر فضل اگرو بھی اب تک مریم کے معاملات کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ مریضوں کو اب وہ ایک اور نظر سے دیکھتے پرکھتے اور پھر گھر پر طاہرہ کو انفارم کرتے۔ یہ دونوں بڑے دو اور دو چار قسم کے پریکٹیکل لوگ تھے لیکن ذرا سے چھوٹے واقعے نے انھیں گویا مریم کے گاڈ فادر اور گاڈ مدر بنا دیا۔

ان ہی دنوں ایک شائستہ سے بزرگ طاہرہ سے کلینک پر ملے۔ یونس صاحب دس سال ہوئے سول سروس سے ریٹائر ہو کر کئی بیماریوں کی سنگت میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ باریش، سرخ و سفید، دراز قد پیر مرد ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر آتے۔ تمام مریض بھگت جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرتے۔ انہیں بلڈ پریشر اور شوگر کی تکلیف تو تھی ہی لیکن اس کے علاوہ جوڑوں کا درد، گلے کی شکایت، قبض، اسہال، نیند کی کمی، نیند کی زیادتی، گیس ایسی کئی علتیں بھی ساتھ تھیں جن کی وجہ سے عام طور پر انہیں ڈاکٹر فضل اگرو کے پاس آنا پڑتا۔

"یہ میری بیوی ہے سر طاہرہ —"

"سلام علیکم سلام علیکم" یونس صاحب بولے۔

"آپ تو غالباً سب سے بعد میں دکھائیں گے؟" ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا۔

"جی جی —" بوڑھا یونس کلینک کو غالباً کلب کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا۔

"تو آپ اور طاہرہ وہاں صوفے پر بیٹھیں، میں کافی بھجواتا ہوں —"

طاہرہ اور یونس صاحب لمبے صوفے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جلد ہی طاہرہ کو احساس ہوا کہ یونس صاحب کی زبان بات کرنے کو ترسی ہوئی ہے۔

"میں یہاں قریب ہی رہتا ہوں۔ وائف پچھلے سال فوت ہو گئیں۔ اب شدید تنہائی ہے — بارہ کینال کی کوٹھی — غسل خانے ریلوے سٹیشن کے غسل خانوں سے مشابہہ ہیں۔ کسی کا شاور چلتا ہے تو رکتا نہیں — ڈبلیو سی ایسے رستے ہیں کہ ٹائلز میں اورنج رنگ کا زنگ لگ گیا ہے۔ — ٹائلیں چکٹ — پردے گرا چاہتے ہیں — قالینوں پر چلو تو مٹی دھب دھب اٹھتی ہے۔ جب گھر والی نہ رہے تو گھر کہاں رہتا ہے۔"

"بچے وچے — یعنی کوئی بہو وغیرہ —؟" کافی کا چھوٹا سا گھونٹ پی کر طاہرہ نے سوال کیا، لیکن بن سنے یونس صاحب بولتے چلے گئے — "دو مالی رکھے ہیں۔ آپ کسی دن ڈاکٹر صاحب کو لے کر آئیں۔ سارا گھر جھاڑ جھنکار بن چکا ہے۔ ہمارے ابا شکاری تھے۔ گیلری، ڈرائنگ روم، کھانے کے کمرے میں حنوط شدہ شیر، چیتے، ہڑیال ٹنگے ہیں۔ کہیں دیواروں پر، کہیں سیڑھیوں پر... یوں لگتا ہے ہم جانوروں کے میوزیم میں آ گئے ہیں —"

"تو آپ انہیں اٹھوا کر کسی علیحدہ کمرے میں رکھوا دیجئے —"

جھریوں بھرے بڈھے نے سفید ہاتھوں کو مل کر جواب دیا — "اب ہم ٹھہرے پرانے آدمی۔ اتنی آسانی سے ماضی کے ساتھ رشتے بھی نہیں توڑ سکتے۔ جہاں ابا ان جانوروں کو لٹکا گئے ہیں، وہیں بھلا لگتا ہے — اگر اٹھوا دیے تو ہم ہی بے وفائی کریں گے ابا کے ساتھ —"

"کوئی بیٹی — بہو —؟" طاہرہ نے پھر پوچھا۔

لیکن وہ اپنی روانی میں بولتے گئے — "رات کے وقت باہر نکلیں کمرے سے تو لگتا ہے جانور زندہ ہو گئے ہیں۔ کوٹھی کے خالی کمروں میں بھاگے پھرتے ہیں حنوط شدہ۔"

"لیکن — آپ کسی کو ساتھ رکھیے نا — یہ تو بری بات ہے۔" اب طاہرہ، یونس صاحب پر بھی ویسا ہی ترس کھانے لگی جیسا اسے مریم پر آتا تھا۔

"میں نے شکاگو خط لکھ دیا ہے اپنے بیٹے کو — وہ ڈاکٹر ہے وہاں — اکلوتا ہے بڑا سعادت مند — سب کام وام چھوڑ کر آ رہا ہے۔ اس کے آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا —"

طاہرہ کو اس بوڑھے کی رجائیت پر ترس آ گیا — اگر ڈاکٹر واپس بھی آ جائے تو اس بات کی کیا گارنٹی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

آواز گرا کر یونس صاحب بولے — "کسی کسی رات کو لگتا ہے کہ جانوروں میں جان پڑ گئی ہے اور وہ خالی کمروں میں دندناتے پھرتے ہیں — اچانک ریچھ کی ڈفلی بجنے لگتی ہے — شیر گرجتا ہے — چیتوں کی چاپ سنائی دیتی ہے — عجیب قسم کا خوف آتا ہے —"

طاہرہ کو یونس صاحب کی حالت پر رحم آنے لگا!

کافی کی پیالی تپائی پر رکھ کر یونس صاحب آہستہ سے بولے — ''میرا خیال ہے کہ بیٹی کے پاس کراچی چلا جاؤں، وہ بڑے اصرار سے بلاتی ہے — لیکن گھر جوائی کی کیا عزت ہوتی ہے بھلا گھر سسرے کس باغ کی مولی —''

پیر مرد نے اپنے اوپر ہنسنا چاہا لیکن اس کا منہ لٹک سا گیا۔ یونس صاحب کو کسی سے بات کیے ایک مدت ہو چکی تھی اسی لیے وہ سرپٹ زبان سے اپنی تنہائیوں کی داستان بغیر کوما، فل سٹاپ کے سنانا چاہتے تھے۔

''کیا آپ کا بیٹا یہاں ایڈجسٹ ہو جائے گا —؟''

یونس صاحب نے مسکرا کر کہا — ''پہلے مشکل یہ تھی کہ وہ شادی پر رضامند نہیں تھا۔ اب مان گیا ہے۔ اس کی بیوی اسے اپنے وطن میں ایڈجسٹ کرائے گی —''

طاہرہ کے دل کی گھنٹی بجی — پالیا — پالیا — اس نے اندر ہی اندر ارشمیدس کی طرح نعرہ لگایا — شکاگو کا ڈاکٹر — ہڈیوں کے علاج کا ماہر — بارہ کینال کی کوٹھی — نہ کوئی ساس نہ نندیں — اکیلا ایک سسر، وہ بھی چند روزہ — آزادی ہی آزادی — راج ہی راج — تمہاری تو گرینڈ پرکس لاٹری نکل آئی مریم۔

ڈاکٹر معظم کے آنے سے پہلے طاہرہ اور مسرت کی لمبی ملاقاتیں اور فون پر اور بھی لمبی باتیں ہوئیں — سعید بھائی اور ڈاکٹر فضل اگرو بھی پہلے کی نسبت ایک دوسرے سے زیادہ گرم جوشی سے ملنے لگے۔ وہ سب ایک طرح کے یوفوریا میں مبتلا تھے حتیٰ کہ دادی ماں بھی اپنی سہاگ رات، شادی کا جوڑا، سسرالی رشتے داروں کو بار بار زیادہ یاد کر رہی تھیں۔ ویسے تو لگتا تھا کہ الزئمر کی مریضہ تھیں اور پل بھر پہلے کی بات یاد نہیں رکھ سکتیں لیکن ان دنوں وہ پرانے ڈھولک گیت سنا کر سب کو حیران کر دیتیں۔

شام ڈھل رہی تھی جب ڈاکٹر معظم اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ تھامے اندر آیا اور سعید بھائی کے پاس خاموشی سے بیٹھ گیا۔ دراز قد، پراعتماد، گورا چٹا، وجیہہ، دھیمی آواز میں بولنے والا شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب مریم ٹرولی دھکیلتی اندر آئی تو اس نے بھرپور نگاہوں سے ڈاکٹر معظم کو دیکھا لیکن ڈاکٹر نے لمحہ بھر کو بھی نگاہیں اٹھا کر مریم کی جانب نہ دیکھا۔ ڈاکٹر فضل اگرو سے وہ بڑے تحمل کے ساتھ کسی مریض کی کیس

ہسٹری ڈسکس کرتا رہا۔ مریم کو اگر ڈاکٹر نے دیکھ لیا تھا تو وہ محض اتفاقاً تھا۔ گھر لوٹنے سے پہلے یونس صاحب نے طاہرہ کو اپنی رضامندی سے بھی مطلع کر دیا۔

رات گئے سعید بھائی کا فون آیا۔ نیم سوئی نیم جاگی طاہرہ اس کال کے لیے تیار نہ تھی۔ پہلے اسے خیال آیا کہ کوئی رانگ نمبر رنگ ہے۔ سعید بھائی کی آواز سن کر اس نے اندازہ لگایا کہ غالباً وہ لڑکے والوں کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری جانب سے سعید بھائی کی آواز آئی — ''ہم لوگ بڑے شرمندہ ہیں طاہرہ بہن — بلکہ مسرت تو مارے شرم کے فون بھی نہیں کر پائیں — ہمیں افسوس ہے کہ — ہم یہ شادی نہیں کر پائیں گے —''

''لیکن کیوں سعید بھائی — آخر وجہ؟''

سعید بھائی کی آواز آئی — ''دیکھیے ڈاکٹر معظم کا بھی کوئی خاص قصور نہیں ہے۔ ملک سے باہر جا کر کچھ لوگوں پر ردّعمل ہو جاتا ہے۔ اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے وہ زیادہ مذہب پرست ہو جاتے ہیں۔ اپنی پہچان قائم رکھنے کو وہ ضرورت سے زیادہ Rigid ہو جاتے ہیں۔ لیجیے جو شخص امریکہ میں رہ کر زکوٰۃ دیتا ہے — بنک کا سود نہیں لیتا — عورتوں سے آشنائی نہیں رکھتا — وہ تو پکا فنڈامنٹلسٹ ہوا ناں —''

طاہرہ ذرا سی چڑ گئی — ''کمال ہے سعید بھائی۔ غیر مسلم جو مرضی کہیں، آپ تو ڈاکٹر معظم کو کچھ نہ کہیں جی — اس کی تو دنیا بھی سنور گئی اور آخرت بھی —''

سعید بھائی کی آواز میں کچھ کھردراپن آگیا — ''اب اس جوانی میں داڑھی رکھے بیٹھا ہے تو بیوی کو بھی تو حجاب پہنائے گا نا — ہم اس سے کیا امید رکھ سکتے ہیں۔''

طاہرہ کو دھچکا لگا — ''اس قدر خوب صورت، باپ پرست — شائستہ آدمی پھر کب ملے گا؟''

''بات یہ ہے طاہرہ بہن — سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہمیں معظم پسند بھی آیا ہے لیکن اس نے ساری شام نظریں نیچی رکھیں۔ مریم کی جانب غور سے دیکھا تک نہیں۔ اب جو خود شرع کا اس حد تک پابند ہو، وہ بیوی سے بہت زیادہ توقعات رکھے گا۔ ہم نے مریم کو اتنی تعلیم اس لیے تو نہیں دلوائی کہ وہ اکیسویں صدی میں اپنی نانی دادی کی زندگی گزارے۔''

"آپ کی ساری باتیں مجھے بڑی فروعی لگ رہی ہیں سعید بھائی — میں واقعی آپ کی بات سمجھی نہیں —"

تھوڑی دیر فون پر خاموشی رہی، پھر سعید کھنگار کر بولے — "طاہرہ ہمارا یہ خیال ہے یعنی مسرت، مریم اور میرا — کہ مذہب کے پیروکار عام طور پر بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اول تو رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شخصی آزادی قدم قدم پر مجروح ہوتی ہے۔ پھر میرا خیال ہے کہ جو شخص مذہب کے فریم ورک میں رہتا ہے، وہ نہ تو اچھا انسان ہوتا ہے نہ شوہر — ہم ڈاکٹر معظم کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتے۔ آپ مہربانی فرما کر انہیں طریقے سے انکار کر دیں۔ بس ان کی دل آزاری بھی نہ ہو — اور انکار بھی ہو جائے — اس کے ابا کو میں خود سمجھا لوں گا — میرے نزدیک دل آزاری سب سے بڑا گناہ ہے۔ ڈاکٹر معظم جیسے لوگ نہ تو خود آزاد ہوتے ہیں، نہ کسی اور کو آزادی دے سکتے ہیں۔ یہ خواہشات کو پورا کرنے کے بجائے انہیں دبانے کے درپے رہتے ہیں۔ ہم اپنی بیٹی کی شادی اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خوش رہے۔ گرفتار مذہب کا ساتھی بنا کر اسے آزمائشوں میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ انسان اپنی خواہشیں بھی پوری نہ کرے تو وہ یہاں آیا کیوں ہے —؟"

دوسری طرف فون بند ہو گیا۔

صبح تک طاہرہ کروٹیں بدل کر سوچتی رہی کہ یونس صاحب کو کیا کہہ کر انکار کرے — وہ بیچارے تو مریم کو دیکھ کر سمجھنے لگے تھے کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا نیو ورلڈ آرڈر میں مذہب کی گنجائش نہ تھی —؟ کیا ایسے لوگ جو مذہب سے وابستہ تھے، آگے نہ بڑھ سکتے تھے —؟ کیا نیو ورلڈ آرڈر صرف ہیومن رائٹس کی لاٹھی ٹیک کر چلنا چاہتا تھا؟

تنگیٔ دل

جی بالکل، بات رشتوں کے ٹوٹنے ہی کی ہو رہی تھی — سامنے کاغذ رکھے اور ہاتھ میں قلم تھامے سوچتا ہوں تو عجب گڑبڑ ہے — پہلے میرا خیال تھا کہ لوگ مجھ سے نبھا نہیں کر سکتے۔ وہ اس قدر نیک نیت ہی نہیں ہوتے کہ میرے خلوص کو سمجھ پائیں۔ ان میں خود غرضی، طمع اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ وہ یا تو وقت کٹی کے لیے مجھ سے نتھی رہتے ہیں یا پھر اپنی غرض پوری ہونے کی حد تک — یہ غرض جذباتی، مالی، تفریحی کچھ بھی ہو لیکن جونہی مطلب پورا ہوا میرے دوست احباب، رشتے دار، ملاقاتی سب غائب۔ پھر نئے سرے سے پرانے وقتوں کو آواز دیتے رہیے، کچھ اثر نہیں ہوتا۔

ابھی جب میں ہمایوں کو اپنے ارادے سے مطلع کرنے کے لیے خط لکھنے بیٹھا تو یکدم مجھ پر ایک بڑی حقیقت کھلی.... اپنے اوپر سے پردہ اٹھا۔ آج تک جو کچھ نظر نہ آیا تھا، دکھائی دیا۔

رشتے اور شیشے میں ایک خوبی سانجھی ہے کہ یہ اندر ہی اندر اپنے ہی تناؤ، اپنے ہی بوجھ، اپنی ہی سردی یا گرمی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی زیادہ بوجھ سے بھی ٹوٹنے کا سانحہ ہوتا ہے۔ چلیے اگر بوجھ نہ بھی پڑے تو بھی ان دونوں کے نصیب میں ہی تریڑ کا آنا، کانچ کا بکھرنا اور بیٹھے بٹھائے یکدم کرچی کرچی ہونا لکھا ہے۔ جونہی میں نے لکھا کہ "پیارے ہمایوں نظر آتا ہے کہ ہم دونوں اب دوست نہ رہ سکیں گے" تو مجھ پر یہ بات بھی کھلی کہ یہ جملہ ہمایوں تو لکھ نہیں رہا، ظاہر ہے وہ بری الذمہ ٹھہرا — یہ تو میری ڈیمانڈ، میری جانب کا فیصلہ ہے کہ اب ہم دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ قائم رہ نہیں سکتا۔

ساری عمر میں خود ترسی کا شکار رہا تو میں نے اپنا یہ جذبہ ضائع کیا۔ میں رشتے توڑتا

اور ان کا الزام دوسروں کے سر دھرتا رہا ہوں۔ میں بے وفا بھی تھا اور ڈھونسیا بھی۔ ایک وقت، ایک سمت، ایک حد تک تو میں ہم سفر رہ سکتا تھا۔ پھر وہاں پہنچ کر مجھ سے محبت، وفا، دوستی کی گٹھڑی اٹھائی نہیں جاتی تھی....

آپ کو میں نے اماں کی بات تو شاید پہلے بھی بتائی ہے۔ میں ایک عرصہ سے دوبئی میں تھا اور اماں میری عدم موجودگی میں میرے بڑے بھائی کے پاس رہتی تھیں۔ بھلا وہ اور کہاں رہتیں؟ دو ایک بار وہ دوبئی میرے پاس آئیں لیکن ان کا قیام لمبا نہ تھا۔ میرے بڑے بھائی رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرتے تھے لیکن زمین، مکانات بیچنے کا فن انہیں اچھی طرح سے نہ آیا۔ لوگوں نے اسی پیشے میں جائیدادیں بنالیں لیکن بھائی قدیر کی وہی دو منزلہ حویلی ملتان روڈ پر رہی — درمیانے طبقے کا رہن سہن، اردو میڈیم سکول میں بچوں کی تعلیم اور چادر اوڑھنے والی، رشتوں میں الجھی ہوئی بیوی۔ بڑے سال پہلے جب میں دوبئی سے پاکستان آیا تو مجھے اماں کچھ بدلی بدلی سی نظر آئیں —

مجھے ان کے رویے میں گرم جوشی، محبت، اظہار کی کمی نظر آئی۔ اباجی کے انتقال کے بعد یہ میرا دوسرا پھیرا تھا۔ مجھے سارے گھر والے جوں کے توں نظر آئے فقط اماں کو دیکھ کر مجھے شائبہ گزرا کہ کہیں اندر ہی اندر وہ اب قدیر بھائی کی ماں رہ گئی ہیں۔ یہ بات میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ شام کا وقت تھا۔ اماں چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے مڈل کلاسیے دو پوتے ابراہیم اور افشار ان کے پاس کچھ اس طور سے زیر زبر بیٹھے تھے کہ مجھے الجھن سی ہوئی۔

"جاؤ بھئی کھیلو، تم دونوں کیا اماں کو حوالات میں بند رکھتے ہو۔"

دونوں بچے حیران سے رہ گئے۔

"کبھی اماں کو چھوڑ بھی دیا کرو کسی اور کے لیے۔ میں اتنی دور دوبئی سے آتا ہوں اور پل بھر کو اماں اکیلی نہیں ملتی۔ کبھی یہ رشتہ دار کبھی وہ — کبھی قدیر بھائی کبھی بھابی جہاں آرا —"

اماں کسمسا کر بولی — "لے ان ہی لوگوں کی تو برکت ہے خیر سے — یہ نہ ہوتے تو تیرے اباجی کے جانے کے بعد میں زندہ رہتی! —"

دونوں بچے ہماری سنجیدہ آوازیں سن کر کھسکنے لگے تو اماں نے انہیں لپٹا لیا۔ "ناں

ناں... چاچا تو ایسے ہی کہتے ہیں، بیٹھو آرام سے۔"

"نہیں نہیں، میں ایسے ہی نہیں کہتا — میرا بھی دل چاہتا ہے آپ سے جپھی ڈالوں۔ آپ صرف میری بات سنیں —"

اماں ہنسنے لگی۔ ہنستی چلی گئی۔ ہموار انار کے دانے جیسے دانت اور آنکھوں میں جھلملاتے آنسو دیکھ کر مجھے جوان اماں یاد آگئی۔ جوانی میں وہ جب بھی ہنستی تھی، ایسے ہی آنسو رواں ہو جاتے۔

"لے تو نہیں بدلا نذیر.... جب تمہارا چاچا چھوٹا تھا ناں تو مجھے پوچھا کرتا تھا اماں تمہیں سورج پسند ہے کہ چاند....؟ تمہیں انگور پسند ہیں کہ مالٹے....؟ بس پوچھتا جاتا، پوچھتا جاتا —"

افشار اور ابراہیم حیرانی سے دادی کو دیکھتے رہے جیسے برقعے میں سے یہ کوئی اور عورت نکل آئی ہو!

"پوچھتا جاتا.... اور آخر میں پوچھتا اماں آپ کو میں پسند ہوں کہ قدیر بھائی.... لو بیٹا انگور مالٹے کی تو سیدھی سی بات تھی لیکن یہ سوال مجھے سٹپٹا جاتا ہے۔ اس کو میں کیسے سمجھاتی نہ دائیں آنکھ اچھی نہ بائیں، آنکھیں تو دونوں اچھی ہیں —"

"اچھا اماں اب سچ سچ بتانا — روند نہ مارنا، آپ مجھے زیادہ پیار کرتی ہیں کہ قدیر بھائی کو؟.... میں پردیس میں رہتا ہوں، مجھے لگتا ہے کہ اب میں پیارا نہیں رہا آپ کو —"

پتہ نہیں وہ آنسو ہنسنے پر آئے تھے کہ دکھ نے انہیں جنم دیا۔

"لے بھلا فاصلے سے کیا ہوتا ہے! — کل کو پوچھے گا اباجی کو بھلا دیا آپ نے؟ پگلے محبتوں میں بھی کبھی تقابل ہوئے ہیں؟ — میں تو یہاں تک کہوں گی کہ جو پہلی بیوی چھوڑتے نہیں اور نئی کو بیاہ لاتے ہیں، ان کو علم نہیں ہوتا کہ پہلی پیاری ہے کہ دوسری.... تو بیٹوں کی بات پوچھتا ہے! ناکارہ اولاد بھی اتنی ہی پیاری بیٹا جتنی سعادت مند بھلی اولاد.... دل انصاف کی بات تھوڑی مانتا ہے —"

"لیکن.... لیکن میرا دل نہیں مانتا اماں.... جب میں چھوٹا تھا.... تو میں پیارا تھا، اب قدیر بھائی...." میرا دل بھرّا گیا۔ پھٹی جوتی، دریدہ چادر، جھریوں بھرا چہرا، تار تار سفید بال، بوڑھے ہاتھ — پھر اس وجود میں کیا تھا کہ میں اسے قدیر بھائی کے ساتھ بھی بانٹ نہ سکتا

تھا؟

وہ پہلا دن تھا کہ میرے دل میں شبہ نے دستک دی۔ اس کے بعد شگاف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ میں کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا جب اماں کو احساس جرم نہ دلاؤں۔ ہر گفتگو ہمارے درمیان الزامی تھی — اماں کی طرف سے نہیں، میری جانب سے۔ اور یہ سارا وقت جب اندر ہی اندر میں اپنا رشتہ اماں سے منقطع کر رہا تھا، مجھے یہی وہم کامل رہا کہ اب اماں مجھ سے کوئی رابطہ رکھنا نہیں چاہتی۔

جب وہ ریڑھے والے سے سستے باسی تباسی امرود، ڈھلے کیلے خرید کر ابراہیم اور افشار کو کھلاتی تو میں اس کی توجہ کو غور سے جانچتا — جب وہ قدیر بھائی کے لیے آدھی رات کو غلط سلط سوئیٹر بنتی تو میں اس کا ملائم اور محبت میں بھیگا میٹھا چہرہ دیکھتا — جب وہ بہو جہاں آرا کو خاندان کی باتیں سناتی تو میں اس کی آواز میں خصوصی توجہ بھانپتا — یہ سب کچھ قدیر بھائی کے خاندان کے لیے تھا — میرے لیے صرف ڈراما تھا، دکھلاوا تھا — اظہار کی چق کے پیچھے کوئی نہ تھا — بے نور خالی پن —

ابا کے انتقال کے بعد یہ میرا دوسرا پھیرا تھا۔ بیچارے سیدھے سادھے ابا معمولی ٹھیکیداری میں گھر بار چلاتے رہے اور لے دے کے یہی وہ حویلی نما مکان تھا جو وہ ملتان روڈ پر لب سڑک چھوڑ گئے تھے۔ جب تک میں دوبئی میں تھا، مجھے ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ اس آبائی گھر میں میرا بھی کچھ حصہ ہے لیکن یہ خیال بھی اماں ہی کی مہربانی سے میرے دل میں ابھرا — پیڑھی پر بیٹھی اماں باورچی خانے میں مکئی کی روٹیاں پکا رہی تھیں۔ ابراہیم، افشار میرے قریب بیٹھے ساگ روٹی کھانے میں مشغول تھے۔ مکئی کی روٹی پر ڈھیر سارا مکھن رکھ کر اماں نے مجھے چھابا پکڑایا اور قدرے توقف اور سوچ کے بعد بولیں — "دیکھو نذیر.... جب میں مرجاؤں ناں تو اس گھر کو بیچنے کا مت سوچنا۔ میں جانتی ہوں تو کاہے کو ایسے سوچے گا پھر بھی —"

میں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا اور اماں کا چہرہ دیکھا۔ اس پر لجاجت، کمینگی، خوشامد اور بڑی سی امید لکھی تھی!

"کیا مطلب اماں؟"

کچھ گیس کے چولہے کی تمازت، کچھ اندر کی عرضی کی نامنظوری کا خوف.... اماں

کے چہرے پر پسینے کے قطرے ابھرنے لگے —

"یہ تمہارے باپ کا مکان ہے۔ جائز طور پر تمہیں اس کا آدھا ملنا چاہیے لیکن قدیر کی حالت اچھی نہیں۔ اسے جائیداد فروخت کرنے کا ڈھنگ نہیں آیا، بیچارہ سیدھا آدمی ہے۔ تیری تو چھ کینال کی کوٹھی بن رہی ہے ڈیفنس میں.... تجھے اس کھولی کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میرے اچھے بیٹے ضرور تیرا یہ حق ہے.... لیکن بھائی کی غریبی دیکھ، تو اس کے حق میں دستبردار ہو جا.... میری خاطر.... بھائی کی خاطر.... ان مجبور بھتیجوں کی خاطر...."

اماں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

اور ان آنسوؤں نے ہی میرا فیصلہ اٹل کر دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ صرف قدیر بھائی سے محبت کرتی ہے، اسے میری یا میرے خاندان کی کوئی پرواہ نہیں — وہ بے انصاف ہے....

اسی روز میں نے اپنی بیگم کو دوبئی فون کر کے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور اسی شام میں قدیر رئیل اسٹیٹ میں بھائی صاحب سے ملنے گیا۔ وہ پرانی میز پر بہت سے زائچے رجسٹریاں رکھے دیوار پر لگی ایک پرانی سکیم کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ دوکان پر کوئی گاہک نہ تھا۔

کچھ دیر ہم دونوں چپ بیٹھے رہے۔ ہم دونوں بچپن میں پہنچ گئے تھے اور بڑا بھائی اپنی غریبی کے باوجود مجھے پروٹیکٹ کرنے کے موڈ میں تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا — "میں قدیر بھائی دراصل اسی لیے آیا تھا کہ یہ مکان بیچ کر ہم اپنا اپنا حصہ لے لیں.... اس طرح دلوں میں کھوٹ نہیں رہتا...."

"بالکل بالکل...." خوف زدہ قدیر بھائی بولے۔

"یہ بات نہیں کہ مجھے اس روپے کی ضرورت ہے بلکہ یہ شریعت کا مسئلہ ہے.... ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"ہرگز نہیں — ابھی کل ایک گاہک آیا بھی تھا۔ تمہارا مکان بھی بن رہا ہے ڈیفنس میں، تمہیں اس رقم کی ضرورت ہو گی —"

چھ کینال کی کوٹھی کو وہ مکان کہہ رہے تھے!

ملتان روڈ کا مکان دنوں میں بک گیا اور مجھے اس کے تین لاکھ روپے مل گئے۔

جس روز قدیر بھائی رحمان پورہ میں سامان لے کر رخصت ہوئے اسی شام مجھے دوبئی روانہ ہونا تھا۔ سارے ٹین، ڈبے، چارپائیاں، حمام، پیڑھیاں، ٹرنک، کرسیاں جا چکی تھیں.... اب کچھ گملے، جھولے، تخت پوش وغیرہ صحن میں اکٹھے تھے۔ اماں تخت پوش پر بیٹھی تھیں، ان کا پیراشوٹ سا برقع سر پر تھا۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں، پھر بولیں — "نذیر.... میں نے اپنے حصے کی رقم قدیر کو دے دی ہے۔ اس بے چارے کی نئی جگہ جا کر کچھ تو تلافی ہو —"

بیچارہ بیچارہ.... میرے کانوں میں تیز ہوا چلنے لگی۔

مجھے قدیر بھائی کا چہرہ چالاک گیدڑ سا نظر آیا۔

اس سے پہلے دو ایک بار مجھے بھی خیال آیا تھا کہ میں اپنے تین لاکھ بڑے بھائی کو دے دوں لیکن ماں کی شکل دیکھ کر میں نے یہ ارادہ بدل دیا۔ وہ ساری کی ساری قدیر بھائی کی ماں تھی۔

"میں آج شام دوبئی جا رہا ہوں —"

"اچھا تو خدا حافظ —" ماں نے برقع اتار کر تخت پوش پر رکھ دیا اور آنگن والے غسل خانے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

یہ کیسا الوداعی جملہ تھا؟ — نہ کوئی پیار — نہ بغل گیری.... نہ دعا....!

اس کے بعد جو پہلا ردعمل میرے دل میں جاگا وہ یہی تھا کہ اماں کے لیے اب یہ رشتہ ناقابل برداشت ہے۔ وہ کسی طور بھی مجھے اپنے قریب لانا نہیں چاہتیں!

فون پر جب ساری بات فاخرہ سے ہوئی تو اس کے بعد مجھے کلی یقین ہو گیا کہ میرا کوئی قصور نہیں، اماں ہی اس رشتے کو توڑنے والی اور بھائیوں میں رخنہ ڈالنے والی ہیں۔

پتہ نہیں کیا بات ہے لیکن شروع میں تو مجھے فاخرہ کی کوئی بات درست نہیں لگتی لیکن رفتہ رفتہ میں اسی کی طرح سوچنے پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔

کچھ سالوں کے بعد مجھے قدیر بھائی نے خط لکھا کہ اماں فوت ہو گئیں، آخری وقت تک انہیں میرا انتظار رہا۔ میں نے اس خط کو رسم دنیا سمجھ کر میز پر پڑا رہنے دیا۔

جی بالکل، بات رشتوں کی ہو رہی تھی.... جس طرح اپنے مکان کی رجسٹری وقتِ

فروخت کسی دوسرے کی ہو جاتی ہے اور مکان اپنا نہیں رہتا لیکن پھر بھی اس مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم بتاتے ہیں — بیٹا یہ تمہارے دادا کا مکان ہے — یہاں ہم بڑھے پلے — ایسے ہی رشتے ٹوٹ جائیں لیکن کبھی کبھی مصری می سرد خانے سے نکل کر ہمیں ایک اور عہد یاد ضرور دلاتی ہے — رشتے بھی کانچ کی طرح اپنے اندر کے بوجھ، سرد مہری اور فصیلوں سے آخر کار ٹوٹ ہی جاتے ہیں۔ آج تک جتنے بھی رابطے، جو بھی سلسلے میری زندگی میں در آئے ان کے ٹوٹنے کا الزام میں نے کبھی وصول نہیں کیا اور فاخرہ نے اس سلسلے میں ہمیشہ میری مدد کی۔ اس نے احساس جرم سے مجھے ہمیشہ دور رکھا۔ بات بھی درست ہے۔ کسی قسم کا احساس جرم گھر کی سالمیت اور خوشی کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔

ایک اور رشتہ بھی اچانک ہی ٹوٹا تھا.... حالانکہ وہاں بھی کوئی ضرورت نہ جوڑنے کی تھی نہ توڑنے کی، بس اپنے بوجھ ہی سے وہ تڑک کر کے دو تا ہو گیا اور وہاں بھی میں نے سارا الزام لالی کو ہی دیا۔

میں ڈیفنس والی کوٹھی بیچنے کے لیے امریکہ سے لوٹا تھا۔ امریکہ میں ایک بڑا ڈیپارٹمنٹل سٹور خریدنے کے لیے مجھے روپے کی ضرورت تھی اور اسی لیے مجھے امریکہ سے آئے دوسرا ماہ ہو چکا تھا۔ گاہک ملتے لیکن من چاہی قیمت نہ ملتی۔ ایک شام گھنٹی بجی اور مجھے جب باہر نکلنے میں دیر ہوئی تو گھنٹی بجتی ہی چلی گئی۔ میں باہر گیا تو مجھے ایک شوخ لباس، شوخ چشم عورت کا سامنا تھا۔ وہ قریباً چالیس برس کی تھی۔ بال سنہری مہندی رنگے، چہرے پر کرسچن ڈائر کی عینک، اونچی ایڑی کی جوتی، براؤن اور برونز کا ملا جلا شلوار قمیض، مہکی ہوئی، خود اعتمادی سے دمکتی، روپے پیسے کی سہولت سے مسکراتی وہ بڑا سا تھیلا اٹھائے گھنٹی پر ہاتھ دھرے کھڑی تھی۔

"آپ ذرا یہ انگلی اٹھا سکتی ہیں۔ میں آ گیا ہوں، اب گھنٹی کی ضرورت نہیں —"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر انگلی اٹھا لی۔

"میں جلدی میں تھی اس لیے۔ گھر میں کوئی ملازم نہیں؟ اتنی دیر سے گھنٹی بجا رہی ہوں —"

"آپ مجھے ہی ملازم سمجھیے —"

کچھ دیر بعد اس نے مجھے سلام کیا اور بڑی خوش دلی سے بولی — "پتہ نہیں کیا بات ہے کہ میں سلام کرنا ہی بھول جاتی ہوں۔"

"بڑی اچھی بات ہے! اس طرح آپ کو پہلے سلام کرنا نہیں پڑتا۔"

وہ پھر ہنس دی۔ اس کا لباس، باہر کھڑی گاڑی، سفید وردی والا ڈرائیور، انداز سب اس بات کی دلیل تھے کہ وہ حالات کی طرف سے مطمئن تھی۔

"آپ نے اخبار میں اشتہار دیا تھا — کوٹھی بیچنے کا؟ —"

"جی بالکل —"

"کتنا رقبہ ہے؟ —"

"ایک مرلہ کم چھ کینال —"

"اور بیڈ روم؟ —"

"چھ بیڈ روم، ایک انیکسی جس میں دو بیڈ روم اور ہیں —"

"میں گھر دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس وقت میرے پاس ٹائم نہیں۔ میرا درزی پورے ایک بجے دوکان بند کر دیتا ہے — میں پھر آؤں گی —"

"ضرور ضرور —" میں نے جواب دیا۔

"بس ایک بات ہے۔ آپ مجھے کنسلٹ کیے بغیر اپنا بنگلہ نہیں بیچیں گے، نہیں تو ہم آپ پر حق شفع کر دیں گے —" وہ اترا کر بولی۔

لالی کم سن یا نو خیز نہیں تھی لیکن اس کی باتوں میں کم سنی اور اتراہٹ نوجوان لڑکی جیسی تھی —

وہ جلدی میں تھی، تیز تیز چلی گئی۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے مجھے یوں ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا جیسا برسوں سے میری واقف ہو۔ یوں اس کی آوا جاوی شروع ہوئی۔ وہ سیکٹر بی میں رہتی تھی اور میرے گھر کا فاصلہ اس سے قریباً فرلانگ بھر کا تھا لیکن وہ ہمیشہ مجھے پڑوسی کہتی، پڑوسی کا حق جتلاتی اور پڑوسی کی طرح مجھے کھانے پینے کی چیزیں بھیجتی رہتی۔

لالی غلام گردش تھی — کھلی ڈلی.... وہاں کوئی روک بندش کا احساس نہ تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ دولت نے اسے کئی سہارے دے رکھے تھے۔ وہ آزادانہ گفتگو کرنے کی عادی تھی بلکہ میں یوں کہوں گا کہ ٹی وی، اخبار، سوشل لائف، سٹیٹس نے اس کی زبان

کھول دی تھی۔ وہ بلاتکلف جنس، پولیٹکس، بازار کے بھاؤ، کتابوں پر تبصرے، بیرونی ممالک کے سفروں کے قصے، دوسرے لوگوں کی غیبت، مہنگائی، معاشرتی برائیاں، ٹریفک، موسم اور ان سے ملتے جلتے موضوعات پر بے تکان بول سکتی تھی۔ صرف ایک مشکل تھی کہ اس کی ساری سوچ اور گفتگو کا منبع مستعار لیے خیالات سے نکلتا۔ وہ کلیشے کی ماہر تھی۔ جہاں تک فکر کی گہرائی یا اپنی سوچ کا تعلق تھا، وہ اس سے بری الذمہ تھی — یوں لگتا تھا وہ ایک مائیکروفون ہے جس پر مسلسل دوسرے لوگوں، اخباروں، ٹی وی وغیرہ سے انفریشن انڈیلی جا رہی ہے۔

لالی نے مجھے دوسری ملاقات پر بتایا کہ اس کا نام مسز غازی ہے — اگلی ملاقات پر پتہ چلا کہ اس کا پورا نام مسز لالی غازی گنگوہی ہے — وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو لالی گنگوہی بھی متعارف کرواتی تھی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کے سسرال والے گنگوہا کے رہنے والے تھے۔ ان لوگوں میں سے کئی شاعر بھی ہوئے اس لیے گنگوہی انہیں غازی سے زیادہ پسند ہے —

جس طرح اس کی گفتگو مسلسل اور بے پیندے کی تھی، ایسے ہی اس کی شخصیت بھی پرت در پرت تھی۔ وہ موڈ کے تابع وقت بسر کرتی۔ ہنسنے کو جی چاہا تو ہنس لیا۔ کھانے پر طبیعت مائل ہوئی تو کھاتے چلے گئے۔ رونے پر اکسائے گئے تو ٹشو کے ڈبے ناکافی — کبھی کبھی جب وہ کھانے لگتی تو مجھے حیرانی ہوتی کہ یہ سب کچھ کہاں جا رہا ہے! — لیکن بات یہ ہے کہ لالی کسی پروگرام، روٹین یا نظام کا نام نہ تھا۔ کسی ٹائم ٹیبل سے اسے غرض نہ تھی۔ صبح خیزی شروع ہوتی تو کئی ہفتے فجر کی نماز کے بعد وظیفے بن جاتی۔ پھر بھول بھال کر موسیقی کا دورہ پڑ جاتا۔ پھر فنکشن پر فنکشن، موسیقاروں کی باتیں، رات دیر تک کیسٹ سننا اور سر دھننا۔ سہیلیاں بدلتی رہتیں۔ جیسے لوگ سیزن کے کپڑے سلواتے ہیں، وہ بھی رشتے ناطے نئے کرتی رہتی۔ تبدیلی لالی کے حسن اور اس کی شخصیت کا کارنر سٹون تھی۔ وہ استقامت نامی وصف سے انجان تھی — کسی ایک شخص، نظریے، مقام سے وہ ہمیشہ کی وفا نہ کر سکتی تھی۔

لالی کے چکر میں ہی مجھے ڈیفنس کا گھر بیچنا بھول گیا۔ ہر دوسرے تیسرے فاخرہ کا فون آتا —

"بھئی گھر کیوں نہیں بکا اب تک؟"

"ملکی حالات ہی ایسے ہیں۔ لوگ اتنی بڑی رقم مکان میں ڈبونا نہیں چاہتے۔ میں کیا کروں ۔"

"پھر بھی، کچھ کم پر دے ڈالیں۔ دیر ہو رہی ہے — ہم یہاں امریکہ میں پڑے سڑ رہے ہیں۔"

"بھئی میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہاں کوئی ایک چکر ہے، کوئی ایک بے ایمانی ہے — حد ہے!"

میں اس بات کو سمجھ نہ سکتا تھا کہ اس چکر اور بے ایمانی کا حصہ میں خود بھی ہوں۔ اس وقت میں دل میں یہی سمجھتا تھا کہ ملکی حالات نے پراپرٹی کی قیمت گرا دی ہے، اچھا گاہک نایاب ہے۔ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ اندر ہی اندر میں اپنے قیام کو لمبا کرنا چاہتا تھا اور اس کی وجہ صرف ایک تھی — اور وہ تھی لالی —

مجھے کبھی بھی آگاہی نہ ہوئی کہ میں اس عمر ڈھلی عورت کے سحر میں کس حد تک آ چکا ہوں!

شام کا وقت تھا۔ ہم دونوں کھلی لان میں سفید کین کی کرسیوں پر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ وہ ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھی تھی اور میں نے اپنی ٹانگیں دور تک یوں پھیلا رکھی تھیں کہ اس کی ٹانگوں سے فاصلہ چند انچ کا تھا۔ کوے ڈاروں میں گھر لوٹ رہے تھے۔ چڑیاں کچھ دیر پہلے ٹکڑیوں میں گھونسلوں کو پہنچ گئی تھیں۔

لالی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اتنی چپ چپ کبھی نہ تھی۔

"کیوں، آج کیا ہوا ہے؟ —"

"بس کچھ نہیں — میں سوچتی ہوں کس لیے زندہ ہوں اور کب تک یوں زندہ رہتی چلی جاؤں گی —"

"تم اپنے شوہر کے لیے جی رہی ہو، اپنے بیٹے کے لیے زندہ ہو جو امریکہ میں تعلیم پا رہا ہے —"

"اور وہ جو میں تنہائی کا شکار ہوں۔ خود تو مزے سے امریکہ میں جا بسے اور مجھے یہاں پراپرٹی کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ گئے۔ غازی ہے ہی خود غرض — استحصال

پسند...."

وہ دیر تک غازی میں ان خرابیوں کو گنواتی رہی جو قریباً سارے مردوں میں اور شاید ساری عورتوں میں سانجھی ہوتی ہیں....

"اتنی جائیداد آپ کے قبضہ قدرت میں دے رکھی ہے، اس قدر اعتماد ہے انہیں آپ پر۔ آپ تو لالی ایسے بات کرتی ہیں جیسے وہ آپ کا شوہر نہیں، دشمن ہو —"

"شوہر کب ہے میرا؟ — کب نکاح کیا اس نے میرے ساتھ؟ — کب یہ پراپرٹی کی میرے نام؟ ہاں سہیل کو ضرور پڑھا رہا ہے امریکہ میں — مجھے مہارانی کا سٹیٹس دے رکھا ہے لیکن یہ صرف دکھاوا ہے دکھاوا — میں اس کی سیدھی سادی رکھیل ہوں، Keep ہوں —" یہ کہتے ہی اس کے آنسو جھرنے کی طرح بہنے لگے اور ساتھ ہی وہ لال چقندر ہو گئی — سارے تاش کے پتے میز پر رکھ کر اس نے شو کرا دی تھی اور اب اس کے پاس میرے ساتھ مہارانی بنے رہنا ممکن نہ تھا۔ میں سکتے میں آ گیا — چند لمحے پہلے میرے لیے لالی ملکہ وکٹوریہ کی طرح تخت پر بیٹھی تھی اور اب اس تک ہاتھ پہنچ سکتا تھا — وہ میری گرفت میں آ سکتی تھی۔

اپنے آنسوؤں سمیت وہ اندر کی طرف بھاگی۔ میں چند لمحے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اگر یہ انکشاف نہ ہوا ہوتا تو شاید میں اس کی خلوت میں جانے کی جرات نہ کرتا اور گھر لوٹ جاتا.... لیکن اب مجھ میں دلیری آ گئی۔

میں اندر گیا اور اس کے بیڈ روم میں بلا ہچکچاہٹ داخل ہو گیا۔ وہ پلنگ پر اوندھی لیٹ کر سسک رہی تھی۔ میں پاس بیٹھ کر اسے تھپتھپانے لگا۔ یہاں ہی سے ساری مصیبت شروع ہوئی۔

وہ چپ ہو گئی لیکن میں نے اپنا مساس جاری رکھا — جونہی میں نے اس کے کان کی لو اور گردن پر انگلیاں پھیریں، وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئی اور میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے اسے بازو سے کھینچ کر اپنے سے لپٹا لیا۔ اس کے ردعمل کا انتظار نہ کیا اور اس کے سر پر بوسے دینے شروع کر دیئے۔ پتہ نہیں وہ لمحہ خراب تھا کہ میں نے اندازے غلط لگائے، لالی مجھ سے جدا ہو کر کوبرا سانپ کی طرح کھڑی ہو گئی۔

"جناب آپ اسی وقت یہاں سے رخصت ہو جائیں اور پھر کبھی میرے گھر

تشریف نہ لائیں۔ غازی ضرور حرام زادہ ہے' میں ایک رکھیل ہوں لیکن حرام زادے اور ٹھیکیائی کے بھی کچھ Morals ہوتے ہیں۔ وہ بھی سودے میں کھوٹ نہیں ملاتے..... وہ بھی وعدوں کا پاس کر سکتے ہیں۔ جب تک میں غازی کی پابند ہوں' اس کی موجودگی اور غیرموجودگی میں ایسے کھیل نہیں ہو سکتے — آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ میں تنہائی سے بے زار ضرور ہوں لیکن اس قدر بھی نہیں۔"

ابھی ہمایوں کو خط لکھنے سے پہلے میں یہی سوچتا تھا کہ لالی نے مجھ سے رشتہ توڑا — ہم دونوں میں ان کہی دوستی تھی جو مجھے دل سے عزیز تھی۔ اس دوستی کا کرچی کرچی ہونا لالی کی طرف سے تھا — اب مجھ پر کھلا کہ شاید میں بھی ایک غلطی کا مرتکب ہوا — میں نے اس صاف پانی کو گندا کرنے میں کسر نہیں چھوڑی اور غالباً میں نے لالی کے ساتھ ان اقدار کو منسوب نہ کیا جن کی وہ حامل تھی اور میں نے رشتہ توڑنے میں پہل کی — میں سمجھتا تھا کہ رکھیل کی کوئی ویلیوز نہیں ہوتیں' وہ اپنی آوارگی میں آزاد ہوتی ہے۔ معاً اب مجھے پتہ چلا کہ کچھ حدود' کچھ اصول اس نے بھی اپنے ضمیر کو شانت کرنے کے لیے بنا رکھے تھے اور اسی چق کی اوٹ سے وہ آپریٹ کرتی تھی۔

سامنے کاغذ رکھے اور ہاتھ میں قلم تھام کر میں اس وقت رشتوں کی بات کر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں میں نے جتنے رشتے توڑے اور جن کا الزام میں نے دوسروں پر دھرا — اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ کیا میں خود غرض تھا؟ کیا ہر رشتہ بوسیدہ ہو کر کارآمد نہ رہا تھا؟ کیا بے وفائی کا الزام دھرنے والے خود بے وفا نہیں ہوتے؟ میں چاہتا ہوں کہ ہمایوں سے قطع تعلق کرنے سے پہلے خود اپنے متعلق کسی فیصلے پر پہنچ جاؤں!

ہمایوں ہماری زندگی میں امریکہ سے واپسی پر داخل ہوا۔ ڈیفنس کی کوٹھی نہ بک سکی اور میں لالی سے رشتہ توڑ کر اور دل میں اس کی پارسائی اور اپنی نارسائی کو گالیاں دیتا نیوجرسی' امریکہ چلا گیا۔ کئی سال وہاں گزارنے کے بعد ہم وطن لوٹے۔ بظاہر ہم نے یہ فیصلہ اس لیے کیا کہ ہمارے بیٹے جوان ہو کر بے راہرو نہ ہو جائیں — رشتوں کی دقت نہ ہو۔ بہ باطن ہم اس تیز رفتاری سے تنگ آ چکے تھے جو مغربی زندگی کا شعار ہے۔ ہماری تنہائیاں اب چبھنے لگی تھیں اور پردیس کا حسن' آسائش اور آزادی ہمارے لیے عذاب کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ یہاں وطن واپس آ کر بزنس کو چلانے میں دو ایک سال دقت پیش

آئی۔ پھر سب کچھ دولت نے سہل کر دیا۔ جونہی زندگی ایک روٹین تلے گزرنے لگی' فاخرہ نے اپنے میکے کے پسندیدہ لوگوں کو اپنی روٹین میں شامل کر لیا۔ انہی میں سے ایک ہمایوں بھی تھا۔

ہمایوں کزن تھا' ذرا دور پار کا لیکن فاخرہ اور ہمایوں بچپن میں ایک ہی سکول میں پڑھے تھے۔ ان کا رشتہ بہن بھائی سے کچھ زیادہ لیکن عاشقوں سے کچھ کم تھا۔ آپس میں سچی بات کہنے اور لڑ جھگڑ کر دوبارہ ملنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ میرے لیے یہ نئی بات تھی۔ سچ سننے کے بعد کوئی کیونکر دوست رہ سکتا ہے؟

ہمایوں لمبا' اکہرے بدن اور خوبصورت لباس پہننے والا تھا۔ وہ شلوار قمیض میں بھی پرجمال لگتا اور تھری پیس سوٹ میں بھی۔ چند سال ہوئے اس کی بیوی فوت ہو گئی تھی اور اب وہ اپنی تین بیٹیوں کا باپ بھی تھا اور ماں بھی۔ بہت بڑی فیکٹری کا مالک تھا۔ لیکن نہ اس کی لڑکیاں نہ وہ خود ہی کبھی اس بات کا تاثر دیتا کہ اس کا کاٹن کا مال امریکہ اور یورپ میں بکتا ہے۔

مسکراہٹوں سے پُر لیکن الفاظ سے خالی' اٹھنے بیٹھنے آنے جانے میں کوئی نعرہ' کوئی آتش بازی نہ تھی۔ قیام پاکستان سے اب تک ہم لوگ Slogans' Punch line' نعروں اور Banners پر جیئے تھے۔ سادہ ہمایوں ان تمام ہتھکنڈوں سے ناواقف تھا۔ ٹھنڈی میٹھی طبیعت پر نہ تو معاشرتی آداب کا خول چڑھا ہوا تھا نہ ہی وہ ایسی گفتگو کرنے کا عادی تھا جو چونکا چونکا دیتی ہے۔ اس آخری قطار میں خوش دلی سے بیٹھنے والے انسان نے مجھے جلد ہی اپنی انگلی کے گرد لپیٹ لیا۔ شام کو وہ عموماً اپنی بیٹیوں میں مصروف ملتا۔ کبھی کبھی فاخرہ کے اصرار پر وہ ارم' ساجدہ اور تنویر کو بھی ساتھ لے آتا لیکن وہ بھی کچھ ایسی نہ تھیں کہ ان کا Impact ہمارے ماحول پر ہوتا۔

ہمارے گھر میں بڑے ٹھاٹ دار فنکشن ہوتے تھے جن میں مجرے اور شرابیں بھی چلتی تھیں' یہاں تک کہ میرے ملازم بھی پیگ پر پیگ چڑھائے ڈولتے نظر آتے۔ میں نے انہیں کبھی اس لئے نہ ٹوکا تھا کہ میرے دونوں بیٹے امریکہ میں پڑھتے تھے جس کی وجہ سے ہمیں کسی کے بے راہرو ہونے کا بھی خطرہ نہ تھا۔ فاخرہ بیٹوں کو امریکہ چھوڑ کر اس لیے آئی تھی کہ پاکستانی سوسائٹی میں کہیں وہ بے راہرو نہ ہو جائیں! ہم دونوں واپس آ گئے

تھے اور تعلیم مکمل کرنے کے لیے وہ وہیں رہ گئے تھے۔ میں فاخرہ کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ درخت اب پیوند ہو چکا ہے، اس کی گاچی نکال کر واپس پاکستانی مٹی میں بونا آسان نہ ہو گا۔

ایسی دعوتوں میں جہاں ہائی لائٹ مجرا اور شراب ہو، تکے کباب آدھی رات تک پیش ہوتے رہیں، خوش لباس مرد اور عورتیں ٹکڑیوں میں پاس پاس ایک دوسرے کی خیر خیریت پتہ کرتے رہیں، غیبت چلتی ہو، بچوں کا علم نہ ہو کہ وہ کس حال میں ہیں — ایسے میں جب گانے والی کی ہر ادا پر ہزار ہزار کا نوٹ ہوا میں لہراتا ہو — ایسے موسم میں ہمایوں محفل میں رہتا، کسی پچھلی قطار میں۔ کبھی کبھی دوست احباب اسے کھینچ کھانچ کر بھنگڑا ڈالنے پر مجبور کر دیتے۔ وہ اٹھتا، دو ایک چکر بھی لگا لیتا اور پھر کہیں گم ہو جاتا۔ اپنی مسکراہٹ سمیت وہ غائب ہونے کا فن جانتا تھا۔

میں کاغذ میز پر رکھے اور قلم ہاتھ میں لیے سوچ رہا ہوں کہ ہمایوں کو سخت خط لکھوں کہ سرد مہری سے بھرا ہوا — غلطی اس کی تھی کہ میری؟ یہ دوستی وہ ختم کرنا چاہتا تھا کہ میں؟

جس روز بڑی بیٹی ارم کی منگنی ہوئی، ہمایوں نے بہت بڑی دعوت کی۔ شہر کے قابل ذکر بزنس مین، وی آئی پی، سیاسی اکابرین آئے۔ مجھے ہمایوں نے فون پر بتا دیا کہ نہ تو کوئی مجرا ہو گا نہ ڈرنکس سرو کی جائیں گی۔ میں رات کا کھانا بہت رات گئے کھاتا ہوں۔ سرِ شام شغل کچھ اور ہوتا ہے۔

چونکہ مجھے معلوم تھا کہ ہمایوں کے گھر امراء والی دعوت نہیں، صرف کھانے پینے پر زور ہو گا اس لیے میں اپنے شغل کے لیے اپنی کار میں شراب کی بوتلیں، بیئر اور برف لے آیا تھا۔ جونہی لوگ جمع ہونے لگے، میں اپنے چند بے تکلف دوستوں کے ساتھ کار میں ہی بیٹھ کر پینے لگا۔ آہستہ آہستہ خبر اڑ گئی۔ چند اور احباب بھی آ گئے، انہوں نے بھی گلاس بھر لیے۔ رفتہ رفتہ کافی لوگ ڈگمگاتے ہوئے شامیانے کے اندر باہر آنے جانے لگے۔

عشاء کی اذان کے کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ نہ تو ہمایوں نے لیٹ آنے والوں کا انتظار کیا نہ ہی اس بات کی پروا کی کہ کچھ لوگ اتنی جلدی ڈنر کھانے پر آمادہ نہیں۔ خاموشی سے بیرا حضرات نے میزوں پر دھرے کھانوں کے نیچے بتیاں روشن کر دیں اور

مہمان حضرات پلیٹیں اٹھا اٹھا کر میزوں کی طرف بڑھنے لگے — میں اور میرے چند دوست اب تک کافی مدہوش ہو چکے تھے۔ ہمایوں اور اس کی منجھلی بیٹی ساجدہ ہمارے گروپ کے پاس آئے۔ میں نے پہلی مرتبہ ہمایوں کو تیوری کے ساتھ دیکھا۔

"حضرات کھانا کھا لیجئے، ٹھنڈا ہو رہا ہے —"

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا، میں کار کے دروازے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

"کھانا؟ اس وقت.... Are you mad؟"

ہمایوں کھسکنے کے موڈ میں تھا۔

"بھئی شریفوں کا یہی ڈنر ٹائم ہے —"

شاید اس نے غلط لفظ استعمال کیا یا پھر میں اس کی سنجیدگی سے برافروختہ ہو گیا تھا۔

"تو تم کیا سمجھتے ہو ہمایوں کہ ہم بدمعاش ہیں، اچکے ہیں! تھوڑی سی شراب پی لینے سے آدمی شریفوں کی صف سے نکل جاتا ہے؟ — ہم شریف نہیں، بولو...."

"تم چلو، میں آتا ہوں ساجدہ —"

ساجدہ بغیر سوال کیے لوٹ گئی —

"تم دیر سے کھا لینا — صرف ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ بھی لوٹنے لگا تو میں نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ "ہنگامہ میں نہیں، تم کرنا چاہتے ہو۔ تم کیا ثابت کر رہے ہو کہ تم بہت نیک نام، شریف، مذہبی آدمی ہو —"

ہمایوں خاموش رہا۔ میرے گروپ کے چند دوست گلابی آنکھیں چڑھائے ہمارے پاس آ گئے۔

"تم نے ہمیں اپنے گھر بلا کر بے عزت کیا ہے — بولو ہم شریف نہیں، بدمعاش ہیں؟"

"میرا ایسا کوئی الزام نہیں نذیر صاحب — بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ بلا اجازت اپنی شراب لائے اور میرے گھر میں اس شغل کو جاری رکھا — میری اجازت کے بغیر۔"

"دیکھا دیکھا دیکھا.... اس کو اعتراض تھا — تھا اس کو اعتراض۔ یہ اپنے گھر میں شراب پلانا نہیں چاہتا کسی کو — یہ مشکل ہے — یہ کنجوس ہے، ڈرنکس افورڈ نہیں

کر سکتا۔ یہ کیا نہیں کرتا.... بزنس میں کیا نہیں ہوتا۔ صرف شراب کی باری یہ شریف بن جاتا ہے —"

"یہ بات نہیں ہے نذیر کہ میں کنجوس ہوں.... میں شراب، مجرا سب کچھ افورڈ کر سکتا ہوں لیکن — لیکن.... کچھ پابندیاں ہیں آدمی پر.... کچھ گھر والوں کی طرف سے.... کچھ معاشرے کی بنائی ہوئی.... کچھ کچھ —"

"ہاں بولو.... بولو — کیا تم نے فیکٹری میں بجلی لگانے کے لیے رشوت نہیں دی....؟ کیا تم کبھی نااہل لوگوں کی سفارش نہیں کرتے؟ کیا تم نے سود پر قرض نہیں لیا فیکٹری کے لیے؟ — بتاؤ، بولو — سب گواہ ہیں تمہاری کرتوتوں کے —"

اب کافی مہمان ارد گرد جمع ہو گئے اور بدمزگی مجرے سے بھی زیادہ دلچسپ بن گئی۔ عورتوں کے چہرے اس نئی خبر سے زندہ تر نظر آنے لگے۔ مردوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھر گئیں۔

ہمایوں خاموش طبع انسان تھا۔ وہ ڈراموں، ہنگاموں سے بچ کر زندگی بسر کرتا۔ اس نے میری کسی بات کا جواب نہ دیا لیکن میں چلاتا رہا۔

"تم جناب ہمایوں صاحب — تم صرف ایک کام جانتے ہو، شرمندہ کرنا۔ منبر پر چڑھ کر مولوی ہمیں ہماری کرتوتوں پر شرمندہ کرتا ہے — انسانی کمزوریوں پر.... معمولی انسانی کمزوریوں پر ڈراتا ہے، خوفزدہ کرتا ہے — اسی لیے جناب ہمایوں صاحب آپ جیسے نیک لوگ جو اپنی مرضی کے گناہ تو چھپ چھپا کر کر لیا کرتے ہیں، تم جیسے نیک لوگوں پر میں نفرین بھیجتا ہوں.... دوسروں کو احساس جرم عطا کرنے والے فرعون.... داداگیر — مونچھ پر تاؤ دینے والے...."

ہمایوں کی مسکراہٹ غائب تھی۔ وہ خوف زدہ ہو گیا تھا....

اسی وقت میں باہر کی طرف لپکا۔ میرے ساتھ ہی کئی اور میرے من چاہے لوگ بھی واک آؤٹ کر گئے۔

رات گئے مجھے ہمایوں کا فون آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے معافی مانگے گا۔ ایسے میسنے لوگ معافی مانگنے میں دیر نہیں کرتے — "دیکھو نذیر خدا جانتا ہے میں گناہ گار آدمی ہوں لیکن.... کچھ احکامات کی پیروی سیکھ گیا ہوں.... میں.... میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔

اگر میں نے تمہیں احساس جرم دلایا تو ضرور میں ہی قصوروار ہوں — لیکن میں مجبور ہوں۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے مزید شرمندہ کرنا چاہتا ہے — مزید احساس جرم میں ڈبکی دلانا چاہتا ہے —

اس کے بعد ہمایوں گھر آیا تو میں نے فاخرہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ جہاں مسلک ایک سے نہ ہوں، انسان ایک طرح سے خوشی اور غم منانے پر اتفاق رائے نہ رکھتا ہو وہاں میل ملاقات رسمی رہ جاتی ہے — فاخرہ نے صلح کرانے کی ہلکی سی کوشش کی اور پھر خاموش ہو گئی۔

ابھی چند لمحے پہلے مجھے ہمایوں کا فیکس ملا ہے، جس پر لکھا ہے:

"نذیر — مجھے تمہاری دوستی اتنی عزیز نہ ہوتی تو میں یہ فیکس کبھی نہ بھیجتا۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جن احکامات کی واضح مناہی آئی ہے — اگر کوئی شخص ان میں سے چند ایک پر عمل کرنا چاہے تو اسے کیا لائن آف ایکشن لینا ہو گی؟ جو لوگ تمہیں مذہب کے معاملے میں Rigid نظر آتے ہیں، کیا وہ لوگ بھی مظلوم اور مجبور تو نہیں؟ — شاید وہ احساس جرم دلانا نہیں چاہتے، صرف اتنی بات واضح کرتے ہیں کہ احکامات کچھ اور ہیں — کیا ہمارے ملک میں یا پھر کسی ملک میں بھی نیک بننے کے لیے یا بنے رہنے کے لیے ابھی تک گرم ریت پر لٹایا جاتا ہے؟ کیا کسی مسلک پر چلنے کے لیے مصلوب ہونا ضروری ہے؟ — ہمیشہ ہمایوں...."

سامنے میز پر کاغذ ہے، میرے ہاتھ میں قلم ہے — اس فیکس نے مجھے اور احساس جرم دلایا ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ جب کوئی اتنے اونچے ٹیلے سے بولے تو اس کے ساتھ رشتہ کیسے قائم رکھا جا سکتا ہے؟ — جب ہم دونوں زندگی بسر کرنے کے لیے الگ الگ فارمولا استعمال کر رہے ہیں تو ہم قدم کیسے ہو سکتے ہیں؟ — شاید وہ ایک عرصہ سے مجھے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ یا شاید میں اس رات کے بعد اس کی صورت دیکھ کر کمتر محسوس کرتا ہوں!

بات رشتوں کی ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے شیشے کی طرح ہر رشتہ اپنے اندرونی دباؤ ہی سے ٹوٹ جاتا ہو؟ کسی انسان کا بنیادی طور پر قصور نہیں ہوتا — پھر بھی کبھی کبھی اپنے سے یہ تو پوچھنا پڑتا ہے کہ اصلی قصوروار کون تھا.... اماں، لالی کہ ہمایوں؟

شہرِ کافور

ہماری حویلی اور نئی بستی کے درمیان ایک سڑک کا فاصلہ ہے۔ سڑک کے آگے ایک اُجاڑ سا احاطہ ہے جس میں اب سارا دن مالی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ پٹڑیاں بچھائی جا رہی ہیں۔ درخت بوٹے گاڑے جاتے ہیں۔ گھاس کی چھوٹی چھوٹی پنیری لگائی جا رہی ہے۔ سنا ہے نئی بستی کا یہ پارک بڑی ہی ماڈل جگہ ہوگی۔

سڑک اور پارک گزر کر جو پہلی سفید کوٹھی ہماری حویلی کی تیسری منزل سے نظر آتی ہے، وہ بڑی خوبصورت ہے۔ اس کے لمبے لمبے ستون رومن کولوسیم کی یاد دلاتے ہیں۔ سامنے سیاہ پھاٹک، پھاٹک کے آگے توڑے دار بندوق والا چوکیدار ہے.... عموماً چوکیدار کے نیچے لوہے کی کالی کرسی ہوتی ہے۔

اس کوٹھی کے بند پھاٹک، اُونچے ستونوں کو چیرتی رات کے پچھلے پہر ایک آواز آتی ہے ”او رے بھیا .... بہادر محمد بن قاسم.... سن .... تجھے رسولؐ کی سوگند .... سن لے....“ ہوائیں سفید کوٹھی سے بڑی لٹک کے ساتھ حویلی کی تیسری منزل میں پہنچتی ہیں.... اور یہ مریل سی آواز.... مجھے جگانے کے لئے چھوڑ جاتی ہیں۔

اور تو سارے شوق جاتے رہے، ایک خبر دینے اور سننے کا آخری شوق تھا.... اس آواز نے اس کا بھی ستیاناس مار دیا۔ ہماری حویلی سے پیچھے پیچھے پرانا شہر آباد ہے۔ گلیاں اندر گم ہو جاتی ہیں۔ سڑک پر ابھی دودھ دہی کی دوکانیں، پنواڑی، پتنگ والے، گنے کے رس کی ریڑھیاں، نجومی اور ان گنت موسمی تاجروں کا بکاؤ مال فٹ پاتھ پر سجا رہتا ہے۔ کبھی شالیں، ٹوپیاں، گرم مفلر دکھائی دیتے ہیں تو کبھی چاقو چھری اور پلاسٹک کا سامان بیچنے والے فٹ پاتھ سنبھال لیتے ہیں۔

ادھر کی بستی کا ادھر کی نئی کالونی سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف کبھی کبھی رات کے پچھلے پہر جب ہوا چلتی ہے تو ایک دبی دبی سی آواز حویلی کی تیسری منزل میں گھومنے پھرنے لگتی ہے.... ”او بھیا رے گاؤں کا راجہ چور ہے۔ اے سن.... بہادر محمد بن قاسم.... تجھے رسولؐ کی سوگند.... سن تو سہی۔“

ہماری حویلی راجہ رنجیت سنگھ کے عہد کی ہے۔

حویلی کی ہیئت بارہ دری کی سی ہے۔ عمارت سہ منزلہ اور ساری کی ساری پختہ، چونا گچ سے بنی۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ کے عہد میں مزروعہ و بنجر سو بیگھ زمین داہنے پر تھی۔ جنوب میں جہاں ابھی شہر آباد نہ ہوا تھا ایک تالاب ایسا خوشنما اور ٹھنڈے پانی سے لبریز تعمیر تھا کہ خلق سارا دن پانی ڈھوتی اور حویلی والوں کو دُعائیں دیتی تھی۔ فقیر عزیزالدین سے ہمارے بڑوں کے مراسم دانت کاٹی روٹی کے سے تھے۔ ہمارے بزرگ پشت ہا پشت سے طبیب رہے۔ جو عزت اور توقیر آج بڑے بڑے کنسلٹنٹ ڈاکٹروں کی ہے وہ ہماری حویلی کو نصیب تھی۔ بیٹھک کے باہر مریضوں کے بیٹھنے کو پکی بنچیں، تھوکنے کے لئے اگال دان، چائے پلانے کے لئے خدمت گار مقرر تھے....

سنا ہے ساری حویلی میں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔ دن پل بھر میں اور پل ایک آنکھ جھپکنے میں گزرتا تھا۔ ہمارے بزرگ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کا ملکہ خواتین میں بھی تھا اور وہ نوکرانیوں کے درمیان ذاتی گفتگو فرفر فارسی میں کرتی تھیں جیسے آج کل کالونی میں انگریزی استعمال کی جاتی ہے۔ فقیر عزیزالدین کے گھرانے کی طرح تمام مرد گیروے رنگ کی پگڑی پہنتے، سردیوں میں پشمینے اور چوغے بھی اسی رنگ کے اُوڑھتے.... اس طرح حویلی کے لوگ عوام سے بچھڑ کر بالکل منفرد نظر آتے تھے۔ علم و دولت کے علاوہ لباس نے بھی اس آبادی میں حویلی والوں کی چڑھ مچا رکھی تھی۔ لیکن سنا ہے اتنی عزت و توقیر کے باوجود ہمارے گھروں میں اسراف بے جا پر سب لعنت بھیجتے تھے۔ اُونچی آواز میں بولنا گناہ تھا۔ نگاہیں جھکا کر چلنے اور آپے میں رہنے کا دستور تھا۔

دسترخوان پر کبھی ایک سے زائد سالن نہ ہوا۔ میرے پڑدادا نے ساری عمر اچار کی پھانک یا روٹی پر چٹنی رکھ کر کھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ پتہ نہیں یہ گھرانہ کس مٹی کا بنا تھا! بستی پوش راہ مولا مٹھیاں بھر بھر روپوں کی تصدق کرتے اور کھنکتے سکوں کی آواز پر بھی

آنکھ کھول کر دنیا نہ دیکھتے۔ خیرات، صدقہ، زکوۃ سب رات کے پچھلے پہر دینے کا حکم تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں یہ جنوب رویہ تالاب سوکھ گیا۔ کھاری پانی کی وجہ سے سو بیگھ زمین قابل کاشت نہ رہی۔ انگریز کے عہد میں زمین کو منشی کندن لال نے خرید لیا اور اس پر ہولے ہولے گھر، دوکانیں تعمیر کیں۔ پہلے جہاں ہماری حویلی بطخوں میں راج ہنس کی طرح تھی اب منشی کندن لال کا پختہ محل جگمگانے لگا۔ ہولے ہولے تین منزلہ حویلی سے لوگ کھسکنے لگے۔ کچھ کراچی جا آباد ہوئے کچھ دوبئی شارجہ چلے گئے۔ میرے دونوں ڈاکٹر بھائی امریکہ کی ریاست ٹیکساس نے چھین لئے۔ وہ بنچیں جن پر مریض بیٹھا کرتے تھے اب ان پر آوارہ کتے، بلیاں اور فقیر بیٹھے نظر آتے۔ اگال دان کوڑے کے ڈھیروں میں بدل گئے.....
رونق، سخاوت اور فارسی نہ جانے کیا ہوئی!

صرف یہ تین منزلہ حویلی پرکھوں کی یاد باقی ہے.....

آپ تو مجھے بے حس کہیں گے ہی لیکن کسی نہ کسی سے دل کی بات کرنا ہی پڑتی ہے۔ حویلی کی اُونچی چھتوں والے کمروں میں صدیوں پرانے پلنگ، آئینے، تلواریں، جھاڑ فانوس، چھپر کھٹ، بڑے بڑے حقے اور بوسیدہ قالین ٹھنسے ہوئے ہیں۔ آپ خود بتائیں جن کمروں میں راتوں کو تاریخ کا بسیرا ہو اور دن کے وقت رنگین شیشوں سے پڑنے والی روشنی اَن گنت آسیب پیدا کرے وہاں کوئی کیسے زندہ رہے؟ سنا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی رہتی ہے..... اب تو میں مایوس سی ہو چکی ہوں، بھلا کوئی اس کے دوہرانے کا انتظار کب تک کرے؟ اس کمرہ در کمرہ حویلی میں صرف بوڑھے رہتے ہیں۔ کھانستے ہونکتے، تھوکتے اور پرانی باتیں دوہراتے ہوئے بڈھے اور بڈھیاں..... کبھی کبھی کراچی، جدہ یا پھر ٹیکساس کے ڈاکٹر بھائی آجاتے ہیں تو کچھ دنوں کے لئے کمروں سے آوازیں آنے لگتی ہیں..... باقی وقت تاریخ کے پرانے اوراق ہیں اور ہم ہیں۔

ہم سے مراد بڑی آپا، دادی ماں اور میں ہوں۔ ہم تیسری منزل میں رہتے ہیں۔ آپا کسی زمانے میں خوبصورت تھی، اب وہ لٹکی ٹھوڑی کے ساتھ چپ چپ فضا کو تاکتی رہتی ہے۔ دادی ماں کا خیال ہے کہ کسی جن نے انہیں مغلوب کر رکھا ہے۔ جنوں کو بھی شاید ایسی ہی حویلیاں پسند ہیں۔ وہ بھی بیکار لوگوں اور بیکار اشیاء میں رہنا پسند کرتے ہیں۔
زمینی منزل پر دادا ابا کے علاوہ اور کئی اَن گنت سواریاں بوریا بستر باندھے چلنے کو

تیار بیٹھی ہیں..... لیکن جا نہیں پکتیں۔ حویلی کی طرح ان سب رفتہ گزشتہ لوگوں کی حیثیت تاریخی ہے۔ ان زنگ کھائی تلواروں سے نہ تو کوئی وار کر سکتا ہے نہ ہی یہ زیبائش کے کام آتی ہیں..... خدا کے لئے آپ مجھے بے حس نہ کہیں۔ مجھے ان سنگ میل قسم کے لوگوں سے بڑا پیار ہے۔ جب سے میں نے آنکھ کھولی، میں بوڑھے چہروں کے سہارے ہی جی رہی ہوں۔ لیکن اب مجھے کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ اچانک کسی رات جب ہوا چلتی ہے اور کالونی کی سفید کوٹھی سے "رسولؐ کی سوگند" سے لدی آواز حویلی سے ٹکراتی ہے اچانک کسی چوبی صندوق کا ڈھکنا کھلے گا اور اس میں سے کوئی جن برآمد ہو گا۔ چار ابرو صفا اس جن کو دیکھ کر پہلے مجھے قے آئے گی پھر میں چبوترے پر چڑھ کر چاہ چرخی دار میں جھانکوں گی اور آپا کی طرح قہقہے لگانا شروع کر دوں گی۔

مجھے سخاوت اور فارسی کا تو افسوس نہیں۔

لیکن وہ رونق..... جو شعر و سخن سے وابستہ تھی..... حکیموں کے دروازے پر اَن گنت مریضوں کا ہجوم..... سخاوت کی وجہ سے ضرورت مندوں کا پھیرا ٹورا..... وہ ساری رونق..... وہ..... ساری رونق کہاں گئی؟.....

میں آپا سے بیس سال چھوٹی بھی ہوں اور ابھی سوچنے پر مجبور ہوں..... کیا وہ لوگ جو وقت کے ساتھ بہہ نہیں سکتے، تنہا رہ جاتے ہیں؟.....

میں نہیں کہتی میرے ہاتھوں میں مہندی لگے، پھولوں سے لدی کار حویلی کے سامنے آکر رکے اور میں حویلی چھوڑ جاؤں..... کراچی..... شارجہ..... ٹیکساس..... لیکن کیا میں اتنی خواہش بھی نہیں کر سکتی کہ اس حویلی سے کسی کا جنازہ اُٹھے..... دھوم سے..... حویلی کے تمام کمروں میں لوگ متوحش پھریں، سڑک پار تک سے بنجر احاطے میں لوگ پوچھنے آئیں، شامیانے لگیں..... کیا ہمارے گھر میں مردہ رونق بھی نہیں لگ سکتی جبکہ امکانات یہیں پر سب سے زیادہ ہیں..... ہر منزل پر تاریخ بیٹھی ہے اور ورق اُلٹنے نہیں دیتی۔ سنا ہے ہمارے باپ دادا لاہور کے ناظم رہے..... وائسرائے کی بگھی اسی احاطے میں آکر رُکا کرتی تھی۔ اچھے ناظم تھے، ایک چھوٹا موٹا فنکشن ہمارے گھر میں کبھی نہ ہو پایا!

آپ ضرور کانوں کو ہاتھ لگا کر کہیں گے کہ واہ بھئی اچھا شوق ہے۔ چلئے مرنا تو برحق ہے ناں..... سماع کی طرح ہی سمجھئے، اگر حلال نہیں تو مباح ضرور ہے..... دادی کہا کرتی

ہیں سماع کا شوق بھی برا ہے، یہ آتشِ شوق کو بھڑکاتا ہے۔ عشق حقیقی ہو تو قربِ الٰہی کا شوق بڑھتا ہے۔ عشق مجازی ہو تو ہوس کی آگ شعلے بن جاتی ہے.... لیکن دادی کا کیا ہے، وہ تو دسویں محرم کو تمام رنگین شیشوں والی کھڑکیاں بھی بند کرا دیتی ہیں تاکہ محرم کے جلوس پر نظر نہ پڑ جائے....

بڑے انفعال کی ساتھ کہوں.... جی چاہتا ہے اپنی حویلی سے کوئی جنازہ دھوم دھام سے نکلے.... کسی اپنے کے جانے کا ڈرامائی رنج ہو.... گلا پھاڑ کر، بال بکھرا کر روئیں.... سامنے والی کالونی میں جب بھی کوئی اس جہاں سے جاتا ہے، یوں لگتا ہے کوئی بڑا فنکشن کھڑا ہو گیا....اب دادی ماں کہتی ہیں کسی کی ریس نہیں کرنی.... اُونچی آواز میں رونا معیوب ہے۔ جانے والے کی رُوح کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی....

آپ کو یاد ہو گا پھوپھی بتول کے شوہر اختر پھوپھا جب دوبئی میں فوت ہوئے، آدھی رات کو پورے پونے دو بجے فون آیا۔ بدقسمتی سے میں دیر سے پہنچی، جمشید ماموں نے فون اُٹھا لیا۔ تینوں منزلوں میں یک دم جمشید ماموں ہیرو بن گئے۔ مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ خاک میں بیس برس کی تھی، اتنا بھی نہ ہوا کہ تیسری گھنٹی تک دوسری منزل میں پہنچ جاتی۔ بھاگ کر بارہ سنگھے کے نیچے ساگواں کی تپائی پر سے فون اُٹھاتی اور پھر سارے کمروں پر دستک دیتی پھرتی.... پھوپھی بتول کے میاں فوت ہو گئے.... حاضرین!

لیکن مجھ سے پہلے زیرو بلب کی روشنی میں بارہ سنگھے کے نیچے لمبی لٹکویں مونچھوں والے ماموں سفید اُونی ٹوپی پہنے لمبے لٹکتے ازار بند سمیت فون سن رہے تھے۔ دوسری منزل میں اُترنے والی آخری سیڑھی پر ہی میں رُک گئی۔

میرا جی چاہا اگلے پچھلے سارے بدلے اپنے آپ سے لوں!

ماموں جمشید یوں کمرو کمری جانے لگے جیسے کسی فتح کا پیغام ہارے ہوئے جرنیل کو سنا رہے ہوں.... "لیجئے ایک افسوس ناک خبر ہے.... کہتے ہوئے زبان بند ہوتی ہے.... لیکن بتانا پڑے گا.... پھوپھی بتول کے میاں دوبئی میں فوت ہو گئے.... جنازہ بدھ کے روز عصر اور مغرب کے درمیان پہنچے گا...."

پوپلی گالوں والی تائی جان تک خبر پہنچی تو اُنہوں نے سر ہلا ہلا کر پوچھا.... "کیسے کیسے؟"

"بھائی اختر فرنٹ سیٹ پر تھے.... غلط ہاتھ سے ٹرک آیا۔ سریا لدا تھا۔ فرنٹ کا شیشہ چکناچور.... سٹیرنگ ڈرائیور کے پیٹ میں کھب گیا۔ بھائی اختر دروازہ کھول کر نکلنے کو تھے، دھڑام گرے.... پیچھے سے گاڑی آ رہی تھی...."

کتنی بڑی خبر جمشید ماموں کے ہاتھ آ گئی تھی اور یک دم وہ کبڑے چھوٹے بے جان سے نہیں لگ رہے تھے۔ دادا ابا نچلے صحن میں پیڈسٹل فین کے سامنے نواڑی چارپائی پر بیٹھے پنکھا جھل رہے تھے۔

"کیوں کیسے کب؟"....

جمشید ماموں میں نہ جانے کدھر سے توانائی آ گئی تھی.... ایک ایک تفصیل بڑے بڑے لہجے میں سنائی۔

"ہاں تو جنازہ؟...." ہونکتے ہوئے دادا ابا نے پوچھا....

"وہی بدھ کی شام عصر اور مغرب کے درمیان کراچی...."

ایک ایک کر کے حویلی کے سارے کمرے، غلام گردشیں، صحن روشن ہو گئے۔ آوازیں آنے لگیں۔ لوگ چلنے پھرنے لگے۔ میرا جسم ایک خاص قسم کی اُمید، توانائی سے بھر گیا۔ میں نے سوچا شاید جنازے پر مجھے بھی کراچی لے جائیں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ دادی ماں کہیں گی.... لو ہٹو، لڑکیوں کا کیا کام.... مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے لڑکیوں کا دُنیا میں کوئی کام ہی نہیں۔ منڈیر سے جھانکو تو پوچھا جاتا ہے کیا دیکھ رہی ہے.... کھڑکی سے نگاہ ڈالو تو سوال ہوتا ہے باہر کون ہے.... دروازے کی درز سے جھانکو تو پوچھتے ہیں تاک جھانک سے مطلب....

صبح جب تک سفید کوٹھی کی طرف سے ہوا نہیں چلی، مسلسل یہی خیال رہا لو جی عین ممکن ہے بڑے ساتھ لے چلیں۔ بسنتی پگڑی والوں کی اولاد مجھے کسی کی نگرانی میں چھوڑنا پسند نہ کرے۔ ایک تو سچی بات یہ ہے ان پرانے دھرانے خاندانوں میں نگرانی کا بہت اعلیٰ معیار ہوتا ہے۔ سب کچھ زیر نظر رکھتے ہیں۔ اور پھر بھی وقت ان ہی آنکھوں کے سامنے سب کچھ چرا لے جاتا ہے....

حویلی میں نہ تو اب وہ رونق ہے نہ سخاوت، نہ ہی کہیں فارسی نظر آتی ہے۔ بڑی دعائیں مانگیں کہ مجھے جنازے پر کراچی ہی لے چلیں۔ میں نے حج تو نہیں کیا

پر جب بھی کروں گی، اسی کے نام ثواب منتقل کروں گی جو ساتھ لے چلے۔ مجھے پھوپھی بتول کے مرے ہوئے شوہر کا چہرہ دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ ان کو زندگی میں صرف دو بار دیکھا تھا۔ لیکن یہ تیسری بار بڑی اہم تھی۔ ایک بار تو وہ غسل خانے سے کندھے پر تولیہ رکھے نکل رہے تھے اور دوسری بار جب وہ پھوپھی بتول کے ساتھ حویلی آئے۔ پھوپھی بتول ہمارے باقی خاندان والوں کی طرح پتھر کا چہرہ لئے دم سادھے یوں بیٹھی تھیں جیسے خشک دھرتی۔ پاس پھوپھی بتول کے شوہر گھٹنے جوڑے دانت بھینچے بیٹھے تھے۔

پھوپھا جی.... اور پھوپھی بتول ایک تھے۔

ایک بادام میں دو گریاں، ایک انڈے کی دو زردیاں، ایک شاخ پر جڑواں پھول! درد ایک کو ہوتا، کراہ دوسرے کے منہ سے نکلتی.... چوٹ جدھر لگتی، عین وہیں دوسرے کے نیل پڑ جاتا.... بھوک بتول پھوپھی کو لگتی پر جب تک پھوپھا سیر چشم نہ ہوتے، پھوپھی کا پیٹ نہ بھرتا.... دونوں کی محبت میں تیسرے کی ضرورت تو تھی پر گنجائش نہ تھی۔

ان دونوں کو دیکھ کر لگتا کہ جب کوئی بیاہتا مرد عورت دل سے ایک ہو جائیں تو ان کی اداسی اکیلے دل سے بڑھ جاتی ہے....

دل چاہتا تھا کہ اختر پھوپھا کا چہرہ آخری بار دیکھوں.... پھر پھوپھی بتول پر نظر ڈالوں.... مجھے ایسے لوگوں کو دیکھ کر بڑی ململاہٹ ہوتی ہے جو دوسروں کی خاطر اپنی زندگی ساقط کرنے کا فن جانتے ہیں۔

چاہیے اور نہ چاہیے سے کیا ہوتا ہے.... جب اماں حیات تھیں تو کہا کرتی تھیں میت کا چہرہ ضرور دیکھنا چاہیے، پھر اس کی موت کا یقین آجاتا ہے۔ سچ بتاؤں مجھے رسم و رواج میں "چاہیے" کی جگہ سمجھ نہیں آتی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ میت دیکھ کر بڑا اُلٹا اثر ہوتا ہے.... لگتا ہے یا تو مردہ سو رہا ہے یا کوئی ڈرامہ ہے، ابھی ٹھا کر کے اُٹھے گا اور سب کو ڈرا دے گا۔ جب عورتیں چہرے سے چادر سرکا کر دیکھتی ہیں تو مٹی رنگا چہرہ بولتا نہیں، بس پڑا سنتا ہے۔

"ہائے کتنا نور ہے چہرے پر...."

"لگتا ہے سو رہے ہیں...."

"کتنی نورانی مسکراہٹ ہے...."

"خود تو سکون میں چلے گئے، پر بچے.... ہائے کمسن یتیم بچے...."

بچوں کا نام سنتے ہی سب کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ پھر ہر کوئی ایک دوسرے کو چپ کرانے میں مشغول۔ عورتیں لپٹا کر محبت سے دلاسے دیتی ہیں۔ شادی اس معاملے میں بڑی خراب چیز ہے.... سب کو اپنے اپنے لباس اور بالوں کا خیال رہتا ہے، ایویں چہرے پاس لا کر بچ بچ کر لیتے ہیں۔ لیکن غم بڑی یونیورسل چیز ہے.... اس میں سبھی قریب آجاتے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا جب مرد حضرات منظور صاحب کو سپرد خاک کر کے لوٹے تھے تو پورچ کے نیچے ایک درمیانی عمر کے گرے شلوار قمیص میں ملبوس صاحب نے مجھے لپٹا کے بڑی تسلیاں دی تھیں حالانکہ میں کچھ خاص رو بھی نہیں رہی تھی.... اور کالونی کے منظور صاحب سے حویلی والوں کا ملنا بھی واجبی سا تھا!

لیکن اماں جب تک زندہ رہیں انہوں نے غم کو بھی اسلامی قدروں کے تابع کر رکھا تھا۔ بسنتی پوش پتہ نہیں کہاں کہاں سے قدریں لا کر عام زندگی کو ٹیکہ لگا دیا کرتے تھے۔ اماں تو خاص طور پر اپنی تاریخ میں اس قدر گم تھیں، انہیں فقیر عزیزالدین پل بھر کو نہ بھولے .... اب فنکشن تو شادی اور مرگ دونوں ٹھیک ہیں، لیکن اماں کے جیتے جی ہم دونوں بہنوں کا جنازے پر جانے کا بنتا ہی نہ تھا۔ پھر شادی پر لے جاتیں تو محرم کا لباس پہنا کر۔ انہیں ہر وقت محرم نامحرم کا خیال ستایا کرتا۔ نئی کالونی میں جا کر دیکھ لیں.... کیا ہلڑ مچا ہوتا ہے مہندی کی رات، کون دیکھتا ہے دوپٹہ کھسکا کہ پائنچہ اُٹھ گیا۔ دمکتے چہرے، بوتیکوں کے لباس.... لٹک مٹک، قہقہے، ڈانس.... رونق ہی رونق.... سخاوت ہی سخاوت۔

پتہ نہیں کیوں اماں شرافت کے برقعے کو زندگی کی آبشار سے بہتر سمجھتی تھیں۔ ہمیشہ کہتی رہتیں شادی میں تو اتنا تصنع.... فضول خرچی، شوبازی آگئی ہے کہ رشتہ داروں میں یگانگت کا پتہ ہی نہیں چلتا....

پتہ نہیں اماں کی تربیت کا اثر تھا کہ حویلی میں اٹی پرانی چیزوں کا، اچانک ہی آپا پر جن آگیا۔ مجھے اب یوں لگتا ہے کہ کسی رات کے پچھلے پہر جب کالونی کی طرف سے ہوا چلے گی.... پرانے جستی ٹرنک میں سے جس میں زنگ آلود تلواریں مردہ سروں کی داستانیں سینے سے لگائے سوتی ہیں.... بسنتی رنگ کی پگڑی پہنے کوئی سفید جن نکلے گا اور میرا گلا تن

سے کاٹ کر اتنی زور سے ہنسے گا کہ راجہ رنجیت سنگھ کے زمانے کی بنی ہوئی حویلی میں دراڑیں پڑ جائیں گی....

آپ سے سچ کہوں فنکشن تو دونوں اچھے، شادی بھی اور ہنگامہ رخصتی انسان بھی....
لیکن سچ کہوں مرگ والے گھر میں لطف کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ جنازہ دیکھنا، جنازہ اُٹھنا.... جمعراتیں منانا، سوئم چالیسواں.... ون ڈے میچوں کی طرح ہر دن اکساہٹ سے انگیختہ.... اُجلے اُجلے کلف لگے بھینی بھینی بدیسی خوشبوؤں میں رچے بسے دوپٹے، کبوتروں کی طرح نرمی سے سفید چادروں پر پڑتے پاؤں، اُجلی اُنگلیوں میں پھسلتی کھجور کی گٹھلیاں، قرآن پڑھتی دائیں بائیں ٹھٹکتی آنکھیں، دیگوں کے پکے کھانوں کی خوشبو.... ہر طرف کھسر پھسر.... آپ مانیں نہ مانیں غمزدہ چہروں کی محبت جو موت کے وقت نظر آتی ہے، وہ شادی کے وقت کہاں!

آپ ضرور کہیں گے کہ بڑی بے حس ہے۔

لیکن مجھے اول تو اخبار ملتا نہیں اور جو کبھی مل جائے تو میں بڑی تفصیل سے ساری وہ خبریں پڑھتی ہوں جن میں قتل و غارت، گینگ ریپ اور بے دردی سے لوٹنے کا ذکر ہو۔ مجھے مردہ سی فلمیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ بس آٹھ دس قتل ہوں، کاریں ایک دوسرے کا تعاقب کریں، عورتوں کی بے حرمتی کے سین ہوں۔ آپ ناراض نہ ہوں تو آخر Excitement تو ان ہی منظروں میں ہوتی ہے.... لیکن کیا کروں وی سی آر تایا جی کی الماری میں بند رہتا ہے۔ جب بھی مانگیں پونے گھنٹے کا لیکچر سننا پڑتا ہے کہ آج کل کی فلمیں دیکھ کر لڑکیوں کا کریکٹر خراب ہو جاتا ہے۔

شادی کا فنکشن اپنی تمام خوشی، رونق، رنگ اور خوشبو کے باوجود بڑا Tame ہوتا ہے۔ مجھے مرے مرے فنکشن اچھے نہیں لگتے۔ کچھ پچ مچا ہو۔ سلگنے، آگ لگانے کا سماں۔
آپ کو یاد ہو گا جب سامنے کالونی میں طلعت آپا کی بڈھی اماں فوت ہوئی تھی تو سارے اخباروں میں اس کا چرچا تھا۔ آخر طلعت آپا کے میاں فیڈرل منسٹر تھے۔ جب جنازہ میانی صاحب روانہ ہوا تو پون میل لمبی کاروں کی قطار تھی.... پولیس ٹریفک کنٹرول کے لئے حاضر.... جہاں اب مالی کام کرتے ہیں وہاں شامیانے ہی شامیانے۔
لیکن اماں کی تو عادت تھی ہر اچھے میں نقص نکالنا.... انہوں نے کبھی لائف

انجوائے نہیں کی اس لئے دوسروں کا مزہ کرکرا کر دینا ان کا بنیادی فن تھا۔ گھر آتے ہی بولنا شروع ہو گئیں۔ ہمیں بھی خاندانی روایات کا بڑا پاس ہے لیکن اماں کی طرح لمبا سانس لینا ہمارے نزدیک اسراف میں شامل نہیں تھا۔ "اب تو سوگ اس قدر شان و شوکت سے مناتے ہیں.... کہ خوف آتا ہے.... یہ بالکل غیر شرعی کام ہیں.... ہمارے خاندان میں تو اُونچی آواز میں روتے بھی نہیں تھے...."

جب تک آپا پر جن نہیں آیا تھا، ہم دونوں اکٹھی بیٹھ کر سوچا کرتی تھیں۔ سارے گھر میں نئے پردے، قالین، فرنیچر لگائیں گی۔ ہم بھی کالونی والوں کی طرح کھلا کھلا رہیں گی جس میں آنا جانا بہت ہو گا، سونا بیٹھنا کم ہو گا.... لیکن اماں کے ہوتے لوگوں نے ہمیں مرگ پر بھی بلانا ختم کر دیا تھا۔ لوگ چالیسواں کر کرا کے خبر بھیجتے تھے....

اور اپنے گھر کا یہ حال ہے کہ تین منزلہ حویلی میں بائیس کھانستے، ہونکتے، بڑبڑاتے، لڑھکتے بڈھے دگرگوں پڑے ہیں۔ کسی کمرے میں کوئی جوان صورت چلتا پھرتا نظر نہیں آتا.... میرا جی چاہتا ہے کالونی والوں کی طرح ہمارے گھر کی خبر بھی لگے.... کل سوئم ہے.... چالیسویں کا اشتہار آئے۔ ذرا خود ہی سوچئے کن کن ہاتھوں میں اخبار جاتا ہے۔ کیسی کیسی نظر بد ڈال کر کیسے کیسے لوگ خبر پڑھتے ہیں۔ کتنا رعب پڑتا ہے.... اتنا رعب ساری حویلی سالم کی سالم نہیں ڈال سکتی جو ایک خبر سے پڑ جاتا ہے۔ جب میجر افتخار فوت ہوئے تو گھر والوں نے چالیسویں کی اخباری خبر فوٹو سٹیٹ کرا کے تمام رشتہ داروں میں بانٹی تھی.... کسی کو زبانی اطلاع دی ہی نہیں.... ویسے بھی کتنا چیپ لگتا ہے خود سب کو بتاتے پھریں۔ میجر صاحب کے گھر والے بڑے منظّم اور سٹائل والے لوگ ہیں۔ ان کی کوٹھی کالونی کے شروع میں مسجد کے بالکل پاس ہے۔

ابھی کچھ سال پہلے جہاں گدھے لوٹنیاں لگایا کرتے تھے، اب وہاں اتنے خوبصورت باغ میں موتی سی چمکتی میجر صاحب کی کوٹھی ہے۔ میجر صاحب خود تو اللہ کو پیارے ہوئے لیکن ذوق، تنظیم، سٹائل گھر والوں کو خوب سکھا گئے۔ جو خط تاریں موصول ہوئیں، ایک فائل میں ان کو رکھا گیا۔ فائل کور سیاہ تھا جس پر سفید حروف میں لکھا گیا "میجر افتخار کی یاد میں"۔ اندر سب سے پہلے پرائم منسٹر کا خط تھا کہ افسوس میں ملکی اہمیت کی مصروفیت کے باعث جنازے میں شریک نہ ہو سکوں گا لیکن جملہ اہل خانہ کے لئے دعاگو ہوں۔ آگے

صدر مملکت کی تار تھی۔ پھر فیڈرل گورنمنٹ کے چند منسٹروں کے خط اور پھر سلسلہ وار خطوں کا سلسلہ۔ جب کوئی ان کے گھر پرسا دینے آتا، یہ فائل اور جنازے کی تصویریں ضرور دکھائی جاتیں۔

احاطے کے پار کالونی میں جنازے کے دن ویڈیو بنانے کا رواج عام ہو گیا ہے لیکن میجر صاحب کی طرح ہر کام منظم طریقے پر انجام دینا ان ہی کے گھر کا خاصہ ہے۔ تایا ابا ان سے ایک ویڈیو مانگ کر لائے تھے۔ ہم سب نے بیٹھ کر یہ فلم دیکھی.... بائیس کے بائیس بڈھے بڈھیاں خوب روئے۔ میری بھی آنکھیں بھر بھر آئیں اور زندگی کی بے ثباتی کا پتہ چلا۔ مجھے معلوم نہیں کس کا جنازہ تھا لیکن میت کے بڑے دلدوز کلوز اپ تھے.... رونے والوں کے کلوز اپ۔ جس وقت چیف منسٹر صاحب آئے، پہلے کیمرہ ان کے پیروں پر گیا.... کیسے وہ کار سے اُترے، ملاقاتیوں سے ملے۔ اتفاقاً وہ مسکرائے تو کیمرہ کس چابک دستی سے پھرا کر میت کی طرف موڑ دیا گیا۔ جس وقت چیف منسٹر نے میت کا مُنہ دیکھا.... جیب سے رومال نکال کر آنکھوں کو لگایا، لوگ کیسے دھاڑیں مار مار کر روئے.... خدا جانتا ہے سب سے زیادہ رقت اسی سین نے پیدا کی۔

لیکن چھوڑیئے ہمیں کیا!

میں تو سوچا کرتی ہوں کیا تبدیل نہ ہونے والے لوگ اسی طرح تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں جیسے حویلی والے.... سنا ہے حویلی میں فارسی کے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ دور دور سے شاعر حضرات کئی دن پہلے ہی جمع ہو جاتے، یہ بھی گھر والے ہی بتاتے ہیں۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اندر باہر سائل گھسے رہتے، گھر والوں کو ان کے مسائل سے ہی چھٹی نہ ملتی کہ اپنی خبر لیتے.... طبیب اس درجہ عاقل و صائب کہ دروازے کے آگے مریضوں کا جمگھٹا رہتا.... لیکن اب آپے میں رہنا اور نیچی نظر کر کے چلنے کا رواج بھی ختم ہو گیا۔

نہ رونق رہی نہ سخاوت اور پتہ نہیں فارسی کو کیا ہوا!.... یہ زبان تو ایسے لگتا ہے جیسے کبھی اس حویلی میں بولی ہی نہیں گئی.... میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ کبھی انگریزی کا بھی ایسا حال ہو سکتا ہے۔

جب سے آپا پر جن آنے لگا ہے.... ہم نے باہر نکلنا ہی بند کر دیا۔ خواہ مخواہ لوگ اُلٹے سیدھے سوال کرتے ہیں اور جا و بیجا مشورہ دیتے ہیں۔ پہلے مجھے جنازوں پر جانے کا

شوق تھا۔ بدنصیبی سے اب صبح کے وقت کبھی کبھی ایسی دلدوز آواز کالونی کی طرف سے چلتی ہے کہ خبر لینے اور دینے، اپنی ذات کو دکھانے اور نمائش کا جو ایک موقعہ میسر تھا وہ بھی جاتا رہا۔ پہلے کہیں مرگ ہوتی، ہونکتی ہانکتی گھر کی بڈھیاں مُنہ دیکھنے کو چل نکلتی تھیں.... میں بھی کسی نہ کسی کا دم چھلا بن جاتی ..... لیکن اب دل ڈرتا ہے.... خوف آتا ہے۔

آپ کو میں نے بتایا ناں کہ سڑک پار احاطہ ہے جس میں سارا دن بیل دار، مالی کام کرتے ہیں۔ بالکل حویلی کے سامنے وہ سفید کوٹھی ہے جس کے ستون رومن عمارتوں جیسے ہیں۔ کوٹھی کے آگے بڑا سا کالا گیٹ ہے۔ گیٹ کے آگے کالی کرسی پر چوکیدار بیٹھا رہتا ہے۔

بس آخری بار میں یہیں جنازے کی شرکت میں گئی۔ ہمارے گھر میں کسی کو علم نہ تھا کہ کیا ہوا۔ بس اتنا پتہ چلا کہ قتل ہو گیا....

کون؟.... کس کا قتل؟

لیکن انفریمیشن نہ مل سکی۔ دادی نے ریشمی آف وائٹ برقع نکالا۔ تائی نے تین گز لمبی بوسکی کی سفید چادر میں اپنا چہرہ، جسم چھپایا۔ ہم تینوں کالونی کی سفید کوٹھی میں داخل ہوئیں۔ بڑے بڑے کمروں میں قیمتی فرنیچر دیواروں کے ساتھ لگا کر سفید براق چادریں بچھائی گئی تھیں۔ عورتیں سلیقے سے دوپٹے اوڑھے تیسرا کلمہ پڑھ رہی تھیں۔ غم و اندوہ کے باعث سبھی چہرے ایک سے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک سسکی بھری آواز آئی "او رے محمد بن قاسم.... بول رے کہاں ہے تو.... تجھے رسولؐ کی سوگند آ بھی جا...."

میں ہر عورت کا چہرہ دیکھ کر سوچتی کیا یہ مقتول کی ماں ہے؟

کبھی لگتا جو سیاہ دوپٹہ اوڑھے بار بار اپنی ناک کو پونچھتی ہے، وہی ہو گی۔ اس کے گرد بہت عورتیں جمع تھیں اور وہ ہولے ہولے نظریں جھکا کر بیچارگی سے کچھ بتا رہی تھی۔ کبھی محسوس ہوتا وہ بھدی سی عورت جس نے پورے تخت پوش پر کمبل پھیلا کر اپنا مُنہ سر ڈھانپ رکھا ہے، سوگوار ماں ہے۔ کبھی اس پر شک پڑتا جو دونوں پاؤں صوفے پر دھرے بیٹھی تھی اور جسے بار بار لڑکیاں گلوکوز پلانے پر اصرار کر رہی تھیں۔

بڑی دیر بعد میرے پاس والی نوجوان خاتون نے ساتھ والی سے کہا.... "لو جھگڑا

صرف پانچ روپے پر ہوا۔ جھٹ کلاشنکوف نکالی اور شہید کر دیا....''

''ایک ہی بیٹا تھا ناں....؟'' کاسنی دوپٹے والی نے سوال کیا۔

''بالکل ایک.... پتہ ہی نہیں چلا۔ یہاں پھاٹک کے سامنے قتل ہوا.... چوکیدار کے سامنے.... شیخ صاحب فیکٹری سے آ رہے تھے....''

میرے بائیں جانب بیٹھی عورت نے بڑی بڑی آنکھیں گھما کر کہا.... ''سنا ہے ماں غم سے دیوانی ہو گئی ہے۔ کہتی ہے شیخ صاحب آپ جنازے پر کوڑی نہ لگائیں، بس انصاف دلا دیں.... ایف آئی آر کٹا دیں....'' کاسنی دوپٹے والی جھنجھنائی.... ''ایسا جنازہ تو کوئی اپنوں کا نہیں کرتا۔ سنا ہے رات پریس کے لوگ بھی آئے تھے۔ باہر شامیانے دیکھے ہیں آپ نے۔ بڑے نیک لوگ ہیں۔ ذرا دریغ نہیں کیا.... نیک لوگوں کی کمی نہیں.... ابھی بھی....''

''پھر بھی پیچھا کرنا تھا قاتل کا.... ایف آئی آر کٹانی تھی.... چوکیدار نے بندوق کیوں نہ چلائی؟''

''او جی کیا فرق پڑتا ہے۔ قاتل کا پیچھا کرتے شیخ صاحب، اس کے پاس تو کلاشنکوف تھی ..... انصاف کبھی ملتا ہے جو ایف آئی آر کٹاتے.... ایسے وقت ضائع کرتے....''

''پھر بھی قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے....''

''چھوڑیں جی قانون کو.... بات کریں شیخ صاحب کے گھرانے کی.... کیا نیک لوگ ہیں، ایک ملازمہ کے غم میں ایسے شریک ہوئے ہیں۔ واہ وا.... واہ وا.... سنا ہے اس جمعہ کو خاص مضمون نکل رہا ہے شیخ صاحب پر.... تصویریں بنا کر لے گئے ہیں شیخ صاحب کی.... جرنلسٹ لڑکی بتا رہی تھی انٹرویو بھی کر گئی ہے گھر والوں کا....''

جب ہم لوگ واپس لوٹے تو باہر والے برآمدے میں صوفے کے پیچھے بیبیوں کی جوتیوں کے پاس رسولن پڑی تھی۔ اس کا چہرہ سوچ کی سرحدوں سے دور نکل گیا تھا۔ کھانا پکانے والی رسولن کے پاس صفائی والی مارتھا گم سم بیٹھی آتی جاتی بیبیوں کو دیکھ رہی تھی۔

کسی افسوس کرنے والی عورت کو معلوم نہ تھا کہ بیٹے کی جدائی میں دلدوز آواز نکالنے والی رسولن اور اس کا بیٹا کون تھے؟ جب ہم اس کے پاس سے گزرے، اس وقت

رسولن نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا

''محمد بن قاسم اورے کہاں ہے تو.... تجھے رسولؐ کی سوگند.... میرے بیٹے کو آ کر انصاف دلا....''

نہ تو دادی نے ادھر دیکھا نہ تائی جی نے۔ سب شیخ صاحب کے گھرانے سے مرعوب ان کی نیکی کی باتیں کرتی باہر نکل آئیں.... میرے دل میں خیال آیا.... کیا کسی مرحلے پر.... کسی عہد میں بسنتی پگڑیاں پہننے والے، ہاتھ بھر کھنکتے سکے بانٹنے والے نیک لوگ بھی انصاف دلانا بھول گئے تھے؟ کیا انصاف کا گہرا تعلق زوال سے ہے....؟

جمشید ماموں پڑھ پتھر ہیں۔ ان کے کتب خانے میں علم دین کی ایسی نادر کتابیں فارسی میں موجود ہیں جنہیں چھونے پر کاغذ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ ایسے ایسے دینی رسائل اور ان میں اس قدر گنجلک مسائل ہیں کہ آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک بار جمشید ماموں نے مجھے بہ اصرار ایک دینی رسالہ پڑھنے کو دیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ عیسائیت کی اساس محبت ہے اور اسلام کی بنیاد انصاف.... پہلے تو اللہ نے چاہا کہ بنی نوع انسان ایک دوسرے سے محبت کرے، کالے گورے کا امتیاز نہ پالے اور امیر غریب کا تفرقہ نہ ڈالے لیکن پھر اللہ نے انسان کی جبلی حالت دیکھ کر دین کو آسان کر دیا۔ محبت انسان خود بخود اختیار کرنے کا اہل نہ تھا۔ بڑی بڑی محبتوں میں بھی کہیں نہ کہیں نفرت کمپا لگائے بیٹھی رہتی ہے.... اسی لئے اس نے بنی نوع انسان کے لئے آسانی پیدا کر دی کہ بھائی چلو تم میں اس قدر صلاحیت نہیں کہ پڑوسی سے محبت کرو.... کالے کو گورے برابر چاہو تو اب انصاف کرنا.... اور انسانی لین دین میں، معاملات دنیا میں انصاف کو زندگی کا زاویہ قائمہ بنانا.... ہو سکتا ہے کہ میں ہی غلط سمجھی.... عین ممکن ہے کہ دین کی اساس کچھ اور ہو.... پر اس رسالے سے یہی پتہ چلا کہ جنگ میں دشمن سے انصاف کرنے والا فاتح زوال سے آشنا نہیں ہوتا۔ بیویوں میں انصاف سے رہنے والے کو کسی بیوی کی محبت نصیب ہو یا نہ ہو، اس کی ذات میں شکستگی نہیں آتی....

چھوڑیئے سر یہ تو مسئلے مسائل ہیں۔ ان کا حل میرے پاس کہاں!

میں تو بس اس آواز سے ڈرتی ہوں۔ سچ مانیں جب پچھلے پہر رات کو نئی کالونی کی جانب سے ہوا چلتی ہے، احاطے کو پار کر کے حویلی کی تیسری منزل کے رنگین شیشوں پر

دستک دیتی ہے تو میرا دل ہول کھانے لگتا ہے.... میں چپکے سے پلنگ چھوڑتی ہوں۔ تینوں منزلوں میں چوبی صندوق، یخ دان، کشمیری صندوقچے پڑے ہیں۔ ان میں چار پانچ پشتوں سے تلواریں، دو شالے، چاندی کے ظروف، پان دان، بندوقیں، زیبائش اور آرائش کی اَن گنت انمول چیزیں بند ہیں....

کبھی کبھی....

اچانک....

مجھے لگتا ہے کوئی چوبی ٹرنک کھلے گا، اس میں بسنتی ٹوپ اور زرد جینز پہنے کوئی جن برآمد ہو کر مجھ سے فرفر انگریزی بولنے لگے گا.... اور میں اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی خوشی سے قہقہے لگانے لگوں گی....

خاکستری بوڑھا

سارا بازار اچانک آؤٹ آف فوکس ہو گیا۔

کچھ دیر پہلے ہلکی ہلکی بارش پڑی تھی۔ سڑک پر پھسلن تھی۔ آنے جانے والے خریداروں کے چہرے دھلے نظر پڑتے تھے۔ دوکانوں کے آگے قد آدم شیشوں پر پانی کی بوندیں ہولے ہولے نیچے کو لڑھک رہی تھیں۔ عورتوں نے بارش کی وجہ سے چادروں اور دوپٹوں میں جو سر ڈھانپ رکھے تھے، اب وہ بالوں کو اس بندش سے آزاد کرا رہی تھیں۔ مردوں کے بٹوے اور سر کھلے تھے۔ کچھ مرد کہیں کہیں جیب سے ٹشو یا رومال نکال کر عینکیں صاف کرنے میں مشغول اور جوتے پر سے نمی اتارنے کے لئے پرانا رومال تلاش کر رہے تھے۔ بارش نے عارضی طور پر ساری خشک مٹی دھو ڈالی تھی اور بازار چمکنے لگا تھا۔

پھر بھی تنزیلہ کے لئے اچانک سارا منظر آؤٹ آف فوکس ہو گیا۔

لیکن ایک منظر کبھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوتا۔ چرا چرا کر باتیں کرنے والی ساس جو ہر وقت ایسے بولتی جیسے خدا کے رازوں پر اسے ہاٹ لائن مل چکی ہو..... چٹر چٹر سب کچھ کھا جانے والا شوہر جو کھانے کے علاوہ دنیا کی کسی چیز میں دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ نہاری کہاں سے لانا ہے؟ بیسن بغیر تلی ہوئی مچھلی کہاں سے دستیاب ہوتی ہے؟ سری پائے کہاں سے بہترین ملتے ہیں؟ کشمیری چائے کیسے تیار ہوتی ہے؟ نان کلچے کی کیا کیا خوبیاں ہیں؟ اور تو اور اب تو وہ چائینز کھانے، کونٹی نینٹل پکوان، ایرانی کباب کوبیدہ، ترکی پلاؤ کا بھی ایکسپرٹ ہو گیا تھا۔ اس کی دولت ہر سال نئی کار اور ہجوم دوستاں کی دعوتوں کے ناتمام سلسلوں میں خرچ ہوتی۔ دوبئی کی کمائی کے باوجود ابھی تک وہ بھوکا ہی تھا۔

بائیس سال کے بعد آج اچانک بازار، گھر، گھر میں بسنے والے تمام لوگ، حالیہ زندگی ساری آؤٹ آف فوکس ہو گئی.... سامنے عینکوں کی دوکان پر ایک بوڑھا آدمی قریباً سارے کا سارا چسٹر میں دبکا کھڑا تھا۔ اس کی داڑھی گرے، چسٹر ڈارک گرے، سر پر رکھی شکستہ ٹوپی راکھ جیسی اور چسٹر سے نظر آنے والی شلوار بھی بھوسلی ہی تھی۔

تنزیلہ بھاگ کر چار پانچ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ شیشے والے "Push" لکھے بڑے دروازے کو آگے دھکیلا۔ پتہ نہیں کیوں اسے خوف تھا کہ بوڑھا اچانک غائب نہ ہو جائے۔ بیس سال بعد وہ اس کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ بوڑھا کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے عینکوں کے کچھ فریم دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ چوکور فریم اٹھاتا، کبھی گول۔ سرخ و سفید لائنوں والی سویٹر میں ملبوس نوجوان دوکاندار کچھ اکتایا اکتایا سا کہہ رہا تھا —

"اب چن بھی لیں بزرگو۔ سارے نمونے تو آپ کو دکھا دیئے۔"

"کوئی سلیٹی رنگ کا فریم نہیں؟"

"وہ فیشن میں نہیں بزرگو، آج کل۔" دوکاندار نے "بزرگو" ایسے کہا جیسے وہ اسے باسٹرڈ کہہ رہا ہو۔

تنزیلہ نے بوڑھے کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اپنا سر اس کے کندھے سے لگا دیا۔ بوڑھا اس اچانک جپھی پر خوفزدہ ہو گیا۔

"اوہو تم —!"

"جی بالکل میں — اور کون؟"

"اچھا ہوا تم مل گئیں، مجھے عینک کا فریم تلاش کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ یہ نوجوان کہہ رہا تھا کہ اب گرے فریم فیشن میں نہیں رہے۔"

تنزیلہ نے اپنا بازو اس کی کمر میں حمائل کیا اور خاکستری بوڑھے کو کاؤنٹر سے ہٹا کر لیدر سے مڑھے صوفے کی طرف لے گئی۔ دوکاندار ان دونوں کو مصروف پا کر عینکوں کے فریم سمیٹنے لگا۔

"آپ کیسے ہیں؟"

"میں — میں ٹھیک۔ اور تم کیسی ہو؟"

وہ اپنی آنکھوں میں نمی سی محسوس کر رہی تھی۔

"میں بھی ٹھیک ہوں جی —"

"کہاں چلی گئی تھیں تم — امریکہ کہ شارجہ؟ — میں نے کئی لوگوں سے پوچھا پر کوئی ٹھیک طرح سے بتا نہ سکا۔"

"میں جی دوبئی چلی گئی تھی۔ اب پچھلے سال واپس آئے ہیں، بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں۔"

"اچھا اچھا.... بچے.... کتنے ہیں اور کیا کیا کرتے ہیں؟"

"چار ہیں جی۔ دو لڑکے، دو لڑکیاں — لڑکے دونوں لندن میں ہیں.... یہ بھی دوبئی سے آتے جاتے ہیں اور .... میں یہاں رہتی ہوں.... بلکہ میں تو کہیں بھی نہیں رہتی.... کبھی لندن، کبھی دوبئی، کبھی پاکستان۔"

"ہاں کبھی کبھی ایک جگہ بھی رہو تو بھی آدمی کہیں نہیں رہتا — بچیاں کیا کرتی ہیں؟"

"بڑی تو میڈیکل میں ہے اور دوسری نے ابھی ایف ایس سی کیا ہے۔" تنزیلہ نے جواب دیا۔

وہ اپنے دونوں ہاتھ کنگھی بنا کر زانو پر ٹکائے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ خشک تھے، جیسے سردیوں میں بڈھے لوگوں کے ہاتھ کھردرے اور میلے میلے سے لگتے ہیں۔

"اسے بھی ڈاکٹر بناؤ گی۔ ہیں نا—؟"

"جی، اگر نمبر اچھے آ گئے۔ آج کل میرٹ اتنا زیادہ ہے اور وہ ٹیلی وژن چھوڑتی نہیں۔ کیا کروں ڈر لگتا ہے!"

"ہاں ڈرنا ہی چاہیے۔ میں نے اپنے بچوں کے پروفیشن پر توجہ نہیں دی تھی.... بس مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ اچھے پروفیشن میں انسان سکھی رہتا ہے.... کئی مسئلے جنم ہی نہیں لیتے۔"

کوئی چیز تنزیلہ کے گلے میں پھنس گئی۔ اسے لگا ابھی وہ دوکاندار کے سامنے اونچے اونچے رونے لگے گی۔ پھر اس نے اپنی توجہ ہٹانے کے لئے پرس کھولا، اس میں سے ایک ٹیوب نکال کر اپنی ہتھیلی پر کریم نکالی اور بوڑھے کے کنگھی ہاتھوں کو علیحدہ کر کے ان پر کریم ملنے لگی۔

"کریم سے کچھ فرق نہیں پڑتا، یہ پھر ویسے کے ویسے ہو جاتے ہیں۔ فضول ہے کریم شریم۔" بوڑھے نے کہا۔

"آپ باقاعدگی سے لگایا کریں ناں۔ کیوں اتنے کھردرے کر لئے ہیں!" تنزیلہ آنسوؤں بھری آواز میں بولی۔

بوڑھے نے اس بات کا جواب نہ دیا اور اس کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

"اور تیرا وہ کیا کرتا ہے؟"

"فیکٹری ہے جی دوبئ میں.... ٹیکسٹائل کی...."

تنزیلہ نے لحہ بھر کو محسوس کیا کہ اس نے اندر آنے میں بڑی جلدی کی۔ اسے پہلے سوچ کر فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ ماضی سے ملنا کیا عقل مندی ہے.... لیکن آج تک اس نے کوئی کام سوچ کر تو کیا ہی نہ تھا۔ لندن جانا چاہا، لندن چلے گئے۔ دوبئ یاد آیا تو دوبئ روانہ ہو گئے۔ لاہور میں رہنے کو دل چاہا تو لاہور رہ گئے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر لمحے کی زندگی گزارتی تھی۔ اس کے کچھ لمبے چوڑے مستقبل کے پلان نہ ہوتے اور پھر بھی.... پتہ نہیں کیوں اس کی ساری زندگی خود بخود بڑی ہی منظم تھی۔

"آپ کیسے ہیں؟"

"تمہارے سامنے ہوں۔۔ صرف بلڈ پریشر ہے اور موتیا اتر رہا ہے۔۔ نظر ٹھیک نہیں رہی۔ وقت بے وقت چمک پڑتی ہے۔۔ نمبروں والی کالے شیشے کی عینک بنوانا چاہتا ہوں۔"

"بلڈ پریشر کے لئے دوا لیتے ہیں؟"

"ہاں لیتا ہوں باقاعدگی سے.... لیکن کچھ خاص افاقہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر کہتا ہے اس عمر میں ایسے ہی ٹھیک ہے۔"

ڈرتے ڈرتے تنزیلہ نے پوچھا۔۔ "وہ.... آپ شعر لکھا کرتے تھے، وہ؟"

بوڑھا مسکرایا۔ "ہاں۔۔ لکھا کرتا تھا۔ کسی کسی آدمی پر اس کا بھید بہت دیر سے کھلتا ہے۔ میں.... میں سمجھتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں، زمانے نے میری قدر نہ کی۔ اب پتہ چلا کہ میں آدمی بھی اوسط درجے کا تھا اور شاعر بھی درمیانے درجے کا۔ مجھ جیسے

شاعروں پر.... ان کی حقیقت دیر سے کھلتی ہے۔۔ بہت سے ادھورے نامکمل کام کر چکنے کے بعد۔"

"میں ابھی آئی.... آپ یہاں سے جایئے گا نہیں، ایک منٹ میں آئی۔" اس نے کریم کی ٹیوب پر ڈھکنا فٹ کیا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔ دوکاندار اس کی پشمینے کی چادر دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جی۔۔!"

"آپ ان صاحب کو ذرا عینک کی فریمیں دکھائیں اور انہیں جانے نہ دیں، میں ابھی آتی ہوں۔ مہنگی فریم دکھائیں پلیز۔"

"ادھر آ جائیں بزرگو۔۔ کچھ اور فریمیں دیکھ لیں۔"

بوڑھا اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلنے لگا۔ اس کی چال ایسے تھی جیسے کبھی وہ بڑھ رہا ہے، کبھی پیچھے جا رہا ہے۔

شیشے کا دروازہ کھول کر تنزیلہ سیڑھیاں اترنے لگی۔۔ اس نے شکر کیا کہ بوندا باندی پھر جاری ہو گئی تھی اور اس کی گالوں پر بہتے آنسو کچھ اس کے لئے ندامت کا باعث نہ تھے۔۔ سنیک لیدر کا پرس، پشمینے کی چادر، سلک کا جوڑا، اٹالین جوتی، مہنگی عینک، سولے ٹیر کی انگوٹھیاں، مہندی رنگے بال، بلیچ شدہ گلابی بادامی جلد... وہ بازار میں چلنے والی مڈل کلاس عورتوں سے مختلف تھی۔ مرد اسے کنکھیوں سے پلٹ کر، حیران نظروں سے دیکھتے تھے۔ عموماً یہ بات اسے بڑی تقویت دیتی کہ جوان بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اس کا Figure لڑکی کی طرح قائم اور لچک دار تھا۔ وہ توجہ طلب تھی.... لیکن آج اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ عرشی سیڑھی سے گر کر گندے نالے میں گر جائے اور گری رہے۔ بار بار اس کے کانوں میں آواز آ رہی تھی.... تم جیت گئیں تنزیلہ۔ اور جو جیتا سو ہی ہارا۔

وہ پھسلن والی گرے سڑک پر قدم جماتی بازار سے بغلی گلی میں مڑ گئی۔ یہاں اس کا پرانا رفوگر بٹنوں والی دوکان پر کام کرتا تھا۔ براؤن بادامی رنگوں میں لپٹی وہ اس چھوٹی کھوکھے نما دوکان کے آگے جا رکی۔

"آپ کے پاس بٹن ہوں گے، ذرا بڑے....؟"

دوکاندار نے کچھ ڈبے نکال کر پیش کر دیئے۔

"دکھا دیجئے بس!"

کچھ ٹال مٹول اور غور و خوض کے بعد اس نے ایک بٹن تلاش کیا۔

"اب اس کے ساتھ کا دھاگا بھی دے دیجئے۔۔ شکریہ۔"

دوکاندار نے کچھ تردد کے ساتھ میچنگ دھاگہ بھی نکال ڈالا۔

"لگتے تو ایک سے ہیں!۔۔ ایک سوئی کا پتہ بھی دے دیجئے۔"

"یہ لیں، اس میں ہر نمبر کی سوئی ہے۔" دوکاندار نے ایک گول سی پلاسٹک کی سوئی دانی پکڑا دی۔

"شکریہ شکریہ۔۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔" پیسے ادا کرتے ہوئے اس نے رفوگر کے اڈے پر نظر دوڑائی۔ ہر رنگ کی شالیں، جرسیاں، کپڑے، اونی کمبل رفو ہونے کے لئے پڑے تھے۔

"چاچا جی نہیں آئے؟" تنزیلہ نے پوچھا۔

"کہہ رہے تھے آنکھوں کا آپریشن کرانا ہے۔"

"سامان تو بند کر جاتے۔ مٹی پڑ رہی ہے۔"

"بیگم صاحب کئی بار آپریشن کا ارادہ کرتے ہیں اور دوسرے دن آ جاتے ہیں۔ اکیلے آدمی کا حوصلہ نہیں پڑتا آپریشن کے لئے۔۔"

وہ پیسے ادا کر کے واپس عینکوں والی دوکان کی طرف دلکی چال بھاگی۔۔ یکدم اسے لگا جیسے وہ بھی اپنا بڑا قیمتی سامان سربازار کھلا چھوڑ آئی ہے۔۔ تنزیلہ نے دل میں سوچا.... میں بھی کیا احمق ہوں، مجھے کیا اسی وقت بٹن دھاگہ خریدنا تھا؟ میں سوچ سمجھ کر کیوں کام نہیں کر سکتی؟ ہمیشہ سیلاب جذبات میں کیوں بہہ جاتی ہوں؟ پہلے کر چکتی ہوں، بعد ازاں سوچتی ہوں۔ احمق کہیں کی!

اگر انہوں نے نہ سنا ہوا اور وہ چلے گئے تو....؟

بالفرض انہیں کچھ مجبوری ہو اور انتظار ممکن ہی نہ ہو تو....؟

اب میں سارے بازار میں انہیں کہاں ڈھونڈتی پھروں گی۔ پھر ہمیشہ کی طرح تنزیلہ نے منتیں ماننا شروع کر دیں.... ایک دیگ داتا کے دربار.... بیس نفلیں.... دس آدمیوں کا کھانا.... بڑھتے بڑھتے جب اس نے "Push" والا شیشے کا دروازہ کھولا تو سو نفلوں اور دس

دیگوں پر اللہ میاں سے بات چیت ہو چکی تھی۔

ابھی تک وہ بوڑھا کاؤنٹر پر جھکا عینکوں کی فریمیں دیکھنے میں مشغول تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ اب دوکاندار نے چھوٹا سا آئینہ اٹھا رکھا تھا جس میں فریم پہنا چکنے کے بعد شاعر صاحب اپنا چہرہ بھی دیکھتے تھے۔

"ذرا ادھر آ جائیے پلیز...."

وہ کاؤنٹر سے گزر کر ریکسین سے مڑھے صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ سامنے دیوار میں تمام تر آئینے لگے تھے جن کی وجہ سے ایک تو دوکان کشادہ اور دوسرے کاؤنٹر پر جھکا بوڑھا بہت دور لگ رہا تھا۔

"ذرا بیٹھ جائیے۔"

بوڑھا مئودب بچے کی طرح صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں تو سمجھا تم جا چکی ہو۔" بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔

وہی آواز کے زیروبم.... وہی مٹھاس، ملائمت۔۔ وہی جھگڑے فساد کے بغیر لہجہ!

تنزیلہ نے محسوس کیا کہ وہ پھر رونے والی ہے۔

جلدی سے سوئی میں دھاگہ ڈال کر اس نے پرس میں سے اکلوتا بٹن تلاش کیا۔۔ میں بھی کتنی احمق ہوں، ایک بٹن خرید کر لائی۔ اور کیا اگر یہ گم ہو جائے اور کیا عجب بٹن کے چھید بند ہوں اور ہو سکتا ہے سوراخ ٹوٹ گئے ہوں۔۔ لیکن ہمیشہ کی طرح بٹن درست تھا اور عین چسٹر کے رنگ سے میلواں سلیٹی رنگا۔

"یہ آپ کے کوٹ کا بٹن کب سے ٹوٹا ہوا ہے؟"

بوڑھے نے اپنے کوٹ کے کاج والی سائیڈ پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔۔ "اچھا، بٹن ٹوٹا ہوا ہے۔۔؟"

"میں پوچھ رہی تھی کب سے؟"

"جب تم گئی ہو ناں، اس سال میں نے یہ کوٹ لنڈے سے خریدا تھا۔ اس سال بہت سردی پڑی تھی.... میرا خیال ہے تبھی سے یہ بٹن نہیں ہے۔ بیس سال ہو گئے شاید۔"

تنزیلہ کا سر بوڑھے کی گود میں جھکا ہوا تھا اور وہ بٹن کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں

آنسو بھی ٹانک رہی تھی۔

"اور.... اور وہ کہاں ہوتے ہیں پروفیسر صاحب؟" پتہ نہیں یہ سوال کیوں اس کے منہ سے نکلا... اس کا کیا کام تھا پروفیسر صاحب سے۔ اب بیس سال بعد وہ کیوں پوچھ رہی تھی اپنے پہلے شوہر کے متعلق۔

"گھر پر ہی ہوتے ہیں۔ میں اوپر والی منزل پر رہتا ہوں، پہلے کی طرح..... اور وہ نیچے.... ہم ایک ہی گھر میں الگ الگ رہتے ہیں...."

وہ کسی جانور کی طرح اونچی آواز میں رونا چاہتی تھی پر اب آواز، آنسو سب خشک ہو چکے تھے۔

"اور.... اور انہوں نے شادی کر لی.... میرے بعد..... دوسری؟"

بوڑھا ہلکا سا مسکرایا، جیسے تھک چکا ہو-- "شادی؟ شاعر باپ کا پروفیسر بیٹا کیا شادی کرے گا دوبارہ! میں شروع میں اسے کہا کرتا تھا، اب میں نے بھی اصرار چھوڑ دیا ہے۔ کہا کرتا تھا... میں شادی کر کے کیا کروں گا ابا! ایسے ہی کسی اور کو بھی دکھی کر دوں گا۔ بھلا جب میں دنیا کما نہیں سکتا تو دنیاداری میں قدم کیوں رکھوں..... وہ بھی میری طرح بڑا ہی اوسط درجے کا پروفیسر ہے۔ ابھی تک اٹھارویں گریڈ میں ہے۔ اس نے تو موواوور کے لئے بھی کوشش نہیں کی۔"

"پھر.... شام کو کیا کرتے ہیں پروفیسر صاحب؟"

"میں شعر لکھتا ہوں.... وہ ایک کتاب لکھتا ہے انسانی رشتوں پر..... کہتا ہے مکمل ہو گی، تو معرکے کی چیز ہو گی۔ دعا کرتا ہوں اس کا بھید نہ کھلے اس پر۔ کتاب بھی اوسط درجے کی ہو گی۔"

بٹن سے دھاگہ علیحدہ کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کاؤنٹر کی طرف چلنے لگی۔ بوڑھا بھی گرے چسٹر، سلیٹی ڈاڑھی کو لے کر اس کے پیچھے پیچھے آگیا۔

"مجھے دکھائیں آپ کو کون سی فریم پسند آئی!؟"

بوڑھے نے ایک گرے رنگ کی فریم اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

تنزیلہ نے فریم دیکھ کر دوکاندار سے پوچھا "یہ کتنے کی ہے؟"

"ڈھائی ہزار کی جی۔"

"کتنے کی؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"ڈھائی ہزار کی سر-- بیگم صاحبہ کہہ گئی تھیں مہنگی فریمیں دکھاؤں۔"

"آپ پیک کر دیجئے۔"

تنزیلہ نے پرس کھول کر ڈھائی ہزار کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ یکدم اسے اپنے کندھے پر ایک ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔

"ناں بھئی.... میں شاعر آدمی، مجھ سے کسی چیز کی رکھوالی نہیں ہوتی-- بس تم کوئی دو ڈھائی سو کی رینج میں فریم نکالو بھائی۔ میں تو کبھی مہنگی چیزیں اپنے گھر میں نہیں رکھ سکا۔" بوڑھے نے تنزیلہ پر نظر ڈال کر کہا۔

"یہ کون سی مہنگی ہے اباجی۔ آپ پلیز رکھ لیں-- پلیز۔"

"لے بھول گئی اتنی جلدی اپنے سسر کو..... بھائی وہی نکال دو کالی فریم جو پہلے میں نے چنی تھی۔ شاباش، وہی ٹھیک ہے--"

بڑا ناخوش چہرہ بنا کر دوکاندار نے کاؤنٹر سے نیچے لگی ہوئی فریموں میں سے ایک کالی فریم نکال کر عینک کے کیس میں بند کی۔

تنزیلہ بولنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس نے اپنے پرس سے ڈھائی سو نکال کر کاؤنٹر پر رکھے تو بوڑھے نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ناں بھئی... ابھی تمہارے بوڑھے سسر کو پنشن ملتی ہے-- شاید اب مجھے سسر کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے پروفیسر صاحب بھی مدد کرتے ہیں۔ ابھی نہیں، کبھی تمہارے پاس دوبئی آؤں گا وہاں مجھے خرید کر دینا۔ عینک کا فریم.... شائد اب مجھے سسر کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ گم صم کھڑی رہی۔

عینک کی فریم لے کر بوڑھا دو قدم چلا اور پھر اس کے قریب آ کر بولا-- "اچھا تنزیلہ... یہ تو میں پوچھنا بھول گیا.... تم لوگ.... اکیلے رہتے ہو دوبئی میں کہ....."

"ان کی اماں ساتھ رہتی ہیں۔"

"اور.... اور سسر نہیں ہے....؟ بڈھا بابا.... تم سے جھگڑنے والا.... تم سے محبت کرنے والا؟"

"نہیں جی، بائیس سال ہوئے میرے شوہر کا باپ مر گیا تھا.... میں نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں، حالیہ سسر کو۔ شادی سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔" وہ کہنا چاہتی تھی پہلا شوہر رہے نہ رہے، کوئی سسر کو تھوڑی بھولتا ہے کبھی — لیکن بغیر خدا حافظ کہے، وہ دوکان چھوڑ گئی — اچانک بارش پھر زور سے ہونے لگی تھی!

موسمِ سرما میں نیلی چڑیا کی موت

اس وقت مرتضیٰ کی عمر صرف نو سال تھی۔

وہ فطرت کے حکم کے مطابق بڑھ رہا تھا۔ اسے کسی قسم کے ہیومن رائٹس کا شعور نہ تھا۔ ابھی اسے علم نہ تھا کہ فطرت کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جنہیں پامال نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی تو مرتضیٰ صرف بڑھ رہا تھا..... قد میں..... عمر میں..... اور تھوڑا بہت شعور میں۔

پہاڑ کے ساتھ ساتھ اترنے والی سڑک پر ڈھائی میل دور مرتضیٰ کا سکول تھا۔ اس پہاڑ پر چیڑھ، سلور اوک، بیچ، کیتھ اور بن کے بے شمار درخت تھے۔ اس کے خوبصورت گھر اور سرکاری سکول تک سڑک کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے پانی سے لدی ڈھائی فٹ گہری کول کن من چلتی رہتی تھی۔ اسی سڑک پر جب وہ بستہ لٹکائے سکول جاتا تو عموماً اسے گورکھا پلٹنوں سے لدے ٹرک چڑھائی چڑھتے، زور لگاتے ہونکتے نظر آتے۔ بہار کے ادھ کھلے موسم میں کبھی کبھی آدھے راستے میں اس کے ساتھ ایک نیلی چڑیا ہو لیتی۔ پتہ نہیں وہ کہاں سے اس کا تعاقب کرتی، آسمان پر منڈلاتی رہتی۔ اگر وہ پیچھے رہ جاتا تو وہ راستے کے پتھروں پر گم سم اس کی راہ تکتی رہتی۔ سکول سے ایک فرلانگ پہلے کول سے ورے جنگلی سٹرابیری کے بوٹوں سے ملحق بانس کے لچک دار جھنڈ تھے۔ اسی تختے میں نیلی چڑیا چرتی چگتی اور پھر کبھی بانسوں پر جھولنے لگتی۔ بہار کے ختم ہوتے ہی نیلی چڑیا کا سفر ختم ہو جاتا۔ وہ نیلے آسمان میں چھپ جاتی —— لیکن مرتضیٰ اسے تمام موسموں میں تلاش کرتا رہتا۔

جب وہ گیارہ برس سے کچھ ہی بڑا ہوا تو سردی کا موسم بڑی شدت سے آیا۔ سارا

دن برف ہوا میں پھوئی پھوئی اڑتی رہتی۔ چیڑھ، سلور اوک، بیچ، کیتھ اور بن کے درخت برف سے لدے سہمے رہتے۔ وہ ہمیشہ کی طرح اونی ٹوپی میں سے آنکھیں اور ناک نکالے، گلے کو سرخ مفلر میں لپیٹے سکول جا رہا تھا۔ کول کا پانی تہہ میں تھا اور برف کے باعث اوجھل تھا۔ سٹرابیری کے تختے پر ساری سفیدی تھی اور اس تازہ برف میں ایک نیلا دھبہ پراسرار انداز میں غائب ہو جانے کو تھا۔ وہ کول پھلانگ کر پاس پہنچا۔ نیلی چڑیا مردہ حالت میں پڑی تھی اور پھوئی پھوئی برف اس کے وجود کو بے وجود کرنے میں مشغول تھی۔ مرتضیٰ نے کئی بار گوروں کے قبرستان میں دیکھا تھا کہ جب کوئی گورا فوجی مر جاتا تو مقامی لوگ بھی سر سے ٹوپیاں اتار کر اسے لحد میں اتارتے۔

مرتضیٰ نے سر سے ٹوپی اتار کر چڑیا کو اٹھایا۔ وہ حیران تھا کہ چڑیا کے سارے پنکھ گہرے براؤن، سفید یا سیاہ تھے۔ بھلا جب کوئی بھی پر نیلا نہ تھا تو چڑیا اسے نیلی کیوں نظر آتی رہی؟ وہ صرف گیارہ برس کا تھا، اسی لیے اس کا یہی جی چاہا کہ چڑیا کی جگہ وہ خود مر گیا ہوتا۔ ابھی وہ سوچ میں یہیں تک پہنچ پایا تھا کہ کبھی کبھی خواہش کی موت کے ساتھ انسان خود بھی موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

موت کے ساتھ اس کا یہ پہلا دست پنجہ تھا!

اس دکھ کی اسے سمجھ نہ آئی۔ اس کھوکھلے پن کا اس کی ذات سے تعلق تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ اسے یہ بھی شعور نہ تھا کہ موت ہیومن رائٹس کی Violation کرنے میں سرفہرست تھی۔ اسے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ نیلے پروں کو نیلا نہ پا کر جو آگہی اس میں جاگی تھی، اس نے عمر میں اسے کتنا بڑا کر دیا تھا۔ خواب سے حقیقت تک پہنچنے کا غم..... آگہی کا دریچہ اچانک کھل جانے کا احساس..... ایسی سمت کا محبوب سفر جہاں آدمی سمجھ بوجھ سے کام لے بھی تو کچھ سمجھ نہیں سکتا۔

سٹیٹ وسکانسن کے شہر میڈیسن میں مرتضیٰ ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے وظیفے کا زیادہ حصہ کرائے میں نکل جاتا۔ طالب علموں کے لیے مخصوص ایگل ہائٹس سیریز کے یہ تمام فلیٹ ہم شکل تھے۔ امریکہ میں طالب علم عموماً مفلوک الحال ہوتا ہے۔ ایک سمسٹر یونیورسٹی میں کام کر کے فیس کے لیے پیسے جوڑتا ہے اور دوسرے سمسٹر میں پڑھتا ہے۔ ایسی کٹھن مشقت میں کئی طالب علموں کا ہاتھ پڑھائی کی مٹھی سے

چھوٹ بھی جاتا ہے۔

لیکن مرتضیٰ کا حال اپنے بلاک کے شاگردوں سے بہتر تھا۔ اس کے والد ہر ماہ اسے چھ سو ڈالر بھیجتے جن سے وہ وقتاً فوقتاً ایوا کی ضرورتیں بھی پوری کر دیتا۔ ایوا مائیکرو بائیالوجی میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ وہ آئرش تھی لیکن اس کا مزاج آئرش نہ تھا۔ مرتضیٰ پاکستانی تھا، لیکن اس میں وہ خوش مزاجی نہ تھی جو پاکستانی لوگوں کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے۔ ایوا اور مرتضیٰ ایگل ہائٹس کے تیسرے بلاک میں پڑوسی تھے۔ ان کی ریسرچ سانجھی تھی اور وہ ایک ہی سپروائیزر کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ اکٹھے پڑھنے جاتے۔ لائبریری میں بھی ساتھ رہتا۔ یونین کی کنٹین پر جانا ہوتا تو وہ ایک دوسرے کو تلاش کر لیتے۔ مرتضیٰ کو ایوا کی دو باتیں متاثر کر گئیں..... گہری نیلی آنکھیں اور خاموشی کے لمبے لمبے وقفے — وسکانسن یونیورسٹی میں اس جیسی سنجیدہ لڑکی اور کوئی نہ تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایوا سٹریل تھی یا وہ اچھے مزاج کو نہ سمجھتی تھی..... بس اس میں ایک ٹھہراؤ ایسا تھا جسے کوئی گفتگو سے ہلچل میں بدل نہ سکتا۔

مرتضیٰ سفید فام لوگوں کی طرح جاذب نظر، دراز قد اور معصوم نظر آتا۔ ایوا کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ لوگوں پر جلدی سے اعتماد نہ کرتی۔ مرتضیٰ بھی ہو ہو ہی کا بندہ نہ تھا۔ وہ ایوا سے بھی زیادہ الگ تھلگ رہنے پر مصر رہتا۔ یہی بات ان دونوں میں قرب کا باعث بنی۔ وہ دونوں کنٹین سے نکل کر جھیل کنارے جا کر بنچ پر بیٹھ جاتے اور سینڈ ویچز کھاتے رہتے۔ دونوں ایک دوسرے کی زندگی کے بارے میں کرید نہیں رکھتے تھے۔ اگر باتیں اٹھتی بھی رہتیں تو عموماً ان کا رخ ریسرچ کی طرف مڑ جاتا..... فلاں کیمیکل کس رد عمل کا باعث ہو گا اور کیا Catalyst کا کام دے سکے گا؟ مائیکرو سکوپ تلے جو کچھ نظر آتا ہے، کیا اس کی دریافت دونوں کے اندازے کے مطابق درست ہے؟ کیا جینٹک انجینئرنگ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ انسان ابھی تک اچھے اور برے میں واضح حد فاصل قائم نہیں کر سکا تو کیا انسانی ساخت میں تبدیلیاں لا کر وہ کسی نئے عذاب کا شکار تو نہیں ہو جائے گا؟ فطرت کے خلاف سازش کرنے کی کوشش کہاں تک ہونی چاہیے؟ — وہ عام طور پر ایسی ہی باتیں کرتے رہتے جیسے پانیوں سے گھرا جزیرہ لہروں سے کیا کرتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی جب کوئی تہوار ہوتا، Thanks giving یا لیبر ڈے آتا تو اچانک

ایوا اور مرتضیٰ قدرے قریب آ جاتے۔ وہ ہر تہوار کے دن کیپٹل کی عمارت دیکھنے جاتے اور پھر وہیں کہیں بیٹھ کر زیادہ پرسنل باتیں کرنے لگتے۔ مرتضیٰ کو آئرش moss کا سوپ کچھ زیادہ پسند نہ تھا لیکن اس روز وہ ایوا کے گھر یہ سوپ پینے ضرور جاتا۔ پھر ایوا اسے اپنے گھر کی، اپنے فوک لور کی باتیں سنانے لگتی۔ "ہماری کہانیوں میں ایک کردار سدھی ہوتا ہے۔ اسے ہم لوگ پری سمجھتے ہیں۔ ماڈرن کہانیوں میں بھی سدھی کا کردار رائج ہے — مرتضیٰ! کیا تمہارا یقین ہے کہ پریاں ہوتی ہیں — اچھی اور بری پریاں؟"

مرتضیٰ کہنا چاہتا کہ جب سے اس نے ایوا کو دیکھا تھا، وہ اچھی پریوں پر اعتماد کرنے لگا تھا لیکن..... اسے ایسے اعتراف کرنے سے پتہ نہیں کیوں خوف آتا!

آئرش کائی کا سوپ پیتے ہوئے ایوا سوال کرتی — "تم مجھے اپنے ملک پاکستان کے بارے میں بتاؤ مرتضیٰ..... اپنے لوگوں کی باتیں..... میں اجنبی کلچر کے لوگوں میں دلچسپی رکھتی ہوں —"

مرتضیٰ سوچ میں پڑ جاتا۔ وہ سوچنے لگتا بات کہاں سے شروع کروں! وہ کہنا چاہتا کہ جب وہ گیارہ برس کا تھا تو وہ ایک نیلی چڑیا سے متعارف ہوا۔ پھر وہ پہاڑ چھوڑ کر لاہور چلا گیا اور وہاں کے چکروں میں تعلیم حاصل کر کے وسکانسن پہنچ گیا.....

اسے سمجھ نہ آتی کہ ایوا کو کیسے بتائے کہ نیلی چڑیا کا کوئی پر نیلا نہ تھا۔ حقیقت اور خیال کے فاصلوں کی تو کوئی سرحد ہی نہ تھی۔ پھر ایوا اس کی بات کیونکر سمجھ سکتی تھی؟ — وہ ایوا کو کیسے بتاتا کہ خیال حقیقت سے بھی زیادہ موثر ہو سکتا ہے۔ وہ جو سارا دن لیبارٹری میں گزارتی تھی، وہ کیسے اس کی بات سمجھ پائے گی؟

وہ کوئی ایسی منفرد شخصیت نہ تھا۔ اس کا گھرانہ بھی معمولی لوگوں کا چھوٹا سا گروہ تھا جن کی زندگیاں سادہ، خیال معمولی اور طبیعتیں درمیانی سی تھیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق وہ کیا کہانیاں بیان کرتا۔ ایسے لوگ سائیکلوں پر آتے جاتے، باتیں کرتے، لنڈے کے سویٹر اور پشاوری چپلیں پہنے گپ چپ سڑکوں پر اپنی راہ لگے نظر آتے ہیں۔ لاہور آ کر صرف اس نے اپنے چہرے پر ڈاڑھی کا اضافہ کر لیا۔ ایک جوان آدمی کے چہرے پر ڈاڑھی کا اضافہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی کیونکہ ایسے لوگوں کی بھی لاہور میں کمی نہ تھی۔

کرسمس سے کچھ دن پہلے وہ دونوں بازار سے چھوٹا سا کرسمس ٹری خرید کر لوٹے

تو ایوا پر آنے والے تہوار کا اثر تھا۔ اس نے درخت کو قالین پر ٹکاتے ہوئے کہا — "پتہ ہے مرتضیٰ، جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو میرے دل میں ایک خیال آیا تھا — "

"جب میں نے تمہیں کلاس میں گھستے دیکھا تو میں نے بھی سوچا تھا کہ....."

"کیا — ؟" ایوا نے پوچھا۔

"میں یہ سوچتا تھا کہ تم مذہب کی کوئی پروا نہیں کرتیں — لیکن جس طرح تم نے کرسمس ٹری خریدنے میں وقت لگایا ہے — اس سے تو کچھ اور ثابت ہوتا ہے۔"

"پتہ ہے مرتضیٰ — ہمارا آئرلینڈ تو بڑا ہی holy ملک ہے۔ وہاں تو اتنے saints اور holyman ہوئے ہیں، پھر ہمارا لٹریچر ایسا ہے کہ اگر ہم بے دین بھی ہو جائیں تو بھی ہمارے Genes میں عیسائیت رہے گی..... یہ ہمارے لہو کا ورثہ ہے، ہمارے لٹریچر کی دین ہے۔" ایوا بولی۔

"اور تم نے کیا سوچا تھا میرے متعلق — ہیں ایوا — کیا؟" مرتضیٰ نے سوال کیا۔

"تمہارے متعلق — دیکھو مرتضیٰ تم اگر نہ پوچھو تو مہربانی — "

"تم اگر بتا دو تو اور مہربانی ہوگی۔ میں اس قدر وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہاری بات مائنڈ نہیں کروں گا۔"

"جب ہم کسی مسلمان کو دیکھتے ہیں..... تو Crusades کی یاد تازہ ہو جاتی ہے..... ہم نے ڈاڑھی والے مسلمانوں کے متعلق ایک خیالی تصویر بنا رکھی ہے۔ مرتضیٰ! ہمیں لگتا ہے یہ لوگ سخت دل، تلوار پسند اور بے انصاف ہوتے ہیں۔ انہیں نہ عورتوں پر ترس آتا ہے نہ دوسرے مذاہب کے لوگوں پر — ڈاڑھی والا مسلمان تشدد پسند ہوتا ہے۔" مرتضیٰ کے دل میں ہلکا سا خوف ابھرا کہ ایوا ساری روشن خیالی کے باوجود خیال کو حقیقت پر ترجیح دے گی۔

"تم تو بہت سائنسی انداز میں سوچتی ہو ایوا..... سارا ڈیٹا لیبارٹری میں لے جاتی ہو — پھر تم نے اس مفروضے پر کیسے اعتبار کر لیا کہ ڈاڑھی والا مسلمان تشدد پسند، شقی القلب ہوتا ہے؟ — کسی ڈاڑھی والے مسلمان کو لیبارٹری میں لے جانا تھا۔"

"اسی لیے تو میں نے تمہیں قریب سے دیکھنا چاہا کہ..... کہ مرتضیٰ اسی لیے تو میں

جاننا چاہتی تھی کہ میرے تعصب اور سچائی میں کتنا بعد ہے — خیال حقیقت سے کتنے فاصلے پر ہے۔" ایوا بولی۔

"پھر کچھ فرق پایا — ؟"

"کسی روز بتاؤں گی — ابھی نہیں — ابھی تمہاری باری ہے۔ تم مجھے بتاؤ ناں تم لاہور میں کیا کرتے تھے؟ — کیسے رہتے تھے؟ کیا تمہارے گھرانے کے تمام لوگ ڈاڑھیاں رکھتے ہیں؟ مجھے میری نانی بتایا کرتی تھی کہ صلاح الدین ایوبی کی فوج کے لوگ اپنی ڈاڑھیاں دانتوں میں دبا کر اس طرح حملہ کرتے تھے کہ ان کے چہرے پر شیطان ابھر آتا تھا۔"

کہنے کو تو ایوا یہ کہہ گئی لیکن ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے بڑی احمقانہ بات کہہ دی ہے۔ جلدی سے اس نے مرتضیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہا — "آئی ایم سوری..... پلیز مرتضیٰ آج کچھ مائنڈ نہ کرنا، کرسمس ہے — پلیز..."

"میں تو کبھی بھی کچھ مائنڈ نہیں کرتا — نہ تمہاری کوئی بات نہ تمہارے کسی اور سفید فام کی — مالکوں کی بات کا غصہ کیا!"

ایوا نے مرتضیٰ کے ہاتھ پر اپنا چھوٹا سا ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا — "مرتضیٰ! تمہارا رنگ تو مجھ سے بھی سفید ہے — مجھے سمجھ نہیں آتی کہ پھر ایسا کیوں ہے..... تم ہم لوگوں سے علیحدہ کیوں ہو؟"

مرتضیٰ کچھ نہ بولا اور ایوا کے وہ تحفے پیک کرنے لگا جو وہ شام کی پارٹی پر اپنے ہم جماعتوں کو دینا چاہتی تھی۔ ایوا باورچی خانے میں کھٹر پٹر کرنے میں مصروف ہو گئی۔ خوبصورت پیکنگ پیپر، سلوفین ٹیپ اور قینچی لے کر مرتضیٰ کھانے کی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ اپنی زندگی کو خود اچھی طرح نہ سمجھتا تھا، پھر وہ ایوا کو اپنے بارے میں کیا بتاتا..... وہ سلجھا سلجھا، خاموش طبع، وقت کا پابند، سچ پر کاربند، ریگولر عادتوں والا، تھوڑے پر گزارہ کرنے والا شخص تھا۔ یہ ساری باتیں ایوا یا تو پہلے سے سمجھتی تھی یا اس کو بتانی آسان نہ تھیں..... اس کے لیے اللہ اور اس کا رسولؐ خیال اور حقیقت دونوں کا سچ تھا۔"

جس طرح وسکانسن یونیورسٹی میں اسے ایوا مل گئی، اسی طرح گورنمنٹ کالج لاہور میں وہ ایک بڑے فیشن ایبل گروپ میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے کلاس فیلو ثمینہ، سارا،

علی اور حامد اسے ہر وقت ساتھ لیے پھرتے۔ چھوٹے چھوٹے تحفے پیک کرتا ہوا وہ سوچنے لگا کہ کیا اس کے متعلق اس کے ساتھی امیرزادوں کے دل میں بھی شکوک تھے؟ کیا یونیورسٹی میں ایوا کے لیے میں نظر بٹو ہوں؟ کیا مرتضیٰ کو اپنے گروپ میں ملا کر ان کو احساس کمتری ہوتا تھا؟

باورچی خانے میں کچھ انڈے پھینٹتے ہوئے ایوا نے پھر پوچھا — "بتاؤ ناں مرتضیٰ! اپنے دوستوں کے بارے میں، اپنے کنٹری کے متعلق — تم تو مجھ سے بھی زیادہ گونگے ہو — میری نانی تم سے ملیں تو کہیں کہ اسے کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ میری نانی کا خیال ہے کہ میں بیمار ہوں نفسیاتی طور پر — کیا میں ہوں؟ —" اس نے باورچی خانے سے آواز دی لیکن مرتضیٰ سن نہیں رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہاں سے شروع کرے!

ثمینہ، سارا، علی اور حامد..... وہ چاروں اس سے بہت مختلف تھے۔ وہ اپنی اپنی کار پر جدید لباسوں میں ملبوس فرفر انگریزیاں بولتے اور زبردست بحثیں کرتے ملتے تھے۔ انہیں احساس کمتری اور غریبی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ ان سب کے ساتھ ایک چھتری کی طرح بے حد غیر ضروری لیکن محتاط ضرورت کے تحت رہا کرتا۔

اس روز سارا اپنی سالگرہ کیفے ٹیریا میں منا رہی تھی اور مرتضیٰ زیر بحث تھا۔

"دیکھئے مرتضیٰ، آپ پلیز ہماری بات سمجھیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آپ بہت نائیس آدمی ہیں لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری ٹریننگ ایسی ہوئی ہے کہ ہم اس چیز کو discard کر دیتے ہیں، جو ہمارے کام کی نہیں ہوتی — ہم اپنی الماری اور کمرے میں Useless سامان نہیں رکھتے۔" سارا نے کہا۔

"ہمارے نزدیک سلفش ہونا ضروری ہے — ہم جب سلفش ہوتے ہیں تو ہم اسے کوئی disqualification نہیں سمجھتے بلکہ اسے wisdom سمجھتے ہیں۔ سلفش ہونے سے وقت بچتا ہے..... اپنا بھی اور دوسرے کا بھی — سلفش آدمی ہمیشہ سچ بولتا ہے اور یہ بڑی خوبی ہے..... مروت ہمیں موت لگتی ہے۔" ثمینہ بولی۔

مرتضیٰ ثمینہ کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"ثمینہ! تم ذرا خاموش ہی رہو۔ دیکھیے مرتضیٰ — ہم سب آپ کو بہت پسند

کرتے ہیں۔ آپ ضرورت سے زیادہ نائیس ہیں — ہم آپ کو کچھ پے بیک کرنا چاہتے ہیں۔" سارا نے ہولے سے کہا۔

"پے بیک — لیکن کیوں؟"

وہ ایک سادہ سے گھرانے کا فرد تھا۔ اسلامی قدروں نے اسے انسانوں کی قدر کرنا سکھایا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پے بیک کرنے سے انسانی رشتوں کی تذلیل ہو جاتی ہے۔

سارا نے ہونٹوں کو چورس شکل دے کر کہا "دیکھئے مرتضیٰ، ہم سب جانتے ہیں کہ کلاس میں آپ سب سے زیادہ methodical ہیں۔ آپ کی فرسٹ ڈویژن آئے گی اور آپ ہم سب کی..... خوب مدد بھی کریں گے — لیکن یہ..... یہ کافی نہیں — یعنی ٹاپ کرنا — مدد کرنا کافی نہیں —"

"پھر کیا کافی ہے —؟" چپ کرانے کے انداز میں حامد کھنگارا۔

"آپ اگر مائنڈ نہ کریں پلیز ہم سب آپ کے لیے Concerned ہیں..... ہمیں لگتا ہے آپ لائف میں کامیاب نہیں ہوں گے — یعنی اس طرح جیسے آپ ہیں" — سارا بولی۔

"کیوں —؟" — مرتضیٰ نے نظریں جھکا کر پوچھا۔

"اوہ پلیز آپ ہماری طرف دیکھ کر تو بات کیا کریں — ہر وقت نظر نیچی — نظر نیچی..... آپ بہت ہی foolishly اولڈ فیشنڈ ہیں۔"

مرتضیٰ نے کہنا چاہا کہ اس کا حکم نہیں — اس کا باپ کہا کرتا تھا..... بیٹا مناظرے میں شامل نہیں ہونا، قلب سیاہ ہو جاتا ہے..... وہ ٹھیک سے باپ کی بات سمجھتا تو نہ تھا لیکن عمل پھر بھی کرتا ہی رہتا۔

"تمہاری ٹربل یہ ہے مرتضیٰ بھائی..... پلیز ڈونٹ مائنڈ — آپ حکموں کے چکر میں ہیں۔ کچھ حکم آپ کے پرانے رجعت پسند والدین نے دے رکھے ہیں، کچھ احکامات آپ کو مذہب سے مل گئے ہیں، کچھ آپ ٹیچرز کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ ہمیں ہمارے والدین نے اپنی judgement پر اعتبار کرنا سکھایا ہے۔ آپ کو پتہ ہے مرتضیٰ بھائی، ہر جنریشن اپنے حکم خود لاگو کرتی ہے..... اپنی ویلیوز خود بناتی ہے۔"

"لیکن — کچھ..... احکامات تو....." مرتضیٰ منمنایا۔

علی کو مرتضیٰ پر بہت پیار آ رہا تھا..... جب کبھی کوئی شخص شرمندہ ہو کر اپنا دفاع خود نہ کرسکتا، علی کی رگ حمیت جاگ اٹھتی۔ بچپن میں وہ چھوٹے چھوٹے کتوں سے بہت کھیلا تھا، اس وقت اسے مرتضیٰ بھی چھوٹا سا پلا لگ رہا تھا.... "دیکھئے مرتضیٰ بھائی، ہم سب آپ کا بہت regard کرتے ہیں۔ ہم آپ کے Well-wisher ہیں۔ لیکن آپ میں، ہم میں ایک فرق ہے — " علی نے کہا۔

"فرق! کیسا فرق؟ کیا ہم سب ہم مذہب، ہم وطن، ہم جماعت نہیں؟" مرتضیٰ قدرے چڑ کر بولا۔

"ہیں.... ہیں، پورے کے پورے ہیں لیکن آپ میں ہم میں ایک بنیادی فرق آزادی کا ہے۔"

"کیا ہم سب ایک آزاد ملک کے آزاد باشندے نہیں؟" مرتضیٰ نے پھر سوال کیا۔

"مرتضیٰ بھائی سنئے! سارا، ثمینہ، حامد اور میں آزاد ہیں۔ اپنے ہر عمل میں ہم اپنی پسند، ناپسند کی بنا پر فیصلے کرتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے سزا و جزا تو اعمال کی ہی ملتی ہے لیکن انسان مکمل طور پر وہیل کو ہاتھ میں لے کر نہیں چلتا — نتائج پر وہ حاوی نہیں — کیا میں آپ کو صحیح سمجھا ہوں؟"

"اوہ چھوڑو، کن چکروں میں پڑ گئے ہو — سنئے مرتضیٰ صاحب! جس طرح آپ باقی احکامات مانتے ہیں، کیا آپ ہمارا حکم مان لیں گے ایک؟" ثمینہ بولی۔

"جی ضرور مان لوں گا — بشرطیکہ وہ بات ماننے والی ہوئی۔"

"اور وہ جو ساری باتیں آپ مانتے پھرتے ہیں، کیا بیسویں صدی میں لوگ ایسی باتیں مانتے ہیں؟"

"جی — ؟"

"دیکھئے آج کل جمہوریت پر سب کا ایمان ہے — ہم چاروں ایک طرف ہیں اور آپ ایک طرف — "

"یہ تو پوچھ لو سارا کہ ان کا جمہوریت پر بھی ایمان ہے کہ نہیں — " حامد نے کہا۔

"یقیناً میں جمہوریت کو بہتر نظام سمجھتا ہوں لیکن کبھی کبھی سقراط سارے شہر میں

اکیلا بھی ہوتا ہے اور سچا بھی۔"

چاروں چوروں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر دیر بعد ثمینہ بولی — "بات یہ ہے مرتضیٰ کہ میں اور میرے ساتھی آپ کے ساتھ بحث میں جیت نہیں سکتے، ہماری چھوٹی سی خواہش ہے کہ آپ اس طرح ڈریس ہونا چھوڑ دیں — یہ بات نہیں کہ ہمیں آپ کے لباس پر کوئی اعتراض ہے، صرف آپ بہت odd لگتے ہیں ہمارے گروپ میں — ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہم جیسے لگیں — "

کچھ قمیضیں اور جینز انہوں نے پتہ نہیں کہاں سے برآمد کرکے مرتضیٰ کے آگے رکھ دیں۔

"پلیز آپ ٹرائی کریں، آپ بہت کمفرٹیبل محسوس کریں گے — آخر میں دنیا میں یونی کلچر رہ جائے گا۔ یہ جو آپ کو رنگا رنگ کلچر نظر آ رہے ہیں، سب ختم ہو جائیں گے۔" حامد نے لجاجت سے کہا۔

ثمینہ جمپ کرکے بات کرنے کی عادی تھی، درمیان میں کود کر بولی — "پتہ ہے اس لباس میں اس ڈاڑھی کے ساتھ آپ کیا لگتے ہیں؟ — "

"ہاں کیا؟ — "

"رجعت پسند — Terrorist.... بنیاد پرست.... Ethnocentric — کٹر..... نیشنلسٹ — " یکدم چاروں کو احساس ہوا کہ ثمینہ بہت دور نکل گئی ہے۔

سب نے مکے میز پر بجا بجا کر کہا — "شیم..... شیم.... شیم آن یو ثمینہ!"

مرتضیٰ کو ان سب کی نیت پر شبہ نہیں تھا بلکہ کسی حد تک وہ ان لوگوں کے احسان تلے تھا جو اپنے لبرل خیالات کی وجہ سے اسے انگلی لگائے پھرتے تھے۔

"آپ لوگ تکلف سے کام نہ لیں۔ میں واقعی بنیاد پرست ہوں لیکن آج تک یہ بات میری راہ میں حائل نہیں ہوئی۔"

"حائل کیوں نہیں، یہی تو آپ کی راہ کا روڑا ہے۔ شراب کی محفل میں آپ ہائی انسپڈ مائٹی بن کر شراب نہیں پیتے۔ مکسڈ کمپنی میں آپ کی نظریں نیچی رہتی ہیں۔ نہ آپ خود انجوائے کرتے ہیں نہ کسی کو کرنے دیتے ہیں۔ آپ جب باہر جائیں گے، وہاں آپ کو حرام حلال کا چکر رہے گا — ہوائی سفر میں آپ شرعی کھانا مانگیں گے — "

"لیکن میں کسی کو روکتا تو نہیں..... ہر انسان کو آزادی ہے — وہ اپنے خیال کا پابند ہو..... مجھے اپنی سوچ پر چلنے دے۔"

"پتہ ہے بنیاد پرست کون ہوتا ہے —" سارا نے نظریں اس پر جما کر کہا۔

"جی فرمائیں؟ —"

"جو ساری ٹھیک ٹھیک باتیں بے حد سختی سے کہتا ہے..... کوئی اس کے ہوتے ہوئے کچھ انجوائے نہیں کرتا..... جس کی کمپنی میں لبرل آدمی آزاد نہیں رہتا۔ آپ رہیں احکامات کے پابند..... لیکن صرف اپنا ڈریس، اپنا سٹائل بدل لیں — ہم سب آپ کے ساتھ کمفرٹیبل محسوس کریں گے....."

وہ چاروں کا منہ حیرانی سے تکنے لگا۔ اسے احساس ہی نہ تھا کہ وہ جو اپنے دفاع میں اس قدر کمزور محسوس کرتا ہے، کسی کے لیے مشکلات بھی پیدا کرسکتا ہے!

علی کو پھر مرتضٰی کی شکل پر ترس آنے لگا — "دیکھیے مرتضٰی بھائی! بات صرف آپ کی نہیں ہے، سارے تھرڈ ورلڈ کی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ان ملکوں کی جہاں اسلام ہے..... مسلم ورلڈ ایک چوائس کے دہانے پر آگئی ہے۔ تھرڈ ورلڈ میں جو ملک مسلمان نہیں اور وسائل رکھتے ہیں، وہ اس چوائس کا شکار نہیں ہیں..... لیکن جو ممالک اسلام پر بھی چلنا چاہتے ہیں اور ترقی کے بھی خواہاں ہیں، انھیں بڑی مشکل درپیش ہے..... جو اپنے کلچر کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے اور اپنی زبان سے بھی محبت رکھتے ہیں، ان کے لیے بڑی hardship ہے اور بڑی مشکل چوائس ہے —"

"کیا تم اپنے پوائنٹ کی وضاحت کرسکتے ہو علی — ؟" ثمینہ نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

علی نے لجاجت سے مرتضٰی کی طرف دیکھا اور رک رک کر کہا "مرتضٰی بھائی! مذہب کا مطالعہ میرا ایسا ویسا ہی ہے لیکن میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ ترقی تو مذہب بھی چاہتا ہے..... مذہب کی بھی آرزو ہے کہ ماحولیات، افلاس اور بیماری کے ساتھ انسان کو Cope کرنا آجائے اور سائنس بھی ان ہی کے ساتھ Combat کررہی ہے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جب آدمی تیزی سے..... جیسا کہ مسلم ورلڈ کے لوگ چاہتے ہیں..... ترقی کرنا چاہتا ہے تو پھر اسلامی قدریں، اپنا کلچر، زبان بہت کچھ قدم قدم پر چھوڑنا پڑتا ہے — کیا یہ

ضروری ہے؟ — کیا ترقی ان چیزوں کے ساتھ ساتھ نہیں ہوسکتی؟ —"

علی اس وقت بڑا چوہدری محسوس کرنے لگا — وہ پڑھائی میں بہت کمزور تھا اور مرتضٰی ہی اس کے نوٹس اور assignments لکھتا تھا۔ اس وقت مرتضٰی کے دفاع میں بولتے ہوئے اسے عجب قسم کی بہادری کا احساس ہوا۔

مرتضٰی نے آہستہ سے کہا — "کیا میں ایک مثال دے کر سمجھا سکتا ہوں — ؟"

"ضرور ضرور، خوشی کے ساتھ —" چاروں نے انگریزی میں کہا۔

"مثلاً اللہ اسراف سے منع کرتا ہے اور آپ دیکھ لیجیے آج کی ترقی میں اسراف بنیاد ہے۔ کوئی شہر، کوئی گھر، کوئی فرد اضافی اخراجات کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا — جہاں ترقی روز افزوں ہو، وہاں اسراف جیسی بنیادی اسلامی قدر کو چھوڑنا پڑے گا —"

"خدا کے لیے یہ لیکچر بند کریں۔ ہم سے استاد برداشت نہیں ہوتے۔" سارا چڑ کر بولی۔

"انہیں اپنی بات کو مکمل کرنے دو سارا —" علی نے پھر مرتضٰی کو پروٹیکٹ کیا۔

"چلیے ایک اور ویلیو سے سمجھیے سارا — چادر اور چار دیواری ایک سلوگن سہی، لیکن عورت سے ایک قدر وابستہ ہے کہ وہ گھر کی اخلاقی فضا درست رکھے اور بچے کی تربیت کی ضامن ہو۔"

"کمال ہے، عورت اکیلی یہ کام کیوں کرے — وہ کیوں نہ اپنی تلاش میں نکلے..... اپنی ترقی چاہے؟" سارا نے چڑ کر کہا۔

"ضرور چاہے — ضرور، کوئی روک نہیں..... لیکن ایک اسلامی قدر پامال ہوگی — بچے کی ترقی رکے گی۔"

ثمینہ نے پھر جمپ لگائی — "بھئی پلیز شٹ اپ، آئی ڈونٹ لائیک دس۔ یہ بیحد بورنگ برتھ ڈے ہے —"

"آپ مرتضٰی کو بات کرنے دیں — اور بالکل Childish نہ ہوں —"

"اب جو لوگ انگریزی زبان زیادہ روانی سے استعمال کرتے ہیں، وہ ترقی کی دوڑ میں آگے ہیں۔ میں آپ سب سے پوچھتا ہوں کیا اس سے وطن پرستی کی تو کوئی قدر ضائع نہیں ہوجاتی؟ سوچ لیجیے، اپنی زبان کی محبت تو مجروح نہیں ہوتی؟"

ثمینہ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا — "اوہ بابا — میں نہ قائل ہونا چاہتی ہوں نہ کر رہی ہوں، میری صرف اس درجہ ڈیمانڈ ہے کہ مرتضیٰ آپ ستا ستا..... Compromise کریں۔ گاڑی کو neck break سپیڈ پر مت چلائیں، چلائیں تو سہی۔"

"آپ چاہتی کیا ہیں ثمینہ، مجھے بغیر ٹیپ ٹاپ کے سمجھائیں —"

"آپ اندر سے بنیاد پرست رہیں.... احکامات کے پابند اور ویلیوز کے عاشق رہیں، لیکن اوپر سے تھوڑا سا حلیہ ایسا بنالیں کہ شبہ نہ ہو آپ ہماری طرز کی ترقی کے خلاف ہیں۔ آپ ہمیں نہ تو احساس جرم دلائیں نہ ہی ہمیں اپنے حلیے سے Condemn کریں —" نئی قمیضیں اور جینز سارا نے اس کی گود میں رکھ دیں۔

گھر آکر مرتضیٰ سوچ میں پڑ گیا۔

سوچنا اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ عبوری دور میں جہاں ان گنت مسائل بے شمار variables کے ساتھ آپس میں دست و گریبان تھے، سوچ اس جیسے نوجوانوں کا مقدر ہو چکی تھی۔ مرتضیٰ ایک سادہ سے گھرانے کا، تھوڑی ضروریات کا، بڑا سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ اللہ اور اس کا آخری نبی اس کی Top priority تھے۔ مذہب سے اس کی وابستگی کسی جنونی کیفیت کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ وہ اسے اپنے دفاع کا سب سے بڑا حصار سمجھتا۔ وہ یہ احساس رکھتا تھا کہ ترقی کے راستے میں کلچر سب سے زیادہ افراتفری کا باعث بنتا ہے۔ انسان تبدیلی کا خواہاں رہتا ہے اور کلچر اسے پابند کرتا ہے — مرتضیٰ اپنے مذہب کا اس درجہ عاشق تھا کہ وہ کسی دشمنی کا اہل ہی نہ رہا تھا۔ وہ دوسروں کی بات ٹھنڈے دل سے سن کر اپنے راستے پر چلتا رہتا.... لیکن کلچر نے اس کے لیے کچھ مشکلات پیدا کر رکھی تھیں۔ اس کا لباس، رہن سہن وہی تھا جو اسے اپنے آباؤ اجداد سے ملا۔ وہ بار بار نئی قمیضیں اور جینز نکال کر دیکھتا۔ اسے یہ بڑا ہی غیر جمہوری فعل لگتا کہ جن لوگوں میں رہتا بستا ہے، اپنی وضع قطع بدل کر ان سے علیحدہ ہو جائے۔

انسان ہمیشہ ایسے ہی دوراہوں پر رہتا ہے — محلہ..... محلے کے لوگ اسے ایک جانب کھینچ رہے تھے اور کالج کا گروپ دوسری جانب!

وہ کئی دن کالج نہ جا سکا۔

گلی سے پرے مختلف مناظر اور لوگ اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ گلی اور گلی میں

کھلنے والے کمرے میں آکسیجن کم محسوس ہوتی۔ اس کے لیے گھر والوں کے چہرے بدلتے گئے۔ یہ لوگ تابوت کی طرح بند تھے۔ دادی جب بولتی تو کوئی محاورہ، اکھان، اونچ نیچ، اپنے زمانے کے تجربات سمجھانے کے لیے بات کرتی۔ یہ باتیں اس کے اندر کھولتے سوالوں کا جواب نہ تھیں۔ دادی کا ایمان، استقامت، وفاداری بہ شرط استواری مثالی تھی لیکن اس کا ماحولیات کا علم اب پرانا ہو گیا تھا.... جیسے تمام علوم وقت گزرنے پر گرد آلود ہو جاتے ہیں۔

اس کا بھائی اور بھابھی بڑے کم گو تھے۔ انہیں مڈل کلاس گھرانوں کی ضروریات نے کئی کچے پکے رشتوں میں باندھ رکھا تھا۔ بھابھی کو مرتضیٰ سے صرف اس وقت بات کرنا ہوتی جب اسے بازار سے کچھ سودا سلف منگوانا ہوتا۔ ایسے میں بھابھی کا رویہ نرم اور آواز نرم تر ہو جاتی۔ صافی، ٹوکری، پچھی جو کچھ بھی پکڑاتی، ساتھ مسکراہٹ ضرور پیش کرتیں — "لے سوہنے ویر ذرا بھاگ کر بازار تو جا —"

مرتضیٰ کو نہ تو گھر پر کوئی اعتراض تھا نہ گھر والوں کی مقفل زندگیوں پر کسی قسم کا شک.... بس ایک نئی کھڑکی کھل جانے کے باعث اب وہ کنوئیں کا مینڈک نہ رہا۔ نئے ملک، ان کی تہذیبیں جاننے کی امنگ دل میں ہلورے لینے لگی۔

اس روز شب برات تھی۔ ساری گلی میں چراغاں تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے کروشیئے کے بنے ہوئے رومالوں سے ڈھکی تھالیوں میں ایک دوسرے کی طرف حلوہ پوری لے جانے میں مصروف تھے۔ اس شام مرتضیٰ نے ڈاڑھی چھوٹی کرائی، پینٹ قمیض زیب تن کی، جوگرز پہنے اور گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوا۔

دوسرے دن اس کا ارادہ کالج جانے کا تھا۔

آنگن میں سارا خاندان جمع تھا۔ انہوں نے ایک نظر مرتضیٰ پر ڈالی اور سکتے میں چلے گئے.... لباس کی تبدیلی بغاوت کا اعلان تھی —!

وہ ایوا کو کیا بتاتا کہ اس وقت اس کے دل پر کیا گزری تھی.... خیال سے حقیقت میں داخل ہوتے ہی کیا دھماکہ ہوا۔ وہ ایوا کو کیسے سمجھاتا کہ یہ قربانی بھی اس کے گروپ کے لیے کافی نہ تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے باوجود وہ چار موروں کے درمیان کوا ہی رہا۔ کوئی ایسی کسر رہ گئی جو سارے ہنس چال سمجھنے سے قاصر تھے۔ پہلے جب وہ ملا صورت تھا تو

وہ اسے ساتھ رکھتے تھے۔ اب جب وضع قطع ایک سی ہوگئی تو وہ چاروں کنی کترانے لگے — امتحان سے پہلے وہ ان کے لیے اجنبی ہوگیا — دونوں طرف سے اصرار نہ ہوا — بس کچھ کہے سنے بغیر وہ بچھڑ گئے —

"تم مجھے اپنے متعلق کبھی کچھ نہیں بتاتے مرتضیٰ —" بلینڈر میں کچھ رڑکتے ہوئے ایوا نے کچن سے پوچھا۔

وہ خاموشی سے تحفے پیک کرتا رہا... وہ اسے کیسے بتاتا کہ ایک تو ثمینہ بھی تھی۔

آخری بار جب وہ اپنے سکالرشپ کے سلسلے میں سیکرٹریٹ گیا تو ثمینہ اچانک اسے مل گئی۔ اس کے ہاتھ میں سکالرشپ سے متعلقہ کاغذات رول کیے ہوئے تھے۔ ثمینہ وزیراعلیٰ کے دفتر سے نکل رہی تھی۔

"ہیلو مرتضیٰ! سال بھر سے آپ کہیں نظر نہیں آئے —؟"

"ہاں — بس نوکری مل گئی تھی —"

"کہاں؟ —"

"ایک پرائیویٹ سکول میں!؟"

ثمینہ نے وزیراعلیٰ کے دفتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — "میں ذرا انکل سے ملنے آئی تھی —"

وہ اس نیلی چڑیا کو دیکھتا رہا جو ہمیشہ اس سے دور دور منڈلاتی رہی!

"کیا بات ہے، کالج کے بعد آدمی ان ٹچ نہیں رہتا ہم جماعتوں کے ساتھ — ہے ناں —"

"کئی بار ساتھ ساتھ کرسی پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی کوئی رابطہ قائم نہیں کرسکتے۔"

"آپ تو گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ آپ کو کسی کالج میں نوکری نہیں ملی —؟"

"اب سکالرشپ مل گیا ہے —"

"ارے واہ — کہاں جارہے ہیں آپ؟"

"امریکہ — وسکانسن سٹیٹ میں۔"

"یہ بات ہوئی ناں — اب آپ کی پرفیکٹ گرومنگ ہو جائے گی — وہ علی وغیرہ نہیں مانتے تھے۔"

ثمینہ کی آنکھوں میں ہلکی سی اداسی تھی۔

"کیا فرق پڑتا ہے — اب ثمینہ" پتہ نہیں کیوں مرتضیٰ کہہ گیا۔

"ایک بات بتاؤں اگر آپ مائنڈ نہ کریں —"

"ضرور —"

"جب آپ نے لباس بدل لیا — تو ہم سب کو پتہ چلا کہ پھر بھی آپ ہم لوگوں میں گھل مل نہیں سکتے۔ کچھ کسر تھی — بس میرا جی چاہتا تھا کہ آپ...." اچانک وہ بڑا پکا سا منہ بنا کر چپ ہوگئی۔

"کیسی کسر ثمینہ؟"

"آپ کے عقیدے بہت پختہ تھے۔ ہم ہیومن رائٹس پر یقین رکھتے تھے اور آپ..... شاید صرف پروفٹس کے حقوق پر ایمان رکھتے تھے۔ آپ لوگوں کو بہت سخت نگاہ سے دیکھتے تھے —"

"لیکن آپ نے ایسے کیوں سوچا؟ کیا مذہب سے وابستہ ہونا اس بات کی کافی دلیل نہیں کہ ماننے والا ظلم، جہالت، دوسروں کے حقوق کی پامالی کے خلاف ہے؟ — کیا ہیومن رائٹس میں سب سے بالاتر نبی کے حقوق نہیں ہوتے؟ — شاید آپ خدا پرست انسان کو غلط سمجھتی ہیں.... ایسا شخص خدا کے احکامات کے مقابلے میں اپنے حقوق پامال کرتا ہے لیکن دوسروں کے حقوق کی پامالی کا باعث نہیں ہوتا —"

"چلیئے اب ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے — مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ وسکانسن جارہے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ وہاں آپ کو کوئی سفید فام لڑکی اتنی اچھی لگے، اتنی اچھی کہ آپ اس کے رنگ میں رنگے جائیں..... پھر..... آپ کی گرومنگ ہو جائے گی۔"

بڑی دیر وہ دونوں ائیر کی باڑھ کے پاس خاموش کھڑے رہے۔ پھر ہچکچا کر مرتضیٰ نے کہا "کیسا فرق — کیسا فرق ثمینہ —؟"

"اب ان باتوں سے فائدہ — میرا تو پرسوں رات نکاح ہوگیا" اس نے وزیراعلیٰ کے دفتر کی طرف اشارہ کیا — "ان کے بیٹے سے — جب آپ کو کوئی لڑکی وسکانسن میں ملے ناں تو مجھے ضرور یاد کیجئے گا۔"

وہ آہستہ آہستہ سفید کار کی طرف بڑھتی گئی۔ ایک بار بھی اس نے پلٹ کر مرتضیٰ

کی جانب نہ دیکھا — پتہ نہیں کیوں اسے برف میں دھنستی وہ نیلی چڑیا یاد آ گئی جس کا کوئی پر نیلا نہ تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو مرتضیٰ؟" باورچی خانے سے ایوا کی آواز آئی۔

"میں سوچ رہا تھا حقیقت اور خیال میں کس قدر فاصلہ ہے — اور یہ..... یہ کہ خیال بہتر ہے کہ حقیقت؟"

ایوا جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی اندر آئی اور کسی استانی کی طرح جم کر کھڑی ہو گئی۔ مرتضیٰ نے سلوفین ٹیپ سے کرسمس ٹری میں ایک تحفہ فٹ کیا۔ وہ دونوں بڑی دیر خاموش رہے۔

"تم مجھے اپنے ملک، مذہب، لوگوں کے متعلق کچھ نہیں بتاؤ گے؟"

"میں ایک سبق بار بار سیکھنا نہیں چاہتا ایوا..... میرے بزرگ سپین میں جب آئے تھے تو ایک مدت انہوں نے وہاں کے سفید فام لوگوں کو اپنے متعلق بتانا چاہا، لیکن جب حملہ آور سپین سے وطن لوٹے تو سفید فام ہسپانوی لوگوں کو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ سیاہ فام لوگ کون تھے.... گویا انہوں نے کبھی ان کی بات سنی ہی نہ تھی —"

ایوا کو یہ بات بری لگی لیکن اس نے اظہار کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کی۔

"بوسنیا کے لوگ اپنے عیسائی ہمسائیوں کو کچھ بتانا چاہتے ہیں.... اپنے متعلق، اپنے مذہب کے بارے میں.... لیکن کیا سرب کروئیٹس کچھ سننے کو تیار ہیں؟ ہم تو جب قریب آنا چاہیں تو ہمیں یا دہشت گرد سمجھا جاتا ہے یا خوشامدی..... سوڈان، الجزائر، مصر..... پاکستان..... ہم سب کچھ کہنا چاہ رہے ہیں، لیکن کوئی سننے والا کان بھی تو ہو —"

ایوا دھپ کر کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تم بہت سنجیدہ ہو مرتضیٰ — اتنی سنجیدگی اچھی نہیں ہوتی۔ اچھا مجھے اپنی ماں کے متعلق بتاؤ، شروع سے..... جب تم اپنے علاوہ اسے سمجھنے لگے۔"

"تم ماں کو بھی سمجھ نہ پاؤ گی — میری ماں نے دنیاوی مسئلوں کا علاج صبر کی ڈھال سے کیا۔ وہ سارے دنیوی وار اسی ڈھال پر سہتی تھی.... یہ ڈھال اسے مذہب نے پکڑائی تھی ایوا..... لیکن تم لوگ تو ہمیں aggressive، terrorist سمجھتے ہو..... تم بھلا کیا سمجھو گی کہ ہمارے مذہب نے ایک ہی ہاتھ میں جہاد کی تلوار اور صبر کی ڈھال پکڑا رکھی

ہے — تمہارے نزدیک تو یہ Contradiction ہے..... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں.... کہاں سے شروع کروں کہ اللہ کی راہ میں جہاد اور ذات کے حوالے سے صبر کیا ہوتا ہے؟ کیسے بتاؤں — کہاں سے شروع کروں — ایوا؟"

ایوا سیکولر خیالات کی لبرل لڑکی تھی۔ وہ Cause اور effect کی دنیا میں رہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ صرف معاشرے اور فرد کے باہمی پیدا کردہ اخلاقی ضابطے، کلچر، قانون اور پولیٹیکل مشینری گروہ کے تحفظ کا باعث ہوتے ہیں۔ قانون الٰہیہ بھی فرد اور معاشرے کی حفاظت کرتا ہے، اس بات کو ماننے کے لیے وہ تیار نہ تھی۔

بڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی — "یعنی یہ جو مذہبی فوبیا تمہیں ہے، اس کی وجہ تمہاری ماں تھی مرتضیٰ؟"

مرتضیٰ کا لہو ابھی گرم تھا۔ وہ جھنجلا کر بولا — "سنو فوبیا کی بچی — میں ایک نارمل ہیومن بیئنگ ہوں۔ میں شعوری طور پر..... اور عقلی طور پر بھی مابعد پر یقین رکھتا ہوں۔ مجھے کلی اعتبار ہے کہ اللہ کے احکامات کے مقابلے میں اس دنیا کا تمام علم ہیچ ہے — اب یہ مت سمجھنے بیٹھ جانا کہ میں انسان کے ساختہ علم کو معمولی achievement سمجھتا ہوں یا کسی طرح اسے کوئی کمتر درجہ دیتا ہوں — لیکن افضلیت اللہ کے علم اور اس کے احکامات کی ہے —"

ایوا نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو کبوتروں کی طرح گود میں ڈالا اور دکھ سے بولی — "مرتضیٰ! تم آدھی پونی انچ بھی جگہ سے نہیں ہٹتے، یہی وجہ ہے کہ ہمارا گروپ..... یعنی ساری کلاس تمہارے ساتھ Socialize نہیں کر سکتی۔ کوئی بات ایسی ہے جو حجاب بن جاتی ہے۔ مہندر کور کو دیکھو، کیسی گھل مل گئی ہے سب میں — سکرٹ پہننے لگی ہے — لیکن تم تو اتنی سختی سے اینٹی سوشل ہوتے ہو کہ..... کہ....."

"میں کب اینٹی سوشل ہوا؟ کب؟"

"ابھی کل شام جس طرح تم نے مارتھا کو انکار کیا —"

"کیسا انکار؟ —"

"وہ تمہیں ڈرنک آفر کر رہی تھی اتنے لاڈ سے — اور تم — اوہ مائی گاڈ!"

"اور میں نے بھی بڑی لجاجت اور پیار سے انکار کیا تھا..... پوری شرمندگی اور

مجبوری ہے!"

"یہ بتاؤ ایسے انکار کے بعد وہ تمہاری دوست کیسے بن سکتی ہے —؟"

مرتضیٰ تھوڑی دیر کے لیے چپ رہا۔ پچھلے دو سالوں سے وہ ایسے ہی بند دروازوں سے ٹکرا رہا تھا۔

"اگر..... اگر..... فرض کرو اگر میں مارتھا سے کہتا کہ وہ سر سے پاؤں تک بے حجاب نہ رہا کرے..... اور مجھ جیسے کمزور لوگوں کے لیے ترغیب کا باعث نہ بنے تو وہ..... کیا وہ میری بات مان لیتی؟ —"

پہلے تو ایوا کو یہ خیال ہی سمجھنا مشکل تھا کہ حجاب بھی کوئی چیز ہے۔ اس نے ایسی فلمیں ضرور دیکھی تھیں جن میں سیاہ عبا پہنے ایرانی عورتیں بندوقیں چلاتی پھرتی نظر آتیں۔ اس نے حجاب کو کبھی اللہ کے حکم کی مناسبت سے نہ جانا تھا۔ وہ تو چادروں میں ملبوس عورتوں کو مرد کے ظلم کا نشانہ ہی سمجھتی تھی۔ ایوا کی ساری اخلاقیات مذہب سے کٹی ہوئی تھی، اسی لیے وہ بھڑک کر بولی:

"مرتضیٰ پلیز reasonable ہوں۔ کیا مرد اپنے آپ کو اس طرح ڈھانپتا چھپاتا ہے؟ یہ تو ہیومن رائٹس کے خلاف ہے —"

"اور یہ بتاؤ کیا مرد عورت کی طرح پرکشش ہے؟ — کیا عورت کے دل میں مرد کی ویسی ہی رغبت ہے جیسی مرد کے دل میں ہے؟ — بتاؤ کبھی عورت نے مرد کے لیے ویسی جنگ کی جو ہیلن آف ٹرائے کے لیے ہوئی تھی؟"

"تم بہت زیادہ نکتے نکالتے ہو مرتضیٰ۔ کوئی کیسے ڈریس کرتا ہے، یہ اس کا پرسنل معاملہ ہے۔"

"اگر کوئی شراب پیئے تو یہ صرف پرسنل معاملہ نہیں..... اس کے لیے حکم آ چکا ہے —"

ایوا جل بجھ گئی —

"کبھی تو اپنی عقل بھی استعمال کر لیا کرو، لیکن تم تو مرتضیٰ صرف پیغمبروں کے حقوق کو مانتے ہو۔ عام معمولی ہیومن بینگز کا اپنی زندگی پر کوئی حق نہیں، سارے حق پیغمبر کے ہیں؟ — کبھی تو کوئی پوائنٹ چھوڑ دیا کرو —"

"تمہارے لیے تو میں اپنا آپ چھوڑنے کو تیار ہوں۔"

ایوا خوش دلی سے ہنس دی۔

"چلو یونین کے دفتر چلیں —"

"وہاں تک کیوں، دنیا کے آخری کونے تک —"

وہ دونوں ہنس دیے کیونکہ دونوں جوان تھے اور موسم بہت خوبصورت تھا!

اس واقعے کے عین دسویں روز ایوا نے ہم جماعتوں کو مدعو کیا۔ یہ تمام طالب علم مختلف ممالک، نسل، زبان اور رنگتوں کے مالک تھے۔ ان میں یہودن مارتھا تھی، کینیڈا کا خوبصورت روجرز تھا، موٹے ناک اور بھرواں ابروؤں والا جگدیش بھاٹیہ تھا۔ ان کے علاوہ باقی امریکن، جاپانی، چینی، بلیک طالب علم بھی بار بی کیو کی خاطر ایگل ہائٹس کے اپارٹمنٹس کے اردگرد نشیبی لانوں پر موجود تھے۔ ان خوبصورت سبز تختوں پر چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد سائیکل سوار بچے ان پگڈنڈیوں پر سائیکلیں چلاتے نظر آتے تھے۔ طالب علموں کے یہ بچے کبھی کبھی لان کی اترائی اترتے لان پر اپنی سائیکلیں چھوڑ کر بھاگ جاتے اور پھر بونوں کی طرح برآمد ہو جاتے۔

گھروں کے سائے میں لکڑی کی بنچیں، زرد تختوں کے میز، سٹیک بنانے کے بڑے بڑے آہنی چولہے جابجا نصب تھے۔ شام کا وقت تھا۔ روجرز نے چولہے میں کوئلے دہکائے۔ شانت نیلگوں فضا میں دھواں پھیلنے لگا۔

مارتھا نے پہلے میزوں کو خوب صاف کیا۔ پھر میز پر کاغذ کے کپ، پلیٹیں اور ایسے سینڈوچز رکھے جن کا گوشت گلابی اور مرتضیٰ کے لیے حرام تھا۔ جگدیش بھاٹیا کے دہی بھلے ہوا میں خوشبو پھیلا رہے تھے۔ ایوا ڈرنکس لائی تھی لیکن اپنی ٹوکری کے بالکل نیچے اس نے ایک خوبصورت رومال میں ڈائیٹ کولا کی بوتل مرتضیٰ کے لیے چھپا رکھی تھی۔ عجیب سے حالات تھے..... شراب کی بوتلیں ننگی تھیں اور ڈائیٹ کولا کو کفن نے لپیٹا ہوا تھا۔ مرتضیٰ صرف پھل لایا کیونکہ یہی ایک سودا اسے سیف لگا۔ ویسے بھی اسے کھانا پکانے کا کچھ ڈھنگ نہ آتا تھا۔

ہولے ہولے شراب کی بوتلیں کھلنے لگیں.....

کوئلوں کی انگیٹھی پر گوشت جلنے لگا.....

لڑکیوں کے قہقہے بلند ہوئے ——

لڑکوں کی چال میں لڑکھڑاہٹ آنے لگی....

ایوا سیب کھانے میں مشغول تھی اور مرتضیٰ گم سم تھا۔

بڑی دیر وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے!

"پتہ ہے میں نے تمہیں سب سے پہلے کہاں دیکھا تھا ایوا ——"

"کلاس میں، اور کہاں!"

"نہیں، کارن فیسٹول میں —— یاد ہے تمہیں ایوا؟ ——" مرتضیٰ نے کہا۔

"نہیں —— ہم دونوں پہلی بار تب ملے تھے مرتضیٰ جب یونیورسٹی کی کتابیں نیلام ہو رہی تھیں۔ تم نے رشدی کی کتاب اٹھا کر ایسے واپس رکھی تھی جیسے وہ کوئی جلتا شعلہ ہے —— پتہ ہے تمہاری آنکھیں کیسے لگ رہی تھیں؟"

"کیسی؟"

"جیسے horror films میں قتل ہونے سے پہلے مظلوم کی آنکھیں ——" ایوا بولی۔

"غلط —— میں تمہیں کارن فیسٹول پر ملا تھا ——" مرتضیٰ اصرار سے بولا۔

"جگدیش بھاٹیہ مجھے میلے پر لے کر گیا تھا۔ تم بھی کہیں سے وہاں آنکلی تھیں۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو لیکن جب تم نے گرم گرم بھٹے پر مکھن لگایا تو مکھن پگھل کر تمہارے سکرٹ پر گرا تھا۔ خوف سے تمہاری آنکھیں پھیل گئی تھیں.... ایسے نیلے چشمے میں نے کبھی نہیں دیکھے۔"

"نہیں، پہلی بار مظلوم خوف زدہ آنکھیں —— رشدی کی کتاب۔" ایوا نے ضد سے کہا۔

"ہرگز نہیں —— پہلی بار ابلتے نیلے چشمے ——"

روجرز نے قریب آ کر کہا —— "تو تم دونوں نہ تو کچھ کھا رہے ہو نہ پی رہے ہو ——"

"ہم یاد کر رہے ہیں کہ ہم پہلے پہل کہاں ملے تھے اور ہم دونوں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پا رہے۔"

"ہیر ہیر، ہم فیصلہ کریں گے —— ہمیں بتاؤ —— ایوری باڈی جسٹ listen"

بیس بائیس لڑکے لڑکیوں نے ان دونوں کو گھیرے میں لے لیا۔ سارے میں سٹیکس کی خوشبو تھی۔ سارے چہرے شراب کی وجہ سے ایگل ہائٹس کی بتیوں جیسے جل اٹھے تھے۔ میزوں پر ان گنت مسلے ہوئے ٹیشو، شراب کی بے شمار اوندھی سیدھی بوتلیں، بیئر کے خالی ٹین —— کاغذی پلیٹیں، گلاس، انواع و اقسام کے کھانے —— نشے کی وجہ سے سب اچانک ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے اور بلاوجہ روہانسی ہنسی ہنس رہے تھے۔

مرتضیٰ نے ہولے ہولے دائرے میں کھڑے ہم جماعتوں کو بتایا کس طرح وہ وسکانسن پہنچا اور کس طرح اس کی ہوم سکنس ختم کرنے کے لیے جگدیش بھاٹیا اسے کارن فیسٹول پر لے گیا۔ یہ میلہ خالص امریکن تھا۔ ابلے ہوئے گرم گرم سٹے مکھن کے ساتھ مفت کھانے کو مل رہے تھے۔ دور دور سے دیہاتی مکئی لا کر اسے ابالتے اور لوگوں میں تقسیم کرتے۔ اس کے علاوہ پنگھوڑے، سلائیڈیز، جھولے، ڈرامے، بچوں کے کھیل.... وہ تمام لوازمات موجود تھے جن سے میلہ بنتا ہے۔ اسی میلے میں اس نے انجانے میں ایوا کو اپنے سرخ سکرٹ پر مکھن گراتے دیکھا تھا۔

اس کے بعد ایوا نے اپنی کہانی بتائی۔

"یونیورسٹی نے لاتعداد کتابیں الماریوں میں لگا کر کم قیمت پر بیچنے کے لیے سجا رکھی تھیں۔ بگ برادرز اور بگ سسٹرز کا ایک دھماکے دار بینڈ زور زور سے بج رہا تھا اور وقفے وقفے کے بعد وہ سستے کھانوں کے اشتہار مائیکروفون پر دے رہے تھے۔ بے شمار طالب علم ان پرانی کتابوں کو دیکھ رہے تھے۔ پھر میں نے مرتضیٰ کو دیکھا۔ اس نے رشدی کی کتاب بے خیالی میں نکالی، اسے سر جھٹک کر دیکھا اور کتاب واپس رکھ دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک مظلوم مقتول کا سا خوف تھا۔ بڑی دیر تک یہ اپنے رومال سے ہاتھ پونچھتا رہا۔"

جگدیش بھاٹیہ بڑا لبرل آدمی تھا۔ جب بھی اس کے گھر میں بڑیاں، پاپڑ، دہی بھلے بنتے تو وہ مرتضیٰ کو گھر لے جاتا لیکن خود وہ کبھی بھی مرتضیٰ کے گھر میں سوائے پھل کے کچھ نہ کھاتا۔ جگدیش بھاٹیا گوشت نہیں کھاتا تھا اور ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ مسلمان ملیچھ کے گھر میں کھانا کھا کر وہ بھرشٹ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ جگدیش بھاٹیا بڑا ہی لبرل اور ہنس مکھ آدمی تھا۔

"ارے یار یہ تم لوگوں کو ایک رشدی کی کتاب نے بولا دیا ہے — ایک کتاب ہے..... بکنے دو، کہنے دو..... زمانہ ڈیموکریٹک ہوگیا ہے۔ آزادی ہر ہیومن بینگ کا بنیادی حق ہے۔ تم ایک ادیب کی زبان تو بند نہیں کر سکتے۔ آزادیٔ تحریر کے خلاف ہو تم فنڈامنٹلسٹ؟"

مرتضیٰ یکدم کھڑا ہوگیا — اسے لگا جیسے اب کچھار سے چاروں طرف شیر اس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ "یہی تو میں بھی کہتا ہوں — یہ جمہوری دور ہے — یہاں ہیومن رائٹس کا استحصال نہیں ہونا چاہیے۔ کیا وہ کتاب جو ساری مسلمان اُمّہ کا دل دکھا رہی ہے، اس کی اشاعت بند نہیں ہونی چاہیے؟..... کیا ہم اکثریت کے حقوق کو افضل نہیں مانتے؟ — کیا جمہوریت کا نظام اکثریت رائے پر قائم نہیں؟ کیا ایک ادیب کی رائے ساری اُمّہ پر بھاری ہے؟ — یہ جمہوریت ہے؟"

مارتھا نے لمبی چسکی لگا کر ہچکی لی اور اونچے اُونچے بولی — "مرتضیٰ! کرائسٹ پر کتنا کچھ منفی لکھا گیا..... اس پر تو perverted ہونے کا چارج تک ہے۔ لیکن لوگ پروا نہیں کرتے —"

مرتضیٰ نے دائرے میں کھڑے تمام طالب علموں پر ہولے ہولے نگاہ ڈالی، پھر بڑی دکھ بھری آواز میں بولا — "واقعی آپ لوگ پروا نہیں کرتے کیونکہ..... کیونکہ..... کیونکہ آپ کا خیال ہے کہ کائنات کے کسی محسن اور عام انسان کے حقوق برابر ہوتے ہیں۔ آپ لوگ بھول سکتے ہیں تو بھول جایئے لیکن ہم لوگ حضرت آدمؑ سے لے کر رسول اللہؐ تک تمام پیغمبروں کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ ہم بندروں کی اولاد نہیں ہیں۔ پیغمبروں کی مسخ شدہ سہی لیکن ہیں ان ہی کی اولاد..... آپ ہمیں تنگ نظر کہیں چاہے بنیاد پرست، ہم ایسی ہی باتوں کا نوٹس لے کر جہاد کرتے ہیں اور نہ اپنی جان کی پروا کرتے ہیں نہ ان لوگوں کی جو پیغمبروں کو معمولی ہیومن بینگز سمجھتے ہیں۔"

فضا میں شیم شیم کے نعرے بلند ہوئے۔

مرتضیٰ نے اپنی آواز کو حلق سے یوں نکالا جیسے نیام سے تلوار کھینچتا ہو!

"میں نے پروفٹ کے حقوق پر اپنے ہیومن رائٹس قربان کر دیے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ روح اللہ کے ادنیٰ اشارے پر اگر لاکھوں انسان ہلاک ہو جائیں تو کوئی فرق

نہیں پڑتا۔ پیغمبر کے ایک موئے مبارک پر پوری نسل تاراج ہو جائے تو اس المیے کی زمان اور مکان میں کوئی اہمیت نہیں۔"

وہ سب نشے میں دھت تھے۔ ان کے manners جھڑ چکے تھے اور اندرونی سوچ برہنہ باہر آگئی تھی۔ ان میں سے ایک رشدی کی کتاب سے اقتباسات پڑھنے لگا۔ اسے اس بات کی پروا نہ تھی کہ مرتضیٰ کے دل پر کیا گزرتی ہے! انطونی میز پر چڑھ کر وہ تمام اعتراضات کرنے لگا جو آج تک نہ ماننے والے کرتے آئے تھے۔ جگدیش بہت پی چکا تھا، وہ بار بار ہوا میں مکے لہرا کر کہتا — "اسلام تلوار سے پھیلا..... ایودھیا کی مسجد کم ہے، ہندوستان کی ہر مسجد ڈھا دو —" مرتضیٰ کا جی چاہا جگدیش سے کہے اگر ہندوستان کے بادشاہ اقلیتوں کے خلاف تلوار استعمال کرتے تو آج وہاں کوئی ہندو نہ ہوتا..... لیکن اسے جگدیش کے دل کا پاس تھا۔ وہ جگدیش کو اب بھی ایک اچھا لبرل انسان سمجھتا تھا۔

وہ ان لوگوں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کشمیر میں کس کی تلوار چل رہی تھی!

وہ جاننا چاہتا تھا کہ بوسنیا کے لوگوں کے ہاتھ باندھ کر مروا دینے والے لوگ انسانی حقوق پر کہاں تک ایمان رکھتے تھے..... اس کے پاس بہت سے اعتراضات اور جواب تھے لیکن اب وہ اپنے غصے میں خود ہی بھسم ہو رہا تھا۔

اس کے گرد گھیرا ڈالے طالب علم دائرہ تنگ کر رہے تھے!

مارتھا نے اونچی آواز میں کہا — "ٹھیک ہے مرتضیٰ، پیغمبر مخلوق انسانی میں سب سے افضل ہیں لیکن ہم تمہارے پروفٹ کو نہیں مانتے — اگر وہ کرائسٹ کی طرح مجرد زندگی بسر کرتے تو شاید ہم ان کی عزت کر سکتے تھے —"

"آپ پیغمبروں میں تقابل چاہتی ہیں مارتھا۔ ہم معمولی لوگ جو اپنی عام سی ذہانت سے کمزور لوگوں کو صحیح طور پر جانچ نہیں سکتے، آپ کی آرزو ہے کہ ہم پیغمبروں کو نمبر دیں اور انہیں جانچیں..... میں بھی غصے میں کیچڑ اچھال سکتا ہوں، اعتراضات کی بھرمار کر سکتا ہوں لیکن میرے لیے تو تمام پیغمبر ایسے مقام پر ہیں جہاں زبان تو کیا، ادراک بھی پہنچ نہیں سکتا — میں آپ سب کے اعتراضات کا کیا جواب دوں؟ لیکن آج مجھے ایک بات سمجھ آگئی ہے کہ نشے کی حالت کو کیوں ناپسند فرمایا ہماری کتاب نے — انسان اس حالت میں ظالم اور ناانصاف ہو جاتا ہے —"

وہ گھیرے میں سے ہولے ہولے قدم اٹھاتا ایگل ہائٹس کی چاروں جانب پھیلی گھاس پر چلنے لگا۔ اس کے ساتھی طالب علم ہنسنے لگے۔ کچھ دور تک ایوا اس کا تعاقب کرتی رہی، پھر زخم خوردہ گھاس پر بیٹھ گئی۔

دوسرے دن ایئرپورٹ تک وہ دونوں خاموش رہے۔ پارکنگ کی طرف مڑنے سے پہلے ایوا نے کار کی رفتار ہلکی کر دی — "مرتضیٰ!"

"ہاں —"

"یوں پڑھائی نامکمل چھوڑ کر جانا کہاں کی عقل مندی ہے؟"

"میں نے عقل مندی کو خدا حافظ کہہ دیا ہے ایوا —"

"لیکن تمہاری ڈگری ہی تمہاری ترقی کی ضامن ہے مرتضیٰ۔"

"ٹھیک ہے ایوا — تھرڈ ورلڈ کے مسلمانوں کو ترقی درکار ہے — لیکن..... ہم پاک پیغمبروں کی اقدار، ان کی تعلیم کو گنوا کر ترقی نہیں کر سکتے..... شاید میری سوچ والے لوگ تھرڈ ورلڈ میں بھی کم ہیں..... لیکن ہیں ضرور..... میں کمزور ہوں — جہاد نہیں کر سکتا، ہجرت تو ممکن ہے ایوا —"

"وہاں جا کر کیا کرو گے مرتضیٰ —؟"

"کسی سکول میں نوکری..... پرائیویٹ سکول میں — سرکاری نوکری کے لیے تو میں اوور ایج ہو گیا ہوں۔"

ایوا کے چہرے پر بڑی الجھن تھی۔

"ایک چھوٹی سی جھڑپ — ایک فضول misunderstanding کی بنا پر —؟"

مرتضیٰ نے لمبا سانس لیا اور ایوا کا ہاتھ مہربانی سے پکڑ کر کہا — "بس ایوا مجھے دیوانہ سمجھنا یا احمق..... میں غازی علم دین شہید نہیں بن پایا لیکن کم از کم میں چاہتا ہوں کہ میں ترقی کا وہ آب حیات نہ پیوں جو پیغمبروں کی تحقیر کے پیالے میں serve کیا جاتا ہے۔"

"علم دین کون؟..... تم نے مجھے اپنے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا؟" ایوا سوال پوچھ کر چپ ہو گئی۔

"کچھ لوگوں کو سر پھرے رہنے دو ایوا..... کچھ لوگ جہاد میں مر مٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ پیغمبروں کے حقوق کے لیے، ان کی عظمت کے لیے لڑتے ہیں۔"

ہولے ہولے وہ ایئرپورٹ کے اندر جانے لگا — ایوا جنگلے کے پاس خاموش کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی — پتہ نہیں اس کے سکارف کا رنگ واقعی نیلا تھا یا نہیں لیکن مرتضیٰ کو وہ نیلا ہی لگا — مرتضیٰ چلتا گیا جیسے ہجرت کرنے والے، جہاد پر جانے والے چلتے ہیں..... شدید تنہائی کا احساس لیے!

آخری بار جب اس نے پلٹ کر نظر ڈالی تو اسے برسوں پہلے مری ہوئی ایک نیلی چڑیا یاد آ گئی۔

ہوائی جہاز اوپر اٹھ رہا تھا.....

ہر جانب برف ہی برف تھی.....

مرتضیٰ کو لگا جیسے نیلا سکارف کہیں اسی برف میں دھنستا جا رہا تھا۔

پتہ نہیں اسے چڑیا کی موت کا غم زیادہ تھا کہ خواب سے حقیقت تک پہنچنے کا!

آگہی کی یہ آخری کھڑکی تھی کہ پہلی؟

وہ ایک ایسی سمت میں سفر کر رہا تھا جہاں سمجھ بوجھ کام نہیں کرتی!

صدمۂ آواز

سارا تفرقہ کان اور زبان کے درمیان اٹھا۔

ان دونوں کے مابین جونہی عذاب صورت تنٹا بڑھا، آنکھ نے ڈنڈی ماری اور اپنا ٹکٹ سکہ چلا دیا۔ بات اتنی مختصر بھی نہیں اور مفہوم اس کے کچھ بہت سادہ بھی نہیں۔ ہوا یوں کہ جونہی کان اور زبان کے درمیان افہام و تفہیم ختم ہوئی، عجب قسم کی جہالت پھیلی۔ پھر نہ سلجھ پانے والے گھپلوں نے سر اٹھایا۔ نامحسوس طریقے پر یہ گھپلے بھنور کی صورت اختیار کر گئے اور ان کی لہریں دور دور تک پھیلتی گئیں۔

معاملہ عموماً معمولی ہوتا ہے۔

پھر کہیں سے، ادھر ادھر سے مواد اس میں شامل ہونے لگتا ہے۔ ندی نالے دریا کے پانیوں کو گہرا کرتے ہیں۔ ابتدا میں جھگڑا افواہ کی شکل جیسا قیاس پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ پھر اس میں زیب داستان، مبالغہ، جھوٹ بڑی کثرت اور شدت پیدا کر دیتے ہیں۔ لڑائی شروع میں فقط دوسرے کی نیت کو نہ سمجھنے کا ہیر پھیر ہے، پھر جانبین اپنی گفتگو اور آراء کے الٹ پھیر سے اسے گنجلک بنا دیتے ہیں۔ جنگ اولاً چھوٹی سی خود غرضی سے جنم لیتی ہے، پھر مخالفین پرانے قضیئے، بغض اور حرص کو قومی مفاد کے ضمن میں شامل کر کے ہتھیار اٹھانے، سرحدیں توڑنے اور نہتی آبادی کو تہس نہس کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن جب سے کان اور زبان میں ٹھنی تھی، عام لوگوں کے معمولات پہلے سے کہیں زیادہ سنگین ہو گئے تھے۔

پہلے زبان کو عادت تھی کہ بولنے سے پہلے وہ غور سے سن لیتی۔ پھر سنے ہوئے کی جگالی کرتے ہوئے اسے کچھ درست کہنے کو مل جاتا۔ کان بھی گھر میں آمد کی اطلاع دینے

والی گھنٹی سے لے کر رات کو پنکھے سے یونٹ پر جانے والے ایئر کنڈیشنر کی تبدیلی تک پہچانتا۔ کان کو دوسروں کی سرگوشیاں سننے کی عادت تو تھی ہی — اس کے علاوہ وہ ٹھنڈے دل سے بازار کا شور، آسمان میں اڑنے والے ہوائی جہاز، گھریلو لڑائی جھگڑے، رات گئے لوٹنے والے قدموں کی آواز، دودھ والے کی گھنٹی، ڈاکیے کی دستک، اماں جی کے خراٹے، بچوں کی چیخم پکار، لڑکیوں کی دبی دبی ہنسی، بدلتے موسموں کی سانسیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹریفک سب کچھ سنتا اور پھر اپنے اندر کہیں رجسٹر کر کے علیحدہ علیحدہ ریکارڈ کر لیتا۔ یوں سمجھئے کہ سارا دن اور ساری رات کان کو گہری نیند میں بے سدھ ہو جانے تک آوازوں کا سودا تھا۔ کچھ صدائیں جانی پہچانی ہوتیں جبکہ کچھ تازہ، نئی اور البیلی لیکن سننے والا کان سارے نئے پرانے سگنل غور سے سنتا۔ بار بار سنی گئی آواز کا گھسا پٹا رد عمل..... نئی آواز کا استعجابیہ جواب۔ کبھی کان سارے جسم میں خوشی کی لہر کا باعث بنتا، کبھی خوف کو انگیخت کرتا اور کبھی جلال کا موڈ طاری کر کے رکھ دیتا۔ سننے کے بعد سارا جسم سنی گئی آواز کے تابع ہو جاتا۔ ملی جلی آوازوں کو الجھے دھاگوں کی مانند علیحدہ کرنا اور ان کے تاثر سے بچنا بھی کان ہی کی مشکل تھی۔

کان کو آوازوں کے جنگل میں رہنے کا حکم تھا۔

ربع صدی ادھر تک کان کے لیے یہ کچھ تکلیف دہ کام نہ تھا۔ اب اس نے بے توجہی، بے تعلقی، روا روی میں سننے کے عمل کو جاری تو کر رکھا تھا لیکن کبھی سن لیتا، کبھی غلط آواز آتی، کبھی اس کی ان ہونی تشریح کرتا..... آوازیں اپنا مفہوم، اپنی سمت کھو چکی تھیں۔ کان غلط سننے پر مجبور تھا۔ آوازوں کی دنیا اتنی شور آلود، مبہم اور تکلیف دہ ہو گئی تھی کہ کان کو لگتا اب وہ سینگ میں یا نرسنگھے میں بدل جائے گا..... اس کے فنکشن اور سے اور ہو جائیں گے اور کلوننگ کرنے کی نوبت آئے گی۔

کچھ ایسی پرانی بات نہیں!

پچھلی سردیوں میں کان گم سم سو رہا تھا۔ مفلر کی وجہ سے باہر بازار کا شور دبا ہوا تھا۔ پھر اچانک آنکھ نے فتنہ اٹھایا۔ اندھیرے میں دیکھنے کے تجسس میں اس نے کان کو جلدی سے بیدار کر دیا۔ فائر بریگیڈ کی تواتر سے بجتی گھنٹیاں سڑک پر دور ہوتی جا رہی تھیں۔ آنکھ اور کان کے اصرار پر انسان کو جاگنا پڑا۔ وہ بھاگم بھاگ موٹر سائیکل تک پہنچا۔ نیک عمل کی

تلاش میں اس نے آواز کا تعاقب کیا۔ بڑی شاہراہ پر اس نے اتنی سپیڈ اختیار کر لی گویا پولیس اس کے تعاقب میں ہو اور فرار آخری راہ ہو۔ انسان کی بھی عجب تقدیر تھی..... اسے قیافے، اندازے، فیصلے کرنے کے لیے عقل اور دل کا دو موہی پیچ کس ملا۔ کبھی ایک پر تکیہ کرتا کبھی دوسرے پر اور کبھی دونوں کو بروئے کار لا کر بھی نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلتا۔

موٹر سائیکل کو دوڑاتا جب پون میل نکل گیا تو ایک چوراہے کا سامنا ہوا۔ بریک لگا، نظر دوڑائی۔ سوچنے لگا دائیں جاؤں کہ بائیں — ایک اور انسان جھاڑو پھیرنے کے عمل میں نظر آیا۔ قریب جا کر ہانک لگائی — "بھائی وہ ابھی ادھر سے فائر بریگیڈ گزرا ہے۔ کدھر آگ لگی ہے؟ میں نیک عمل کی تلاش میں ہوں —"

جھاڑو بہ دست آدمی نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی۔ کھ کھ کر کے ہنسا، پھر بولا — "کون سا فائر بریگیڈ سر؟"

"بھائی..... جلدی کرو، میں نے خود اپنے کان سے گھنٹیوں کی آواز سنی ہے اور میرا کان معتبر گواہی دیتا ہے۔"

"اچھا اچھا..... گھنٹیوں کی آواز..... آپ کو بھی آئی؟"

صفائی والا پھر ہنسا اور قدرے توقف کے بعد بولا — "سر..... وہ تو جی..... آپ کے کان کو دھوکہ ہوا ہے۔ وہ فائر بریگیڈ تو نہیں..... وہ تو جی کارپوریشن کا کوڑا ٹرک ہے۔ اب اس پر گھنٹیاں لگا دی ہیں۔ گھنٹی کی آواز سن کر لوگ وقت پر کوڑا پھینک دیتے ہیں۔"

انسان اپنی پوچ حرکت پر پچھتاتا واپس لوٹا..... نیک عمل کا حصول اتنا آسان بھی نہیں..... کبھی کبھی دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کو بھی تو نیک عمل سمجھا جا سکتا ہے۔ پہلے آوازوں کی تعبیر کرنے میں کان سے کم غلطیاں ہوتی تھیں۔ اس کے منبع سے رابطہ جوڑنا آسان تھا..... اب عقل اور دل کے ساتھ اس کا سرکٹ شارٹ ہو گیا تھا۔

جونہی کان میں اعتباری سننا بند ہوا، زبان کشادگی پر اتر آئی۔ بہت کچھ اتھل پتھل ہو گیا۔ گھپلے، غلط فہمیاں، زبانیاں پیدا ہونے لگیں۔ پہلے زبان سنتی، غور کرتی اور پھر جواب دیتی۔ زبان کا برخاک مالیدن کا سا معاملہ تھا۔ اب شل شیل بکے جاتی۔ کبھی لگتا جاسوس ہے، کبھی لگتا تھانیدار کی روح ترازو ہو گئی ہے۔ کبھی قیدی کے سے جواز پیش کرتی۔ گفتگو تھی کہ ٹیپ رواں تھا، ریڈیو آن تھا۔ جب سننا آسان تھا تب دل کے ابال پر ڈھکنا رکھ کر

زبان بندی بھی سہل تھی۔ ہر بات کہیں اندر بڑے چھوٹے پھاٹک بند کرنے پر قادر تھی۔ اب زبان کی ٹریفک نہ لال بتی پر رکتی نہ ہری پر۔

جو کچھ سیل بند دل میں ہوتا، قے کی مانند منہ سے نکلتا۔ پہلے تفکرات، غم، انتشار، گمان، وسوسے گونگے تھے۔ اب زبان ان کا روزنامچہ لکھتی۔ چھوٹی بات پر لمبے لمبے ٹیلی فون ہوتے۔ بھید بھری باتیں الم نشرح بیان کی جاتیں۔ علم مباحثوں کی نذر ہوتا۔ یوں لگتا زبان کو اپنی ہی آواز سے عشق ہو گیا ہے۔ ہر وقت رننگ کمنٹری میں مگن، گوسپ کے لیے تیار، مکالمے پر بضد، زباں آوری کی خود کاشت ہونے لگی — خود حسابی کے دن ختم ہوئے۔ اخبار، ٹیلی ویژن، ہر قسم کے میڈیا نے ایسی انفریشن عطا کر دی کہ بولنے کو مواد بھی اچھا خاصہ مل گیا — اظہار کے ندی نالوں میں طغیانی آ گئی..... زبان کا چسکا بہت بڑھ گیا۔

بات کچھ اس قدر سادہ بھی نہیں اور مفہوم اس کے سمجھ میں آنے بھی ذرا سے مشکل ہیں۔

جونہی کان اور زبان کے درمیان افہام و تفہیم کی کمی واقع ہوئی — آنکھ نے اپنا ٹکٹ سکہ چلا دیا۔ اس تثلیث نے خوب ادھم مچایا۔ عہد بھی ایسا تھا کہ پہلے نہ سنا نہ دیکھا۔ زمانہ نظر فریب، نظرباز، نظر افروز ہو گیا — عین الیقین نے کچھ ایسی شعبدہ بازی دکھائی کہ حق الیقین تک سعی کرنے کی حاجت ہی نہ رہی۔ ابلاغ کی جملہ آسانیاں، مناظر کی نیرنگی، حسن اور حسن جہاں سوز سے سلگنے والا عشق..... سب نظر کے مرہون منت ہو گئے۔ آنکھ پر کچھ اس درجہ تکیہ ہوا کہ سوچ کی راہیں مسدود نہیں تو حجابات کی نذر ضرور ہوئیں — کان اور زبان کی تفریق نے زندگی کی ساری فضیلت ہی آنکھ برد کر دی۔ آنکھیں اس بات پر اتراتی پھرتی تھیں کہ سارے جسم کا کنٹرول ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔

پہلے ابا لوگ گھر میں داخل ہوتے تو سائیکل کے ساتھ ایک بوسیدہ سا تھیلا بندھا ہوتا۔ اس میں ضرورت کی اشیاء کے علاوہ بچوں کے لیے میٹھی سونف، نارنگی کی نارنجی گولیاں اور میٹھی سوچ جیسی چیزیں بھی ہوتیں۔ آنگن میں لگے نلکے پر منہ ہاتھ دھو کر ابا چارپائی پر بیٹھتے —

ابا لوگوں کی آمد پر اماں قسم کی عورتیں کام کاج چھوڑ چارپائی کی پائنتی جا ٹکتیں —

ابا کہتے "آج گرمی بہت تھی بھاگ بھری..... دفتر کے سامنے والا بڑا ٹرانسفارمر بھک سے اڑ گیا۔ دفتر کے لوگ دوڑے پر ابھی تک لائن مین نہیں آئے تھے۔ سارا دن یہ فلیٹ کی قمیض جسم سے چپکی رہی۔ اوپر سے تین بار سر نے بلا کر وہ جھڑکے، گالیاں دیں کہ چاہا استعفیٰ دے دوں..... پھر تم سب یاد آ گئے..... یہ میٹھی سونف دیکھ رہی ہو ناں — پرسوں آٹھ آنے کی تھی، آج روپیہ لوٹ لیا۔ بازار والوں کو تو بس ایک ہی کام آتا ہے..... قیمت بڑھانا — سن رہی ہو کہ کان لپیٹ رکھے ہیں!"

اماں صورت عورت کہتی — "ہاں جی، غور سے سن رہی ہوں۔ آپ کی زندگی ہی اتنی سخت ہے، ترس آتا ہے۔"

اماؤں کے دل بھی ان گنت باتوں کی انفرمیشن سے بلک رہے ہوتے۔ وہ بھی چاہتیں مینا بن جائیں۔ اپنے اپنے قوامون کو بتائیں کیسے نند صاحبہ آدھی درجن بچوں کو لے کر آ گئیں — گیلی لکڑیاں جلنے میں نہ آئیں..... آٹے میں خمیر لگ گیا..... سارے تھو تھو کرتے پھریں..... منی کو پھر سے بخار چڑھ آیا، سارا دن گود چڑھی اترنے میں نہ آئی — ہمسائی ڈبہ الٹا چینی مانگ لے گئی، ابا جی کے فریج ٹوسٹوں کے لیے بھی دو چمچ نہ چھوڑی..... دودھ والے نے پھر تقاضا کیا، بھلا میں کب تک اس کی بدتمیزی برداشت کروں..... اماں جی نے اوکھی اوکھی باتیں کیں..... میرے گھر والوں کو بیٹھتی پُنتی رہیں، کب تک سنوں..... جاوید آٹھویں میں فیل ہو گیا، آپ اسے برا بھلا نہ کہیں..... بیچارہ پہلے ہی رو رو ہلکان ہو گیا ہے۔

ابا لوگ دفتر سے آ کر کھانا کھاتے رہتے۔

مائیں اپنی دن کہانی پر صبر کا ڈھکنا لگا کر دل میں سوچتیں..... ہائے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا، عشا کی نماز پڑھ کر جب کوٹھے پر اکیلے ہوں گے تو اپنی جغل خواری بیان کروں گی۔

رات جب گھر والے سو جاتے تو ابا لوگ کوئی ایسا واقعہ بیان کر دیتے کہ مائیں قسم کی عورتوں کو ہنسی کا دورہ پڑ جاتا۔

آدھی سوئی ماں سے ابا پوچھتے — "بھلی لوگ تمہارے لیے رنگ گورا کرنے والی کریم لایا تھا، کہیں اماں کے سامنے تو تھیلا نہیں کھولا؟ میری شامت آ جائے گی۔"

ماں ہنستی — کھیں کھیں ہنسی کے درمیان آواز مشکل سے نکلتی — "پاگل

ہوں، مرنا ہے میں نے اماں جی کے ہاتھوں....."

اس کے بعد مرد عورت کے درمیان افہام و تفہیم کی مشکل نہ رہتی۔

لیکن اب عہد بدل گیا۔ ساری نسل علم پر نہیں، انفرمیشن پر پل رہی تھی..... جیسے فصلوں کے لیے یوریا کھاد، برائلر مرغیوں کے لیے نقلی فیڈ اور بچوں کے لیے فاسٹ فوڈ اہم تھا۔ نوجوان نسل کے لیے انفرمیشن حاصل کیے بغیر چارہ نہ تھا لیکن کوئی بھی کسی کے مسلک، خیال یا بات کا متحمل نہیں تھا۔ سارے ماڈرن، تعلیم یافتہ، کھاتے پیتے لوگ صرف اپنے بٹوے اور ذاتی خیال پر بھروسہ رکھتے تھے..... یہاں کسی اور پر بھروسہ کرنے کی گنجائش نہ تھی۔

اب امیر گھرانوں کا نقشہ بدل گیا!

چوکیدار کے ٹھسے دار سلیوٹ کا بددلی سے جواب دے کر بابا فلی لوڈڈ کار پورچ میں کھڑی کرتا۔ اسے اس وقت نہ بچوں کا خیال آتا نہ ماما کا۔ دل میں خواہش ابھرتی کہ کسی ایسے ڈاکٹر سپیشلسٹ سے ملے جو اس بے نام تکان کو رفع کر دے، آنکھوں کے پپوٹے ہلکے ہو جائیں اور گہرا ڈپریشن کسی صورت اگر ختم نہیں ہوتا تو کم ضرور ہو جائے۔ کار کی سائیڈ نشست پر اس کا بریف کیس آنکھیں دکھاتا جس میں کئی قسم کے ویزا اور کریڈٹ کارڈ ہوتے..... ڈالر، بنک کی جانب سے ہزار ہزار کے سیل بند نوٹ، چیک بکس ہوتیں..... وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوتا۔ اسے اندر جانے کے لیے کسی گھنٹی کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیچ کی سے دروازہ کھولتا اور اندر اپنے مخصوص لزا بوائے پر دراز ہو جاتا۔ اسے اپنا دماغ اور جسم ٹھنڈا کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی۔

اس کے اندر شکایات ٹھنسی رہتیں، گویا پوست کے ڈوڈے میں پھٹنے کو خشخاس کے دانے! — پرائیویٹ سیکٹر میں کمائی گئی بے عزتی، بنکوں کے ڈیمانڈ لیٹرز، لیبر پرابلم، مڈل مینجمنٹ کے تقاضے، مجہول لوگوں کی بے جا امیدیں، سفارشوں کا طومار، خوبصورت گروڈ عورتوں کی فلرٹیشن، دوستوں کی غداری، رشتہ داروں کی بے حسی، ماں باپ کی زود رنجی..... گزرا ہوا دن پوری طاقت سے حملہ کرتا لیکن کان اور زبان میں اب کوئی مفاہمت نہ تھی.....

صرف آنکھ شاہد تھی۔

ماما آندھی کی طرح وارد ہوتی۔

"اللہ کب آئے بابا — ؟"

"ابھی، اسی لمحے!"

ماما کا دل بجھ جاتا۔ اس کی آمد پر تحسین بھری نظروں سے نہ دیکھنا بہت بڑی گستاخی تھی۔

"پھر تھکے ہو — ؟"

"ہاں، کچھ کچھ —"

بابا اپنے دن کی روئیداد سنانا چاہتا..... ساتھ ہی وہ اپنے بریف کیس کی طرف دیکھتا جس میں ماما کے لیے سب کچھ تھا۔

لیکن اب کی ماما زر پرست نہ تھی۔ وہ بھی بس بولنا چاہتی تھی..... بلا تکان، بلا خوف، بغیر کچھ سنے..... "کوئی ایسا وقت ہوتا ہے جب تمہیں مجھے اور بچوں کو دیکھ کر وحشت نہ ہو؟ — تمہیں کیا علم میری لائف کتنی Difficult ہے۔ اس گھر میں تو میری کوئی سنتا ہی نہیں، سب اپنے اپنے خیال میں مگن ہیں۔ بچوں کے لیے سب کچھ کرو، منہ سوجے کے سوجے — آپ کو پتہ ہے آج بارہ بجے کیا ہوا — ہاف ڈے تھا بچوں کا — باورچی خانے میں گئی..... باہر بچے گھنٹی بجا رہے تھے، میرے سامنے خانساماں دیگچی میں نوڈلز ڈال رہا تھا — میں نے صرف اتنی بات کہی، بھائی اب نوڈلز ابال رہے ہو اس وقت جب بچے گھر آ گئے ہیں! — جناب خانساماں کی مجال دیکھو، ایپرن اتارا اور باہر چلا گیا — ڈرائیور نے بتایا خانساماں کہتا ہے پلیز حساب کر دیں..... یہ تو حال ہے ان کا..... چودھویں گریڈ کے افسر جتنی تنخواہ لیتا ہے اور..... اور الو کا پٹھا آدھی دیہاڑی کا کام نہیں کرتا.....

ہاں بھئی تمہاری ممی کا فون آیا تھا — کہہ رہی تھیں گاڑی کے ٹائر بدلوانے ہیں، کسی کو بھیج دو..... لو جی یہاں کون ہے جو ویلا ہے؟ — تم بابا اپنی فیملی کو اتنا نہیں سمجھا سکتے کہ یہاں فون نہ کریں — ذرا سوئی چبھ جائے تو ٹرنک فون ملا لیتے ہیں۔ ان کی زندگی ہے، ان کے مسائل ہیں، خود غرض کہیں کے..... اور ہاں بیچ باتوں باتوں میں زبیر کو سمجھائیں، اے لیول کے امتحان سر پر ہیں۔ یا دوست آئے رہتے ہیں یا ٹی وی — پڑھتا ذرا نہیں..... لیکن سمجھائیں ایسے کہ کہیں مائنڈ نہ کرے، وہ بڑا Sensitive ہے — تم شاید سن نہیں

رہے؟"

"ہاں —" بددلی سے ماڈرن بابا بولتا ہے۔

گھر کا وہ وزیر خارجہ تھا، بھلا اتنے سارے اندرونی معاملات کا وہ کیا بگاڑ لیتا!

"وہ جیولر بڑا بدتمیز ہے۔ اس بار میں اس کے پاس اکیلی نہیں جاؤں گی..... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا..... آٹھ چکر لگا چکی ہوں — ایک موتی لگانے باقی تھے، ابھی تک بہانے بنائے جاتا ہے۔ سن رہے ہو بابا — ؟"

فون کی گھنٹی نے ان دونوں کو مخلصی دلائی۔ ماما دوڑ کر فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ ماما کی امی کا فون تھا..... گھر کی حالت، بچوں کا رونا دھونا، نوکروں کی بے عملی اور گستاخی، بازار والوں کا رویہ، مہنگائی کو محسوس نہ کرتے ہوئے مہنگائی کا رونا، سہیلیوں کا حسد، ڈاکٹروں سے لی ہوئی توجہ، درزی کے ڈھیلے وعدے، وقت کی کمی اور کاموں کی زیادتی..... سب کچھ امی کے کان کے لیے تھا۔ اس جانب سے ایسا سپورٹ سسٹم تھا جس میں نہ کوئی نصیحت تھی نہ راستے کا سجھاؤ..... بس سنے بغیر تف تف، ہائے ہائے، افسوس کے کوے اور فل سٹاپ تھے۔

بابا ترقی کی سیڑھی چڑھتا چڑھتا ٹی وی کا سگنل ٹاور بن گیا تھا۔ اس کے خواب، خواہشیں، خود غرضیاں سب تنہا ہو گئی تھیں۔

اس کی بتی کے سگنل صرف چند باتوں پر جلتے بجھتے.....

بہتر معیار زندگی

دولت کا حصول

کنزیومر سوسائٹی کے تقاضے

خوشی کی تلاش رائیگاں

راشدہ اور احسان بیس سال کی ہنسی خوشی سے بھرپور زندگی کے بعد علیحدہ ہو گئے۔

بات اتنی مختصر بھی نہیں — اور مفہوم اس کے بہت سادہ بھی نہیں۔ وہ دونوں ظالم بھی تھے اور مظلوم بھی — دونوں بے غرض بھی تھے اور خود غرض بھی۔ طلاق کی مختلف وجوہات لوگوں نے اپنے اپنے نظریوں کے مطابق بیان کیں۔ پبلک سکینڈل کے ساتھ یہ طلاق میڈیا کے لیے بھی تفریح کا باعث بنی۔ وہ دونوں اپنے اپنے طور پر اعتراف بھی کرتے

تھے کہ علیحدگی کی اصلی وجہ انہیں سمجھ نہیں آئی۔ ان کے قریبی لوگوں کا بھی خیال تھا کہ اتنی مضبوط رسی کو کاٹنے والا تیسرا فریق انھیں کبھی نظر نہیں آیا۔

اس طلاق میں راشدہ اور احسان دونوں ہی ویلن نہیں تھے۔

تیسرا فریق آنکھ بھی موجود تھی..... سوکن سے زیادہ باریک بین..... رقیب کی طرح تفصیل مین جانے والی!

جب سے کان نے سننا چھوڑ دیا اور زبان نے شپاشپ بولنے کا ڈھب سیکھا.....

جب سے کان اور زبان لنکا کوٹھ ٹاپو بنے تھے، آنکھ نے اپنا ٹکٹ سکہ چلا دیا تھا۔ آپ راشدہ اور احسان کی بلاوجہ علیحدگی کو وقت کا المیہ سمجھ رہے ہیں؟ — اس واژگوں حالت نے تو بڑی بڑی بادشاہیوں کا منطقہ البروج ہلا کر رکھ دیا..... انہیں بھی پتہ نہ چلا کہ سمت الراس کیا ہے!

شوق ہاتھی کا، سواری چوہے دل کی

شوق کی بھی علیحدہ ایک داستان ہے۔

عینکو علی ابھی دشت شوق میں نووارد تھا۔ چوتھی جماعت تک وہ ہمیشہ فرسٹ آیا۔ ہفتے میں دو تین بار اس کی مس ہاتھ کی پشت پر مارکر سے ستارہ بنا کر اسے بڑے خصوصی اعزاز سے نوازتی تھی۔ اس کی ہر رپورٹ میں تعریف ہی تعریف ہوتی۔

تین بجے کے قریب وہ اپنے انگلش میڈیم سکول سے لوٹتا۔ کھانا کھا کر فوراً ہوم ورک ختم کرتا۔ اس کے بعد دو گھنٹے کے لیے ٹیلی ویژن دیکھتا۔ اس کے پاس لائن کنگ، جیسپر، تھاؤزنڈ ڈائمنشن، پوکاہونٹاز اور الہ دین کے ذاتی ویڈیو ٹیپ بھی تھے۔

دل ہی دل میں علی اپنے آپ کو سپرمین اور الہ دین سمجھتا۔ کبھی کبھی بڑے التفات کے موڈ میں ڈاکٹر بھیا اس کے ساتھ ویڈیو گیمز کھیل لیتے، جن میں عموماً علی ہی جیت جاتا۔ لانگ ویک اینڈ میں وہ دادا ابا سے کہانی بھی سن لیتا۔ لیکن اسے دادا کی کہانیاں پسند نہ تھیں۔ وہ بڑی پرانی اور لمبی کہانیاں سناتے تھے جن میں سپیرے، جوگی، ٹٹ پونجیے بازی گر، پھاپھا کٹنیاں، خچریں، گڈے، بھینسیں، گنے، بھٹی کے دانے، تنور والیاں ہوا کرتی تھیں۔ دادا بیٹ مین، نن ٹینڈو، پوکاہونٹاز کو نہ جانتے تھے۔ اس اختلاف کے باوجود وہ دادا اور ان کی ڈاڑھی، بوڑھے جھریوں والے ہاتھ، بڑے پیٹ سے محبت کرتا تھا۔

علی عینکو کی روٹین بالکل سیٹ تھی۔ کھانا پینا، سونا، کھیلنا، پڑھنا لکھنا سب گھڑی کے تابع تھا۔ سوائے ویک اینڈ کے، یہ روٹین کبھی نہ ٹوٹی۔ پھر ایک دن جب وہ باورچی خانے کے کاؤنٹر پر بیٹھا فش اینڈ چپس کھا رہا تھا تو اسے مائیکرو ویو اوون کی میز کے ساتھ والی کھڑکی سے شوق کا چھلاوا نظر آگیا۔

خانساماں مائیکرو ویو اوون صاف کر رہا تھا۔

کھڑکی پر نظریں جما کر علی بولا: "یہ -- یہ خانساماں جی، بلی کا بچہ کب آیا جی؟"

خانساماں نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا جس کا ایک کونا اس کی بائیں آنکھ پر لٹک آیا تھا۔ اس کو اٹھاتے ہوئے خانساماں بولا: "اوہ علی میاں یہ یہاں آتا رہتا ہے، آوارہ بلی کا بچہ۔ بڑا ہو کر ماں جیسا نکلے گا..... گندی لالچی روح۔ اس کی ماں سارا دن ڈسٹ بن کے دوالے ہوئی رہتی ہے۔ یہ بھی سیکھ جائے گا۔"

پتا نہیں کیوں، علی ملول ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ بلی کو آوارہ اور گندی سمجھتا تھا، لیکن بلونگڑا دیکھتے ہی علی کی رائے بدل گئی۔ اب اسے آوارہ بلی مجبور، بے کس نظر آئی۔

"یہ -- یہ بلونگڑا ہے کہ بلونگڑی؟" علی نے خانساماں جی سے سوال کیا۔

ماما اس بات پر بہت زور دیتی تھی کہ سارے گھر والے خانساماں کو "خانساماں جی" کہیں۔

"یہ بھی بلی ہے اپنی ماں کی طرح علی میاں۔"

"ہیں ہیں، آپ کو کیسے پتا ہے جی؟"

"اس کی تھوتنی دیکھو، ماں جیسی ہے۔ پھر مجھے پتا ہوتا ہے۔"

"آپ کو ہر بات کا پتا ہوتا ہے خانساماں جی؟"

خانساماں نے سر کھڑکی سے باہر کر کے بلونگڑے کو دیکھا: "ہاں قریباً!"

"کیسے؟ پر کیسے؟"

"عمر..... تجربہ..... آنکھ.....!"

لیکن علی نے پوری بات نہ سنی اور بھاگ کر کوڑے کی بالٹی کے پاس پہنچا۔ بلی اور بلی کا بچہ دونوں غائب تھے۔ علی نے شام تک بچہ تلاش کیا لیکن اس کی جھلک دکھائی نہ دی۔

اس بار لمبا ویک اینڈ اور بھی لمبا ہو گیا۔

ماما نے بہت کوشش کی کہ سارے بچے ماموں کے گھر چلیں، لیکن علی پیٹ درد کا بہانہ بنا کر دادا کے پاس دبک گیا۔ دوسرے دن سب جلو پارک گئے، لیکن علی پھر ہوم ورک کا سہارا لے کر رہ گیا۔ یہ بہانے بازی چلتی رہی۔

علی شوق کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی جہت بدل گئی تھی۔ اب دو آنکھوں کے بجائے صرف ایک آنکھ تھی حتیٰ کہ ایک سمت میں دیکھتے رہنے کی بدولت وہ فیل بھی ہو گیا۔

پانچویں تک فرسٹ آنے والا لڑکا قلابازی کھا گیا۔

شوق عجب وارداتیا ہے..... انگاروں سے فائر کرتا ہے اور بجھی راکھ چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

"لیکن اتنے کم نمبر آنے کی وجہ؟ یہ فرسٹ آنے والے بچے کی رپورٹ ہے؟ کہاں ساری کلاس کو پیچھے لگا رکھا تھا، کہاں فیل ہوتے ہوتے بچا ہے تمہارا بیٹا۔ بے جا لاڈ پیار کے یہی نتیجے ہیں صولت..... مجھے کیا رپورٹ دکھا رہی ہو!" علی کا ابا غرایا۔

"اتنی چھٹیاں کیوں؟ کس لیے آخر؟" ڈاکٹر بھیا نے عینکوں کے پیچھے سے گھور کر کہا۔

دادا نے پہلے مکھی مار سے کھانے کی میز پر ایک مکھی کا پیچھا کیا، پھر انگلی اٹھا کر سب کو خاموش کرنے کے انداز میں روکا اور بڑے تنبیہہ کے انداز میں کہا: "بھئی معاملہ کیا ہے، کیوں سب کے سب خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئے ہو علی کے... تم کو کیا علم، شوق پورا نہ ہو تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ بددلی کوئی ایک سمت میں تھوڑا چلتی ہے..... وہ تو سارے وجود کو لپٹ جاتی ہے۔ تم سب کو عادت ہے گھیرنے کی۔-- مجبور پا کر سارے ٹوٹ پڑتے ہو۔"

ڈائننگ ٹیبل کے ارد گرد بیٹھا سارا خاندان خاموش ہو گیا۔ انگلش میڈیم سکول میں پڑھنے والا عینکو علی موقع غنیمت جان کر باورچی خانے کی جانب کھسک گیا اور وہاں خانساماں جی کو آرڈر دے کر اپنے لیے چپس بنوانے میں مشغول ہو گیا۔ واقعی سالانہ امتحان میں اس کے نمبر کم آئے تھے اور وہ بمشکل پاس ہوا تھا، اوپر سے اس کوارٹرلی میں علی نے چھٹیاں بھی کچھ زیادہ ہی کر لی تھیں۔ اس کی وجہ نہ تو خرابی صحت تھی نہ ہی پڑھائی میں عدم دلچسپی..... ساری خرابی کی وجہ قابو میں نہ آنے والی ایک ضدی بلی تھی!

مٹیالے زرد رنگ کی لمبے لمبے ناخنوں والی یہ بلی ایک ہی حرافہ تھی! اس بلی سے تو علی کو کوئی خاص رغبت نہ تھی لیکن دو ماہ پہلے اس نے پیارے پیارے بلونگڑے دیے تھے..... باقی سارے بچے تو نہ جانے کیا ہوئے لیکن ایک چھوٹا سا براؤن زرد بلونگڑا کبھی دیوار پر، کبھی یوکلپٹس کے پیڑ تلے، کبھی پھاٹک کے پاس گملے کی اوٹ میں دھوپ سینکتا،

چھوٹی چھوٹی چھینکیں مارتا نظر آجاتا۔

ضدی حرافہ بلی زندگی سے کئی سبق سیکھ چکی تھی۔ اگر زمانے نے اسے اپنایا نہیں تھا تو وہ بھی لوگوں سے اب اس درجہ بے نیاز تھی کہ کسی ہیومن بینگ کے قریب ہونا اسے بھی گوارا نہ تھا۔ وہ قصائی کی دوکان پر پلنے والے کسی کتے کی طرح بسیار خور تھی۔ سارا دن شہری لوگوں کی ڈسٹ بنز سے کھانے پینے کی چیزیں چرانا، ہلکے سے شور پر چمپت ہو جانا، کتے کی آواز سن کر یوکلپٹس پر چڑھ جانا، چڑیوں کے شکار کے لیے پودوں میں دبکے رہنا، رات کو چاق و چوبند اور دن کو لمبی اونگھوں کے سہارے گزارنا موٹی بلی کا شیوہ تھا..... لیکن بلونگڑے میں علی کی جان تھی۔ جدھر بلونگڑے میاں جاتے، علی بھی کھسکتا کھسکتا ادھر ہی رخ کرتا۔

علی کے اس عشق کی، سب سے پہلے خانساماں کو خبر ہوئی۔

گھر میں سارے خانساماں کو "خانساماں جی" کہتے تھے کیونکہ وہ ذات کا سید، اطوار کا جوکر، انداز کا عورت تھا۔ خانساماں جی ہر بات موڈ کے تابع کرتا۔ اگر گھر والے اس کے پکے کھانے کی تعریف کرتے تو موڈ فرسٹ کلاس ورنہ بجھی پھلجھڑی۔ خانساماں جی اور عینکو علی بڑی رازداری سے بلونگڑے میاں کے عشق کی باتیں کیا کرتے۔ اس گفتگو کے لیے علی کئی قسم کی زبانی اور عملی خوشامدیں کرتا، کبھی کھانوں کی تعریف کرتا کبھی اپنے لنچ بکس کی سینڈوچز اور بسکٹ پیش کرتا۔ لیمن ڈراپ اور کوکیز تو ہمیشہ خانساماں جی کے ساتھ شیئر کرتا۔

"تھوڑا دودھ چلے گا خانساماں جی۔" بڑی امید سے علی پرچ آگے بڑھاتا!

"ناں جی، دودھ تو موٹی بلی پی جائے گی علی بھائی۔"

"تم دو ناں۔ میں دودھ کو عین گملے کے پاس رکھوں گا تو وہ ضرور آئے گی۔ میں خود لالی کو بلاؤں گا سیٹی بجا کر۔"

"تم نے اس کا نام بھی رکھ لیا۔ کیا پتا بڑا ہو کر بلا بن جائے باگڑ بلا۔"

"نہیں، وہ بلی ہے۔ اچھا ہے ناں نام؟ وہ لالی، میں لالہ۔" چھوٹے علی نے کہا۔

"آپ کی مرضی علی بھائی، پر مجھے تو بلونگڑا لگتا ہے پورے کا پورا۔"

کچھ دیر اور منت سماجت کے بعد خانساماں جی نے ایک تریڑ آئی پلیٹ میں بڑے

حساب سے دودھ ڈالا۔ "علی بھائی دودھ لے لیں پر بیگم صاحبہ ناراض ہوتی ہیں جی۔"

اب دبے پاؤں علی پھاٹک کے پاس پہنچا، پرانی ٹھوکر لگی پلیٹ کو گملے کے پاس رکھا اور خود جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ ایک انتظار کے بعد بلی اور بلونگڑی آئیں۔ بلونگڑی بیگم تو دھوپ سینکنے بیٹھ گئی اور بلی چٹوری نے دودھ پر ہاتھ صاف کر لیا۔ علی چپکے چپکے پاس گیا تو چھو چھپ بلی، بلونگڑا دونوں غائب!

خانساماں جی اور علی سارا دن وقفے وقفے کے بعد بلونگڑے کو پکڑنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ اس اچھل کود، چھلانگ پھلانگ میں درخت، دیواریں، جھاڑیاں، کھڑکیاں ہر کونے کھدرے میں علی نے اپنی کوششیں صرف کیں، لیکن چھنال بلی نے چھوٹے بچے کو ایک ہی داؤ سکھایا تھا کہ بچہ جی سب کچھ کرنا، کسی کے ہاتھ نہ لگنا اور وہ بھی آدم زاد کے.... باقی راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ علی بے چارہ خانساماں جی کے باورچی خانے میں چلا جاتا۔ کاؤنٹر کے آگے اونچے سٹول پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلاتا رہتا اور بلونگڑے کی باتیں کرنے میں مگن رہتا۔

"آج میں رات کی رانی کی جھاڑی کے پیچھے چھپا رہا۔ کمینی بلی کوڑے کی بالٹی سے پھرولا پھرولی کرنے آئی تو وہ... میری لالی بھی ساتھ تھی... پتا ہے کیا کیا بلی نے..... جلدی جلدی خود ہی اکیلی اکیلی خانساماں جی پرچ میں سے سارا دودھ پیا اور... اور جب میں پہنچا تو یوکلپٹس کے درخت پر چڑھ گئی آرام سے....."

"کچھ نہیں ہو گا۔ بلونگڑا ہے، کہاں جائے گا۔ ذرا سا اور رام ہو لینے دو، میں چھابہ اوپر پھینک کر پکڑ لوں گا۔ تم فکر نہ کرو علی بھائی۔" خانساماں جی بولا۔

خواہش پوری نہ ہو تو فکر خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور وقت آپی آپ ضائع ہونے لگتا ہے۔ یہی لگن کی سٹیج تھی جب بہانے بہانے علی گھر رہنے لگا۔ کبھی سر درد، کبھی پیٹ میں تکلیف ہونے لگی۔ سکول سے پے در پے چھٹیاں ہوا کرتیں۔ سارا دن علی بے حد مصروف رہنے لگا۔ دودھ، قیمہ، مرغی، مچھلی، ہر قسم کا کمپا لگایا لیکن سب بے سود!

ان ہی دنوں میں کہیں سے سالانہ امتحان آ لگے۔ علی کتابیں کھول کر بیٹھتا لیکن کھڑکی کے پار لالی کو کھوجتا رہتا۔ ایک دن جب علی اپنی کتابیں کھولے خالی الذہن بیٹھے باہر کوڑے کی بالٹی کو تکے جا رہا تھا تو دادا ابا نے اس کی محویت دیکھ کر پوچھا "کیوں بھئی علی

میاں، اب تم کرکٹ کھیلتے نظر نہیں آتے؟"

"وہ دادا ابا امتحان ہیں ناں، ماما ناراض ہوتی ہیں۔" علی نے جواب دیا۔

"پھر تم کہانی سننے بھی نہیں آتے آج کل۔"

"وہ جی..... پڑھائی زیادہ ہے، وقت نہیں ملتا جی۔"

"ہوں.....!" دادا راکنگ چیئر میں جھولنے لگے۔

"اور وہ جو تم رو رہے تھے کل..... چپکے چپکے؟"

علی نے ہچکچاتے ہوئے اپنی لگن کی ساری کہانی کہہ سنائی۔

دادا ابا کو معاً کورٹ روم والا غصہ چڑھ گیا۔ کالا کوٹ پہن کر جب وہ کورٹ روم میں مقدمہ لڑا کرتے تھے تو ایسے ہی جھاگوں جھاگ ہو جاتے تھے۔ کچھ دیر منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہ "فنا فی العلی" ہو کر بولے: "لو یہ بھی کوئی بات ہے، ایک بلی کی خاطر ہمارا پوتا پریشان ہو۔ میں ابھی تلاش کرتا ہوں۔"

وہ پھن بھناتے کمرے سے خارج ہو گئے۔ چند دن وہ بھی بلونگڑے کو ہتھیانے میں لگے رہے، لیکن بی بلی نے بچے کو چھپت ہونے کا داؤ سکھا رکھا تھا۔ وہ دادا کے بھی ہاتھ نہ آیا۔ اخبار کے اشتہار دیکھے، جو کہیں بکاؤ بلی کا اشتہار مل جائے۔ خط بنوانے جاتے تو نائی سے کچھ بلونگڑوں کی باتیں کرتے۔ قصائی سے بھی ہر روز پوچھ گچھ ہوتی۔ قصائی بڑا گپی آدمی تھا۔ ہر روز بلی کا بچہ لانے کے لیے کہتا، پھر دوسرے دن بہانے بناتا۔ دوستوں کے گھروں میں فون کیے۔ کسی بلونگڑے کی خبر نہ ملی۔ علی کے دل کا یہ عالم تھا کہ اب اس نے فش اینڈ چپس بھی کھانے چھوڑ دیے تھے اور جب لائن کنگ کی فلم وی سی آر پر لگا کر ماما اپنے کاموں میں مشغول ہوتی تو وہ ٹیلی ویژن بند کر دیتا۔

ہر مشکل کی طرح پھر اچانک اس مسئلے کا حل بھی مل گیا!

دادا ابا جب مسلم ٹاؤن میں ہوا کرتے تھے، غفور مچھلی والا ہر ہفتے آیا کرتا تھا۔ اب اس کا پھیرا کبھی کبھار ڈیفنس کی جانب ہوتا تو وہ دادا ابا سے مل کر جاتا۔ دادا سرمئی مچھلی اور بلیک سامن کی فش فنگرز بنواتے اور ساتھ ساتھ سیاسی، معاشرتی گفتگو بھی چلتی۔

اس بار غفور آیا تو باتوں سے ابلا پڑتا تھا۔ سمندری سامن کی جلد چابک دستی سے اتارتے ہوئے بولا: "اوہ سر جی اس بار تو میری بلی نے تین بچے دیئے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے

کہ ان کو مچھلی کی کمی نہیں لیکن دو کمروں کے گھر میں انہوں نے آفت مچا رکھی ہے۔ پہلے ہی گھر میں آٹھ بلیاں گھسی رہتی ہیں، کچھ اپنی کچھ پرائی، اوپر سے پھر آ گئے تین اور بچے!"

دادا ایک دم بنچ سے اچھل کر اٹھے: "اوہو پا لیا... پا لیا... بیٹا غفور، ارشمیدس کا مسئلہ حل ہو گیا... پا لیا پا لیا!"

مچھلی والا ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ سوچنے لگا، واقعی دادا ارذل عمر کو پہنچ گئے..... جب آدمی بچہ بن جاتا ہے اور اگلی پچھلی ساری عقل و دانش جاتی رہتی ہے۔ ادھر دادا کو ارشمیدس جیسی خوشی ہو رہی تھی، جب اچانک اس نے باؤنسی کو دریافت کر لیا تھا۔

"پا لیا... پا لیا... بلی کا بچہ پا لیا۔ چلو... چلو ابھی چلو....." دادا نے گیلری میں شور مچا دیا۔ علی بلونگڑے کی تاک میں تھا۔ کھڑکی سے کود کر باہر بھاگا۔

"اوہ سر جی ابھی نہیں۔ چار بجے مچھلی بیچ کر گھر پہنچوں گا۔ آپ آ جائیں علی میاں کو لے کر۔ یہ بھی پسند فرمائیں۔ دو تو کالے بچے ہیں سیاہ رات جیسے اور ایک ہے زرد..."

"میں تو زرد بچہ لوں گا۔ میں لالہ وہ لالی....."

"شام کو چار بجے۔"

"شارپ! ہمیں انتظار نہ کرانا... مچھلی والے۔" سائیکل پر جاتے ہوئے غفور کے پیچھے علی چلایا۔

صبح دس سے شام چار بجے تک کے وقت کا ہر پل، سال بن کر گزرا۔ علی کی بے قراری دیکھ کر ماما نے علیحدگی میں اپنے میاں سے کہا: "بس ابا جی بھی حد کرتے ہیں۔ بھلا علی کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ آخری پرچہ باقی ہے، وہ تو ہو لینے دیتے۔ سارا دن بلی کے گرد گھومے گا۔ پڑھے گا یہ خاک... ابا جی کی بھی مت ماری گئی ہے سچ۔"

"کیا ہے، پڑھ لے گا۔ شوق ہے بچے کا۔ کیا پتا شوق پورا ہو تو اور بھی لگن سے پڑھے.....!"

پورے پونے چار بجے، دادا ابا نے اپنی پرانی فوکسی گاڑی نکالی۔ خانساماں جی اور علی کو لے کر وہ بڑے شوق سے بلی کا بلونگڑا لینے گئے اور بلی کے زرد بچے کو ٹیلی ویژن کے خالی کارٹن میں قید کر کے لے آئے۔ گھر آتے ہی پلیٹ میں دودھ ڈال کر پیش کیا گیا۔ دو چار کھلونے بلونگڑے کے آگے رکھے اور اطمینان سے علی لائن کنگ کی فلم وی سی آر پر لگا

کر دیکھنے لگا۔ پڑھائی کی طرف بھی توجہ دی۔

رفتہ رفتہ کرکٹ کے دوست آنے لگے۔

علی نے فش اینڈ چپس کی فرمائش شروع کر دی۔

کچھ اور عرصہ گزرا تو علی بھولنے لگا کہ لالی کو دودھ ڈال کر دینا ہے۔ رفتہ رفتہ خانساماں جی باورچی خانے کی بیرونی سیڑھیوں پر دودھ بھری پرچ رکھنے لگا۔ وہ بھی بھول جاتا تو بلونگڑا کوڑے کی ٹوکری میں منہ مارنے لگتا۔

بلونگڑا اب بلی بن گیا تھا اور یہ بلی سارے گھر کی بلی تھی۔ اگر وہ نہیں تھی تو علی کی بلی نہیں تھی۔ جہاں بلی ہوتی، علی وہاں سے کھسک جاتا۔ کبھی کبھی وہ خانساماں جی سے کہتا:

"یہ تو وہی بلی بن گئی ہے جو کوڑے پر آتی ہے.... ذرا اچھی نہیں لگتی لمبی سی، زرد سی۔"

پھر ایک دن اس نے ماما کو نرم پاکر فرمائش کی:

"ماما آپ بلی کا ڈبہ گیراج میں رکھ دیں پلیز۔ مجھے یہ رات کو پڑھنے نہیں دیتی۔"

یوں گھر میں رہنے والی بلی گیراج میں سونے لگی۔ گھر کی باہر والی دیوار پر چڑھ کر اونگھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے جب وہ علی کی بلی نہ رہی تو کسی کی بھی بلی نہ رہی۔ پھر خانساماں جی جب اسے دودھ، قیمہ نہ دیتے تو وہ کوڑے کی بالٹی گرا کر اس کے کچرے کو پھرولنے لگتی۔ آہٹ پاکر یوکلپٹس کے درخت پر یوں چڑھ جاتی جیسے بے گھر آوارہ بلی ہو!

دادا ابا اپنی راکنگ چیئر میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

ڈاکٹر بھیا دوبئی سے لوٹے تھے اور ابھی گھر کا جغرافیہ، ہسٹری ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ماما حسب سابق کبھی ہنستی اور کبھی دھاروں رونے لگتی۔ ہاں ابو خوب غصے میں تھے۔

"یہ ٹیلی فون کا بل ہے، ٹیلی فون کا۔ اتنا بل تو میرے موبائل کا بھی نہیں آتا۔"

چھ فٹا علی، دادا کی کرسی کے پیچھے مجرم بنا کھڑا تھا۔

"یہ ... یہ پیٹرول کا بل ہے بیگم صاحبہ..... تمہارے بیٹے کو کیا پروا۔ بھری ٹینکی دیکھ کر تو یہ گھر پر رہ ہی نہیں سکتے۔ پاگل کتے کی طرح پھرتے ہیں، سارے عالم میں۔"

"ہاں جی سارا قصور میرا ہے، میرا.... مجھے جوتیاں ماریے۔" ماما بولیں۔

"ایسے ہی حالات رہے تو میں ٹھوٹھا پکڑ کر چوراہے پر مانگنے نکل جاؤں گا۔ ادھر لال

بتی جلی، ادھر کار والوں سے مانگتا پھروں گا۔ کسی دن خوش قسمتی سے کسی کار تلے آگیا تو خس کم جہاں پاک....."

سارے گھر والوں نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ پر اونچا سننے، کم دیکھنے اور ساری باتیں بھول جانے والے دادا ابا چلائے: "اس میں ڈانٹنے کی کیا بات ہے؟ اچھی شکل و صورت کی لڑکی ہے، علی بینک میں ملازم ہے، شادی کر دو... اپنے خرچے خود چلائے۔ دراصل اس کی ماما کو پروا نہیں.... شوق ہے بچے کا، پورا کر دو!"

"آپ ہر مسئلہ کسی اور سمت میں الجھا دیا کریں ابا جی.... پتا نہیں ماں باپ کا ادب کرنے کی، پہلے پہل کس کو سوجھی تھی!" بھن بھن کرتے ابو کمرے سے نکل گئے۔ ڈاکٹر بھیا بھی کان کھجاتے اپنے کمرے میں سٹک گئے۔

"علی کچھ عقل کیا کر... اب جو تیرے ابا کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تو کون والی وارث ہے....!" ماما بولیں۔

"تم.. تم ماما... تم والی وارث ہو۔"

"میں دادا ابا؟" ماما ابرو اٹھا کر خفگی سے بولی۔

"اگر جو تم خدا بننا چھوڑ دو.... تو ہم بندوں کو عقل نہ آجائے!"

ماما پاؤں پٹختی باہر نکل گئیں۔

"او میاں صاحب زادے باہر نکلو، آخر کو یہی بڈھا کام آئے گا تمہارے..... نکلو پیچھے سے.."

علی راکنگ چیئر کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں حضرت! یہ معاملہ کیا ہے؟ راتوں کو جاگنا، دن کو غافل رہنا، کم کھانا، چپ چپ رہنا..... مردم بے زاری، دل آزاری، خواری، یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ نہیں دادا ابا!"

"خیر، سعادت مند اولاد ایسے ہی کہا کرتی ہے.... بتاؤ سیدھی طرح، تمہیں عائشہ کیسی لگتی ہے؟"

"اچھی ہے دادا ابا۔"

"کس قدر اچھی، لاڈلے میاں؟ ٹینس جتنی.... فش اینڈ چپس جتنی یا موٹر سائیکل

جتنی؟"

"میں اب بچہ نہیں ہوں دادا جی۔" علی شرمندہ ہو کر بولا۔

"چلو یہ بتاؤ دو انکری منٹ جتنی، یورپ ٹور جتنی یا پجیرو جتنی؟"

"آپ مذاق کرتے ہیں جی۔" علی نے جواب دیا۔

خاموشی کا لمبا وقفہ گزرا۔

"چھوڑیں دادا جی، جانے دیں۔" علی نے جواب دیا۔

"خوبصورت لگتی ہے؟" دادا نے اصرار سے پوچھا۔

"بہت....!"

"ہر وقت پاس رہنے کو جی چاہتا ہے؟"

"جی!"

"اس کے لیے کچھ بڑا کام کرنے کو دل اکساتا ہے.... مثلاً جان سے گزر جانے کا ارادہ، ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی خواہش، ماں باپ کو گولی مار دینے کا خیال؟"

"بس کچھ ایسا ہی ہے دادا جان۔" علی نے منہ پھیر کر کہا۔

"بس تو پھر شادی کر لو۔ لڑکی خوبصورت ہے، دبا کے جاہل ہے، سگھڑپن چھو کر نہیں گیا۔ بہت جلد تم کو اپنے میکے گھر کا فرد بنا لے گی۔ یقین رکھو تم ایسے اچھے شوہر بن جاؤ گے کہ تمھارے ماں باپ تنکے چُگتے پھریں گے۔ تاخیر نہ کرو علی میاں.... سنہری موقع ہے۔ جو تھوڑا بہت چھل کپٹ تمھارے ماں باپ کے دل میں ہے، وہ میں نکال دوں گا۔"

"سب کچھ ٹھیک ہے دادا ابا.... نہ عائشہ نہ اس کے گھر والے، نہ ماما ابو، کوئی بھی خلاف نہیں.... بس مجھے اپنے پر اعتبار نہیں دادا جی.... اپنے شوق پر اعتماد نہیں۔ میری آگ اسی وقت بھڑکتی ہے جب جلنے کو کچھ نہ ہو.... ادھر یافت ہوئی، آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ میں.... اپنی محبت، شوق، عشق کسی پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا دادا جی۔"

دادا نے سر جھٹک کر سوچا....

"شوق بھی عجب وارداتیا ہے.... انگاروں سے فائر کرتا ہے اور بجھی راکھ چھوڑ کر چمپت ہو جاتا ہے!"

دادا بھی ساری عمر اس شوق کے ہاتھوں تنگ رہے تھے..... دل میں داخل ہوتا تو ہاتھی کی طرح مست خرام اور نکلتا تو دل کو چوہے کی طرح بزدل بنا کر چھوڑ جاتا!

نفسِ نارسا

اندھیرے بنچ پر بیٹھے ہوئے پرانے خیال خزاں دیدہ پتوں کی طرح تحسین پر گر رہے تھے۔

ماں کا خیال تھا کہ تحسین بہت زیادہ پڑھ لکھ کر وکیل بنے گا اور پھر ساری زمینیں چچا قادر علی سے چھڑائے گا۔ لیکن تحسین سے بی اے کے دو پرچے چھوٹ گئے۔ وہ سوتا ہی رہ گیا اور اکنامکس اور انگریزی کا پرچہ بی جن کی تیاری دوسرے پرچوں سے زیادہ تھی، دیئے نہ جا سکے۔ حویلی واپس پہنچ کر وہ سمجھ نہ پایا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

"تحسین! ہمت نہ ہار — واپس جا کر بی اے کر آ — ابھی میرا کافی زیور باقی ہے —"

"اماں پتہ نہیں کیوں میرا دل نہیں لگتا پڑھائی میں —"

ماں کی بڑی بڑی ڈنڈیاں ڈولنے لگتیں — "ایسے نہیں کہتے۔ تیرے ابے کو کتنا شوق تھا پڑھائی کا — وہ کہتا تھا دیکھنا میں اپنے تحسین کو ولایت بھیجوں گا، وہاں سے وکیل بن کر آئے گا۔ چل اور کچھ نہیں تو ان کا شوق ہی پورا کر دے —"

"میں کوشش تو کرتا ہوں بے بے پر مشکل ہے —"

جب وہ گاؤں میں رہتا تو شہر کے خواب پریشان کرتے — جب وہ شہر پہنچ جاتا تو پھر گاؤں کی یاد ستانے لگتی — وہ کہیں موجود ہی نہ تھا، نہ شہر میں اور نہ گاؤں میں — شاید اس کا اصلی بسیرا ان خوابوں میں تھا جو کھلی آنکھوں دیکھے تو جاتے ہیں — لیکن جن کو پورا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

اسی لئے وہ کبھی محبت نہ کر سکا۔ محبت میں جان سے گزر جانے کی شرط وہ پوری نہ

کر سکتا تھا۔ ہر محبت میں وہ اپنی ذات کی محبت کا خمیر ضرور ملا دیتا۔ وقت گزرنے پر یہی ذات پھول کر ہر دوسری محبت کے اصل کو کھا جاتی۔ تحسین اس قدر خوبصورت تھا کہ عاشق ہونے سے پہلے وہ محبوب بن جاتا۔ باپ کی زمینوں پر چچا کے قابض ہو جانے کے باوجود پیسے کی قلت تھی نہ سلاموں کی۔ گاؤں والے اسے چڑھتے سورج کی طرح عقیدت واگزار کرتے —— گاؤں کی ساری کنواریوں کا وہ من چاہا دولہا تھا۔ دولت، حسن، خوش اطواری، خوش لباسی سب نے مل کر اس سے محبت کرنے کا حق چھین لیا تھا۔ وہ جب بھی محبت کرتا، اس کے عوض اسے اتنی زیادہ پرستش مل جاتی کہ ذات کی محبت کا رسہ اور مضبوط ہو جاتا اور محبت کرنے کا تجربہ بی اے میں چھوٹ جانے والے پرچوں کی طرح اسے فیل کرا دیتا...

جن دنوں وہ بی اے ادھورا چھوڑنے کے بعد گاؤں واپس آیا، وہ بڑا ہی بے کار تھا۔ اس بے کاری کے عہد میں مگرمچھ کی طرح کبھی پلنگ پر لیٹتا کبھی بڑے سندھی جھولے میں پڑا جھولتا۔ پہلے بھی وہ ثنا بیگم سے متاثر تھا لیکن اس بار تو گویا اس شہد رنگی آنکھوں والی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ثنا کے بالوں میں تیل چپڑا ہوتا لیکن اس کے بال کسی Blond کی طرح بالکل بھورے تھے۔ ثنا اُسے مورچھت کر دیتی، پھر غشی کے سے عالم میں وہ گھگھیاتا پھرتا۔ دہلیز میں کھڑا، پھاٹک سے لگا، آنگن میں بھٹکتا تحسین مکمل التجا تو تھا ہی —— لیکن وہ یہ التجا ثنا کے حضور کر نہ سکتا تھا کیونکہ اُس نے بچپن سے اپنی اتنی پوجا کی تھی کہ کسی اور کے حضور جھکنا ممکن نہ تھا۔

ایک شام ثنا بیگم زوم کر کے اُس کے فوکس میں آ گئی۔

سورج غروب کا عالم تھا۔ آنگن، بڑے پھاٹک اور گیروے رنگ کی دیواروں پر سورج کی گہری نارنجی روشنی سرچ لائٹ کی طرح پڑ رہی تھی۔ اس وقت ثنا مالٹوں سے بھرا ٹوکرا سر پر اٹھائے بڑے پھاٹک کے پہلو والے دروازے سے داخل ہوئی۔ اُس کے بھورے بال، شہد رنگی آنکھیں، کیسری لباس، سر پر دھرے مالٹے سب کچھ ڈوبتے سورج کی شعاعوں میں آگ پکڑ گئے۔ ثنا نے منہ میں نارنجی رنگ کا پھول دبایا ہوا تھا۔ پتہ نہیں گلاب کا پھول تھا کہ گیندے کا، تحسین اس نارنجی تصویر میں گم ہو گیا —— لیکن اپنے آپ کو ارپن کرنے کا تجربہ پھر بھی نہ ہو سکا۔

اس میں شاید یہ صلاحیت تھی ہی نہیں —— ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی اذیت پسندی نے اس خوبی کو زنگ لگا دیا ہو..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ اُسے قدرت سکھانا چاہ رہی تھی، وہ سبق ابھی تک اُس نے سیکھا ہی نہ ہو۔

وجہ —— آخر کیا وجہ تھی کہ ایک بار گرنے کے بعد وہ برسوں اپنے پینڈے پر کھڑا نہ ہو سکتا؟

شاید.... شاید.... وہ دیر تک سوچتا رہا ——

اسے اپنے آپ سے بھی محبت تھی اور ثنا بیگم سے بھی!

وہ اپنے خاندان سے بھی پیار کرتا تھا اور اپنے آپ سے بھی!

اسے مذہب سے بھی عقیدت تھی اور اپنے آپ کو بھی وہ چھوڑنا نہ چاہتا تھا!

کبھی اپنی ذات کا پیار انا میں بدل جاتا..... کبھی جھک کر سمجھوتہ کرنے کی نوبت نہ آتی.... کبھی خود ترسی اور نرگسیت اُسے معجوب کئے رکھتی —— خود پرستی نے اُسے ہمیشہ ہر سفر میں معلق رکھا۔ اگر کبھی کسی وقت وہ اپنے آپ کو بھول کر کسی شخص، مسلک، تحریک یا خدا سے منسلک ہو جاتا تو اس کی سمت مقرر ہو جاتی لیکن وہ مصلوب کبھی نہ ہو سکتا تھا۔ مشکل یہی تھی کہ ہر مقام اور وقت میں وہ لحہ بھر کو بھی اپنا آپ بھلا نہ سکا..... مگر خود انا ہر وقت، گداگر صورت اس کے ساتھ ساتھ رہتی۔ ہر محبت، سمت، مسلک کو اسی نے گڑبڑا کر اندھلا کر دیا۔

سٹریٹ لائٹیں بند تھیں، پارک میں لگے بلب روشن نہ تھے لیکن فاصلے سے کچھ بچوں کے بولنے، چلانے، ہنسنے کی صدائیں صاف آ رہی تھیں —— بہت برس ادھر اسی طرح ثنا کی آواز بلاوجہ اُس کے کانوں میں آتی رہتی تھی۔

تب وہ اپنے والدین کے ساتھ حویلی میں رہتا تھا۔

کھیتوں میں چلتے پھرتے، گھر کے کام کاج کرتے ہوئے، بکریوں بلیوں مرغیوں کی طرح الل ٹپ ثنا بیگم جگہ بہ جگہ پھرتی نظر آتی —— دیہاتی پالتو جانوروں کی طرح اُس کا نہ تو کوئی ٹھور ٹھکانہ تھا نہ ٹائم ٹیبل۔ وہ کسی وقت بھی آ جاتی اور ہر وقت کھا سکتی تھی۔ گاجر، چھلی، مولی، قسم قسم کے موسمی پھل، سنگھاڑے، شکرقندی، لیموں، اچار.... اُس کے منہ تک پہنچ جاتے۔ وہ گائے، بھینسوں کی مانند چرتی، چگتی رہتی —— عموماً وہ خاموش رہتی لیکن ایسے

میں اُس کا جسم بولتا رہتا — یا پھر وہ بولتی تو بولے چلی جاتی — یا کھاتی، چباتی، نگلتی نظر آتی- وہ خود بڑے مزے سے زندہ تھی اور دوسروں کے جینے، بولنے، کھانے پینے اور زندہ رہنے پر اُسے کوئی اعتراض نہ تھا- زندگی کے پانیوں پر وہ چھوٹے سے بجرے پر سوار دھارے کے ساتھ بہہ رہی تھی- پانی میں گر جاتی تو دوبارہ بجرے کا کونہ پکڑ کر اندر سوار ہو جاتی- پن ڈبی ان ڈبکیوں کو فوری بھول جاتی جو گرنے پر اُس نے کھائی تھیں — گاؤں کی بہت سی لڑکیاں رنگین کلپ، پلاسٹک کی رنگ دار جوتیاں، بھڑکیلے شوخ رنگوں کے لباس پہنے حویلی میں آیا کرتی تھیں..... تحسین کسی کی طرف مائل نہ ہوا — لیکن جسم، آنکھوں اور دہن سے زندہ رہنے والی صرف سنا بیگم کی کہی اَن کہی باتوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا-

حویلی ایک ڈھنڈار سی جگہ تھی جو تحسین کے والد فوت ہو جانے پر کھنڈر میں بدل گئی- زمینوں پر چچا قابض ہو گئے- وہ پڑھنے کے لئے شہر چلا گیا- لمبی ناک والی اُس کی ماں اب دبدبے والی عورت نہ تھی- اماں شترمرغ سے بہت زیادہ پروں والی مرغی بن گئی-

تحسین پارک کی بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا اور اپنی کتاب زیست کو اِدھر اُدھر کھول پھرول کر دیکھ رہا تھا-

لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے پارک میں اندھیرا تھا- سڑک کی بتیاں بھی بند تھیں- رکشے، لوڈر، کاریں، موٹر سائیکل نظر نہ آتے تھے- صرف مکینکل شور اور بتیوں کی روشنی دور سڑک پر ریلے کی طرح آ جا رہی تھی- پارک میں ہوا ٹھہری ہوئی تھی اور باسی پانیوں کی باس ہوا میں ہولے ہولے اُتر رہی تھی-

تحسین نے آسمان کی جانب نگاہ اُٹھائی- ایک ہوائی جہاز ائیرپورٹ کی طرف رفتہ رفتہ اُتر رہا تھا- جہاز کی گڑگڑاہٹ اور بتیوں کا پینتالیس ڈگری کا جھکاؤ ظاہر کرتا تھا کہ ایئرپورٹ کچھ ایسا دُور نہیں- چند دن پہلے وہ بھی ہوائی جہاز سے لاہور کی جانب سفر میں تھا- عین اسی وقت ایئرہوسٹس اُسے کھانے کا ٹرے پکڑا رہی تھی- لڑکی کے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ اور آواز میں تربیت شدہ مٹھاس تھی — سائنس بھی کیا شعبدہ باز تھی..... ہوا میں کھانا کھلا رہی تھی اور ایسی مسکراہٹوں کو جنم دے رہی تھی جن کا سچائی سے کوئی تعلق نہ تھا-

تحسین نے سڑک پر نگاہ کی، پھر آسمان کو دوبارہ دیکھا — آسمان اور زمین پر لوگ آ جا رہے تھے- کار، لوڈر، رکشا، بسیں سڑک پر رواں دواں تھیں- ہوائی جہاز میں لوگ سیٹ بیلٹ لگا رہے تھے- لیکن بتیوں کے علاوہ اُن کے وجود کی کوئی شہادت نہ تھی- شاید پارک کے اندھیرے میں دوسری جانب بھی لوگ موجود تھے لیکن بچوں کے چیخنے چلانے، عورتوں کے ہنسنے کے علاوہ لوگوں کی کوئی شہادت موجود نہ تھی..... ایک معمولی سی لوڈشیڈنگ نے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان بڑی خلیج پیدا کر دی تھی- کوئی ایسا شخص جو شعبدوں سے ناواقف اور انہونی کا قائل نہ ہو، سوچ نہ سکتا تھا کہ آسمان میں مخلوق اُڑی جا رہی ہے اور سڑک کی ٹریفک میں زندہ لوگ سوار ہیں-

تحسین نے اپنا سر جھٹک کر اپنے آپ کو بنچ پر محدود کرنا چاہا- آج کے تہذیبی بھنور سے نکل کر سوچنا چاہا کہ وہ خود کہاں ہے..... آسمان پر، زمین کے اُوپر؟..... یا وہ معلق ہے..... مکڑی کی طرح جالے بنتی زندگی میں..... اَدھ مری مکھی کی طرح جالے کے اندر..... وہ ہوا میں..... پاتال کے اندر..... یہاں وہاں کہیں بھی نہ تھا- بھلا ایسے انسان کو کیا کہتے ہیں جو نہ کسی سمت..... نہ ہی کسی کھونٹے..... نہ ہی کسی عہد میں مقید ہو- اُسے ایک چھوٹا سا کھلونا یاد آ گیا — یہ کھلونا اُس نے فرینک فرٹ کی ڈیوٹی فری شاپ پر دیکھا تھا..... چھوٹا سا بونا..... جس کے پیندے میں شاید سیسہ بھرا تھا- اُسے جیسے کیسے دباؤ، الٹا سیدھا رکھو..... کسی کروٹ پر لٹاؤ، وہ فٹافٹ اپنے پیندے پر کھڑا ہو جاتا- تحسین کو یہ کھلونا دیکھ کر محسوس ہوا تھا کہ یہ کھلونا ماڈرن عہد کا کھلونا ہے بھی اور نہیں بھی ہے — کسی اور زمانے میں جب سرمایہ داری نظام نہ تھا، انسان زراعت کے سہارے زندہ تھا- کھیتیاں لہلہاتی تھیں- انسان نے جینے کے لئے اتنے کھیکڑ نہیں پالے تھے — تب انسان گر کر کپڑے جھاڑ کھڑا ہو سکتا تھا..... یا شاید اب اتنے سارے حملے سہہ کر اُس میں قوت مدافعت کا سیسہ بھر گیا تھا اور وہ مکا، کلاشنکوف، بے عزتی، بے علمی، بہت ساری مار کھا کر بھی اپنے جوتوں میں کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا-

اندھیری بنچ پر بیٹھے بیٹھے اس نارنجی شام نے ایک بار پھر تحسین کا محاصرہ کر لیا.....

دُور سے یوں لگتا تھا جیسے سنا نے مُنہ میں بھڑکتا انگارہ پکڑ رکھا ہے-

ہتھی والے نلکے کے قریب تخت پوش پر بیٹھا نیل کٹر سے وہ اپنے ہاتھوں کے ناخن

کاٹ رہا تھا۔ سنا کی ہم شکل ایک روسی لڑکی کی تصویر اُس نے لاہور میں دیکھی تھی۔ فوٹوگرافر نے کریملین کے سامنے نارنجی فلٹر لگا کر لڑکی کا کرشمہ جگایا تھا — اس وقت آگ پکڑی سنا آگے بڑھی تو تحسین کا جی چاہا کہ وہ ہوز پائپ سے اس بھڑکتی آگ کو بجھا دے۔ بڑے ہوٹل، سینما گھر، سکائی سکریپر اور کئی منزلہ بلڈنگوں میں اگر آتش زدگی کا واقعہ ہو جائے تو ایسے راستے اور سیڑھیاں موجود ہوتی ہیں جن سے لوگ فرار ہو سکتے ہیں..... لیکن کھلے پھاٹک، ٹوٹی دیوار کے باوجود کوئی چور راستہ ایسا نہ تھا جس سے وہ اس غروب آفتاب کے منظر سے فرار ہو سکتا۔

تحسین گرفتار ہو گیا..... لیکن اُس کے اندر بیٹھی ہوئی اپنی ذات کی گرفتاری نے اسی وقت نالش کر دی اور آزادی کے لئے لڑنا بھڑنا شروع کر دیا۔ اس لڑائی بھڑائی کا اولاً تحسین کو علم نہ ہوا۔ کچھ بننے بگڑنے سے بہت پہلے تحسین اور سنا ایک رات بڑے شاہ صاحب کی کار میں لاہور پہنچ گئے۔ تحسین نے سنا کو اپنے فلیٹ میں لے جانے سے پہلے مسجد کا رخ کیا اور سنا بیگم سے نکاح پڑھوا لیا۔ یہی وہ وقت تھا جب پہلی بار تحسین کو سنا بیگم اپنے اصلی روپ میں نظر آئی۔ وحدت کالونی کے چھوٹے سے فلیٹ میں سنا بھوری سنہری تو رہی لیکن اس پیلی بدرنگ بلی کی مانند جو نالیوں، گلیوں میں جان بچائے پھرتی ہے۔ اُس کا کوئی علمی، فیشنی، دولتی تشخص نہ تھا۔ ایسی شناخت کے بغیر شہری زندگی کے تاروپود میں رنگ بھرنا مشکل ہو جاتا ہے — تحسین نے کالج میں دوبارہ داخلہ لے لیا اور سنا کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اتنے بڑے حادثے کی گاؤں والوں کو کوئی اطلاع بھیجی نہ ہی اپنی ماں کا کبھی خیال آیا۔ وہ جانتا تھا گاؤں والے اتنے جاندار نہ تھے کہ کسی بڑے آدمی کے خلاف ایف آئی آر کٹا سکیں۔ بہت دنوں بعد اُسے علم ہوا کہ اسی رات گجر یوسف کا بیٹا بھی گاؤں سے بھاگ گیا تھا۔ سنا کے بوڑھے ماں باپ نے اسی کے ساتھ اپنی بیٹی کے اغوا کو منسوب کر دیا — اور گجر یوسف کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے۔

تحسین اپنی ماں کے ساتھ محبت ضرور کرتا تھا لیکن ماں کے ساتھ گزارے ہوئے واقعات، یادیں اسے کبھی گداز نہ کر سکیں۔ ماں اگر دُکھ بھری زندگی گزار رہی تھی تو ان دُکھوں کا مداوا تحسین کے پاس نہ تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر لایعنی گفتگو نہ کر سکتا تھا —

تحسین اور ہر دوسرے کے درمیان یہی گونگا پن حجاب تھا۔ وہ کسی سے کیا کہے..... کیسی باتیں کرے.... ذات کی محبت کا اندھا شیشہ ہمیشہ درمیان میں حائل رہتا۔ اُس کے دوست، ماں اور سنا جب تک بولتے، وہ بور ہوتا۔ ان باتوں میں اُس کی اپنی ذات کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب اُسے بات پر آمادہ کیا جاتا تو وہ بھی بالکل فروعی باتیں کرتا۔ اُسے لگتا اگر وہ اندر کی بہت گہری باتیں کرے گا..... اپنے جذبات، احساسات، کمینگی، توڑ پھوڑ کا ذکر ہو گا تو اُس کے بعد وہ اپنے دل کے قفل کی چابی کسی اور کے حوالے کر دے گا۔ ہر چوری پکڑی جائے گی — اپنے اوپر کسی قسم کا تحکم وہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔

سنا بیگم کچھ تو شہری ماحول سے گھبرائی، کچھ تحسین کی خاموشی نے اُسے تار تار کر دیا۔ جب تحسین کالج سے لوٹتا تو سنا بیگم بھاگ کر تیل کا چولہا جلاتی اور تازہ روٹیاں پکانے لگتی۔ وہ اسی قدر سیکھ پائی تھی کہ گرم پھلکا، دیسی گھی میں پکا سالن اور صاف ستھرے برتن اظہار محبت کی انتہا ہیں۔ تحسین پر یہ وقت بہت بھاری ہوتا۔

خاموشی کے لمبے لمبے وقفوں اور بے معنی "ہوں ہاں" سے دونوں مجروح ہوتے۔

"روتی کیوں ہے سنا....؟"

سنا تیل کے چولہے پر روٹی سینکتی، دوپٹے کے پلو میں سوں سوں کئے جاتی۔

جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو ہر رابطے کو پھپھوندی لگ جاتی ہے اور دوستی کا ہاتھ بڑھانے کو جی نہیں چاہتا۔

"میرے امتحان قریب ہیں۔ میں جانتا ہوں میں تمہیں وقت نہیں دے سکتا لیکن ایک بار انہیں ختم ہو لینے دو پھر میں تمہیں سیر کراؤں گا سارے شہر کی —"

"مجھے سیر نہیں چاہیے شاہ جی —"

"پھر اور کیا تکلیف ہے؟" تحسین احساس جرم تلے پوچھتا۔

"کوئی تکلیف نہیں جی — بس"

"کھانے پینے کی.... کپڑے لتے کی؟ — آرام کی؟ —"

"ناں جی — کوئی نہیں —" اُس کی سسکیاں اونچی ہو جاتیں۔

"گاؤں یاد آتا ہے —؟"

سنا بیگم اثبات میں سر ہلاتی اور ہاتھ کے پچھلے حصے سے آنسو پونچھتی۔

"تم گاؤں جا سکتی ہو.... کم از کم میں تو ابھی وہاں نہیں جا سکتا...."

"کیوں جی؟ —"

"میرے لئے گاؤں ختم ہو گیا سنا بیگم، خواب ہو گیا۔ میں وہاں کیا مُنہ لے کر جاؤں؟ میرے لئے اُدھر کوئی گاڑی نہیں جاتی —"

لمبی آہ بھر کر سنا ہاں میں ہاں ملا دیتی۔ وہ بچپن سے بڑوں کی ہاں میں ہاں ملاتی آئی تھی۔ اپنے آپ کو بھول جانا اُس کے لئے آسان تھا۔

"اب سنا بیگم ہمیں اپنا سارا کچھ ایک دوسرے کو سمجھنا پڑے گا۔ پیسے کی کمی نہیں، میں تیرے آرام کا بڑا خیال رکھوں گا۔ —"

"آرام؟ — وہ کیا ہوتا ہے؟" سنا بیگم نے دل میں سوال کیا۔

"اگر تو گاؤں گئی ناں تو تیرے بھائی تیرے دو ٹوٹے کر دیں گے —"

"کر دیں دو ٹوٹے.... کر دیں بڑی خوشی سے جی....."

"محلے کی عورتوں سے میل جول بڑھا لے، تیرا دل لگ جائے گا —"

"نہ ان کو میری سمجھ آتی ہے نہ مجھے ان کی — میل جول میں کیا بڑھاؤں شاہ جی۔"

محلے کی مڈل کلاس عورتیں اپنی نفرتوں، حسد اور غیر ضروری افواہوں کو بنیادی ضرورتوں کی طرح استعمال کرتی تھیں۔ اس میں اُن کا تحفظ بھی تھا اور رنگینی بھی۔ چغلی، غیبت، دوسروں کو نصیحت خود میاں فصیحت پر عمل کر کے اُن کے بہناپے، دوستیاں، رشتہ داریاں چل رہی تھیں۔ جو بھی سنا بیگم سے ملنے آتی، پہلے تو اُس کی معلومات بڑھاتی پھر شہری زندگی کے آداب سکھاتی۔ پھر ملنے ملانے والیوں کے کردار پر روشنی ڈالتی اور اگر وقت بچ نکلتا تو کھانے پینے کے طریقے، شوہر کو قابو میں رکھنے کے سنہری اُصول سمجھا کر جاتی — سنا بیگم جیتے جاگتے دیہاتی معاشرے سے آئی تھی اور خود بہت سگھڑ کڑھی منجی ہوئی تھی۔ وہ گلی والیوں سے متاثر نہ ہوتی اور نہ ہی اس میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ شہری خواتین کو کسی طور اپنی تانت میں کس سکتی۔ ہولے ہولے اُس نے ملنا ملانا چھوڑ دیا۔ اب وہ سارا دن اپنے اور تحسین کے متعلق سوچتی رہتی۔ سنا بھوری کو سمجھ نہ آئی کہ تحسین اُس سے آخر چاہتا کیا ہے؟ جب وہ تحسین کو پا کر اُسی کے رنگ میں رنگی گئی تو پھر تحسین

کو اور کیا درکار تھا؟ شام کو تحسین کچھ ایسا بکھرا بکھرا داخل ہوتا کہ سنا بیگم اپنے آپ کو نربل محسوس کرتی۔ اُسے لگتا جیسے تحسین اُس سے گلو خلاصی کرانا چاہتا ہے — تحسین کو اپنی بغّل میں نہ چھپا سکنے کا بھوری کو کچھ ایسا دُکھ ہوا کہ وہ چپ چپ رہنے لگی۔ تحسین جب کالج چلا جاتا تو وہ آنگن میں جاتی۔ تار پر گیلے کپڑے ڈالتی اور پھر بے چاری من مرو منڈیروں کو تاکنے لگتی۔ گاؤں سے کبھی کوئی نہ آیا لیکن اگر کوئی ڈوم کوا بھی اُس کے کسل کو دُور کرنے کے لئے کسی بنیرے پر آ کر کائیں کائیں کرنے لگتا تو اُس کا دل اُمید سے بھر جاتا۔

تین سال یونہی گزر گئے۔ اس دوران تحسین نے کئی کام کئے۔ اُس کے پاس اس قدر اثاثہ تھا کہ اگر وہ چاہتا تو شاندار کوٹھی خرید کر بڑے لوگوں کی زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں اُسے یقین ہو گیا کہ سنا بیگم دیہات میں اس قدر گندھی ہوئی ہے کہ وہ ماڈرن لوگوں کے احاطوں کو پھلانگ نہیں سکے گی۔ تین سالوں بعد تحسین ایک مشہور پینٹ کمپنی میں سیلز مینجر ہو گیا۔ بازاروں میں گھومنا، سیل پروموشن کے لئے مختلف قسم کے بینر چھپوانا، انڈسٹریل میلوں اور ہارس شوز پر اپنی کمپنی کے سٹال لگانا، کمپنی کا عطا کردہ سیل ٹارگٹ پورا کرنا ایک پورا جال در جنجال تھا..... لیکن تحسین خوش تھا۔ اس کام میں اتنی بھاگ دوڑ، جھوٹ، پی آر ہوتی کہ شام تک وہ محسوس کرتا کہ اُس میں بھس بھرا ہے — وہ کھانا کھا کر بستر میں دبک جاتا۔ سنا سارا دن دو کمروں میں مقید رہ کر تازہ دم ہوتی۔

ان دونوں میں انرجی لیول کے جھگڑے کا بھی اضافہ ہو گیا۔

تحسین اپنی ساری تازگی، طاقت، ہمت گنوا کر گھر میں وارد ہوتا۔ سنا اُس کی چارپائی کی پائینتی خوش باش بیٹھ کر اُس کی ٹانگیں، پاؤں دبانا چاہتی۔ سکون پہنچانے کا یہ طریقہ مدتوں سے اُس کے لہو میں گردش کر رہا تھا۔ کمی کمین صدیوں سے دو چیزوں پر تکیہ کرتے آئے تھے — خدمت اور خوشامد! لیکن یہ دونوں ہتھیار تحسین کے معاملے میں کند ثابت ہوئے۔ خوشامد، تعریف اور محبت کا وہ بچپن سے عادی تھا۔ اُس سے اتنی محبت کی گئی کہ اُسے خود محبت کرنے کا ڈھب بھول گیا۔ جب سنا اُس کی ٹانگیں دبانا چاہتی تو وہ یکدم ٹانگیں سکیڑ کر کہتا — "نہیں نہیں — شکریہ —"

"تھکیواں اُتر جائے گا شاہ جی —"

"نہیں نہیں، میں کچھ ایسا تھکا ہوا بھی نہیں۔" وہ رضائی کو اس طرح اپنی جانب
گھسیٹتا کہ سنا بیگم اس چخے دور ہو کی زبان سمجھ جاتی۔ اس کا مُنہ لٹک جاتا۔ چقماق رگڑنے
پر چنگاری نہ نکلتی تو سنا بیگم سوچتی رہ جاتی کہ اُس نے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر بڑا گناہ کیا۔ کبھی
شاہ بھی کسی کے ہوئے ہیں؟ وہ اولوں کی ماری کھیتی سر جھکا کر بیٹھ رہتی۔ تحسین اس چپ
گڑپ کو دیکھتا رہ جاتا۔ سر میں لال نیلے پلاسٹک کے کلپ جو بھورے جھونجھ بالوں کو
بٹھانے کے لئے لگائے جاتے، اور بھی رنگین ہو جاتے۔ جسم پر بروکیڈ، شنیل اور بھڑکیلے
رنگوں کے آتشی گلابی، فیروزی بینگنی کپڑے..... پیروں کے ناخنوں پر گلابی رنگ کی
کیوٹکس..... ہاتھوں کی کھردری جلد اور ناخنوں میں برتنوں کی میل..... دنداسے اور لپ
سٹک میں رنگے ہونٹ..... چوکڑی مار کر بیٹھنے کا انداز، تالی بجا کر پرندے اڑانے کی
ادائیں..... جب تحسین اُسے گھورتا تو معاً سنا بھوری کو لگتا جیسے وہ حمام میں بے حجاب نظر آ
گئی ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو شاہ جی — ؟"

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی....."

"پھر بھی.....؟"

"سوچتا ہوں اس جمعے تمہیں چڑیا گھر ہی دکھالاؤں —"

"ہر جمعے یہی کہتے ہیں آپ —"

دل میں تحسین سوچتا اگر کسی دوست یا بزنس کے معتبر ساتھی نے اس ہونق کے
ساتھ دیکھ لیا تو..... پھر.....؟

"بھلی لوک اگر وہاں کسی گاؤں والے نے دیکھ لیا تو.....؟"

"تو دیکھ لے جو مرضی..... ہم کسی سے ڈرتے ہیں — کوئی گناہ کیا ہے ہم نے۔"

وہ کڑک کر بولتی۔ شاہ جی کی سوانی بن کر اُس میں حوصلہ، دلیری اور شیخی آ گئی تھی۔

"ہاں تو نہیں ڈرتی شیر کی بچی..... لیکن زمانہ بدل گیا ہے۔ ہر تیسرے آدمی کے پاس
کلاشنکوف ہوتی ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ میں ڈرتا ہوں۔"

تین سال کے اندر سنا بیگم کے دل کا توا بالکل ٹھنڈا پڑ گیا..... اب اُس پر زندگی کی
روٹی پک نہ سکتی تھی۔ تحسین اور سنا کے درمیان صرف ٹیلی ویژن کی آواز ڈنکے کی چوٹ

آتی رہتی۔ ایک دوسرے پر دھونس ختم ہو گئی۔ وہ دونوں اپنے اپنے خول میں چلے
گئے..... تحسین سوچتا میں کہاں ہوں؟ کیا میں اُس گاؤں میں رہتا ہوں جہاں ایک ڈھنڈار
حویلی میں ایک بدروح سی ماں چپ چاپ بیٹے کا انتظار کرتی ہے؟ کیا میں اُس آفس کی تین
منزلہ عمارت میں سرگرداں ہوں جہاں سے ہر وقت پینٹ کی خوشبو آتی ہے؟ — کم از کم
اس چھوٹے سے فلیٹ میں تو بہت تلاش کے باوجود وہ اپنے آپ کو ڈھونڈ نہ سکا۔

سنا بیگم اُس چوہے کی مانند تھی جو کسی ریسرچ سکالر کے پنجرے میں بند ہو اور اُسے
معلوم نہ ہو کہ اُسے کیوں اتنی احتیاط سے کھلایا پلایا اور بند رکھا جاتا ہے — آنگن میں جا
کر کبھی کبھی وہ آسمان کو تکنے لگتی۔ رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھ کر اُسے رشک آتا..... کم از کم
وہ ان مکانوں سے اُوپر تو اُٹھ سکتی تھیں!

ایک روز جب تحسین گلی کے باہر کار پارک کر کے تنگ راستے سے اپنے گھر کی
جانب بڑھا تو اسے لگا جیسے کوئی عہد، واقعہ، حالات اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں۔ گھر کی
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُسے یقین ہو گیا کہ گھر میں کوئی واردات ہو گئی ہے۔

دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔

چند عورتیں مخبوط الحواس انداز میں اُس کی طرف بھاگی آئیں۔

سفید بالوں والی بڑھیا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا — "ہائے ہائے تیل کا چولہا پھٹ
گیا۔"

کم عمر، بڑے بڑے دانتوں والی گرہستن بولی — "ناں ماں جی ناں۔ سنا باجی نے
اپنے اُوپر تیل چھڑک کر آگ لگائی۔ میرے کاکے نے آنگن سے خود شعلے دیکھے۔"

ایک اور خبر تراش بولی "ہم تو دیوار ٹپ کر اندر آئیں — اُوپر کمبل ڈالا۔ پر آگ
کا لانبو تو آسمان تک جا رہا تھا۔ بھسم ہو گئی بے چاری....."

اَدھ جلی سنا پلنگ پر پڑی تھی۔ اس نے پریم پیالہ اپنے ہاتھ سے توڑ کر اپنے سنہری
بدن کو کالی ہڑ میں بدل لیا تھا۔ تحسین کے دل میں احساسِ جرم کا تیز لانبو بھک بھک جل اُٹھا
لیکن جب ہمسائے کے لوگوں نے مل جل کر جنازے کا انتظام کر لیا تو تحسین عجب طرح
سے شانت ہو گیا..... اُس کی آنکھ میں آنسو تھے نہ دل میں کسی قسم کا پچھتاوا!

دراصل ساری عمر اُس کی ہر محبت کے ہمراہ ذات کی پرستش غالب رہتی آئی تھی۔

نفس کی اسی چاہت نے اُسے سنا کی بے وقت موت سے بچالیا۔ وہ سنا کی محبت میں اپنی انا کی کشتی ڈبو ہی نہ سکا تھا اسی لئے بڑی آسانی سے پار اُتر گیا۔

سنا بیگم کے بغیر جب پہلی رات آئی تو وہ دیر تک اُس تصویر کے آگے بیٹھا رہا جو گاؤں سے آ کر اُس نے سنا کے ساتھ کھنچوائی تھی ––– تحسین نے پھولے بالوں والی تصویر کی بھوری بلی کو دیکھا اور دل میں سوچا ––– میں کیوں اس درجہ بیرون کا قائل ہوں؟ خوبصورتی کی تلاش میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا؟ ––– میں سنا بیگم کے اندر کا حسن کیوں دیکھ نہ سکا؟..... اُس کا صبر، اُس کی اچھائی، نیکی مجھ پر اثر انداز کیوں نہ ہو سکی؟ ––– غلطی مجھ میں تھی کہ سنا کے پینڈو پنے میں؟ ––– اُسے معلوم نہ ہو سکا کہ دوہری محبتیں کرنے والے کیوں محبت وصول تو کر سکتے ہیں، خود اُن کے تھوہر میں محبت کا پھل نہیں لگتا۔

تحسین نے رونا چاہا۔ سنا بیگم کی یاد کو تازہ کرنا چاہا۔ لیکن ہر یاد تنگ جوتی کی طرح جلد اُتار دینا پڑی۔ اُس نے سنا پر ترس کھانا چاہا جو اپنے ماں باپ اور دو بہنیں چھوڑ کر اُس کے ساتھ تین سال قید تنہائی کاٹ کر چھوٹ گئی ––– اُس نے اُس تکلیف دہ موت کے متعلق بھی گہرے غم کے ساتھ سوچنے کی کوشش کی جس سے سنا کو گزرنا پڑا ––– لیکن اُس کا دل پلاسٹک سے بنا تھا..... اُس میں کوئی مادی چیز تو پڑ سکتی تھی، لہو کی طرح گرم احساسات کا گزر نہ تھا!

وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ ایسا کیوں ہے؟ ––– سنا بیگم سے رہائی پر اُسے یک گونہ اطمینان کا احساس کیوں ہوا؟ ––– وہ اپنے اس احساس پر شرمندہ ضرور ہوا لیکن یہ حقیقت تھی کہ اندر، کہیں بہت اندر اُس کی ذات نے اطمینان کا سانس بھی لیا۔ اُسے یوں لگا گویا فطرت بھی اُس کی مدد کر رہی تھی ––– غیر ضروری لوگ، چیزیں اُس کے مدار سے ہٹا رہی تھی ––– اُسے کبھی کبھی شبہ ہوتا کہ گاؤں والے اُس کے متعلق غلط گمان پالے بیٹھے ہوں گے لیکن گاؤں والوں کو قسمت نے اس لئے تحسین کی زندگی سے نکال دیا کہ بزدلی اُن کا شعار تھی اور وہ شاہوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے اہل نہ تھے۔

سنا بیگم کی موت کے بعد تحسین کی زندگی نے عجیب پلٹا کھایا۔ اُس نے گلبرگ میں رہائش اختیار کر لی اور بڑے سٹائل سے زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک شارٹ کورس کے سلسلے میں جب وہ چند ہفتوں کے لئے کراچی گیا تو اچانک اُس کی ملاقات سیٹھ ہوزری والا سے ہو

گئی۔ وہ دونوں لفٹ میں اکیلے تھے۔ سیٹھ ہوزری والا دبلا پتلا، چھوٹے قد کا سانولا سا آدمی تھا۔ اُسے ہوٹل سے باہر دیکھ کر شک بھی نہ گزرتا کہ وہ اتنی بڑی ملٹی نیشنل بزنس کا واحد مالک ہے۔ سیٹھ ہوزری والا کے چہرے پر عینک، ہاتھ میں بید کی چھڑی، ٹانگوں پر اوٹنگا پاجامہ، جسم پر تنگ سا کرتا جس پر پچاس سالہ پرانا کوٹ، ہاتھوں میں مروڑ تروڑ، چہرے پر باسی مسکراہٹ، انداز ڈھیلا ڈھالا تھا۔ وہ دونوں بار بار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔ سیٹھ ہوزری والا تحسین کے حسن اور وجاہت سے متاثر ہوا۔ تحسین کو سیٹھ نے اس لئے متاثر کیا کہ وہ عجیب الخلقت چیز نظر آ رہا تھا۔

صبح کے ناشتے کے لئے وہ دونوں اکٹھے سیلف ہیلپ والے مارننگ روم میں داخل ہوئے۔ سیٹھ نے سادہ ٹوسٹ اور کافی کی پیالی لی۔ تحسین نے دو انڈوں کا آملیٹ اور اس کے ساتھ کئی لوازمات اکٹھے کر لئے۔ فائیو سٹار ہوٹل میں صبح کے وقت خاموشی تھی، لوگ ناشتہ بھی بڑے اسرار و رموز کے ساتھ کر رہے تھے۔ سیٹھ ہوزری والا جس میز پر بیٹھا تھا تحسین اپنے ناشتے کی بھری پلیٹ لے کر وہیں پہنچ گیا۔ تحسین نے اپنی ساری بیک گراؤنڈ، خاندانی حالات، حالیہ مصروفیت نہ جانے کیوں سیٹھ کو بتا دیں۔ سیٹھ کسی منجھے انگریز ڈپلومیٹ کی طرح ہوں ہاں کرتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی اپنے متعلق کوئی انفریشن نہ دی۔

پورا ہفتہ تحسین اور سیٹھ ہوزری والا ہوٹل میں ملتے رہے۔ وہ دونوں ایک ہی فلور پر ایک ہی لمبی گیلری کے آر پار رہتے تھے۔ کبھی ڈنر، کبھی لنچ، کبھی ریسپشن میں ملاقات رہنے لگی۔ جس روز تحسین کو لاہور واپس جانا تھا اسی صبح سیٹھ ہوزری والا اپنے کمرے کی چابی کاؤنٹر پر پکڑا رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔

"جرا تم ہمارا ساتھ کافی روم میں چلیں گا تحسین –––"

"جی ضرور ––– لیکن میری فلائیٹ میں وقت کم ہے –––"

"ام جیادہ وقت نہیں لے گا ––– ام جب فیصلہ کرتا ہے تو پہلے دیر تک سوچتا ہے، پھر جھٹا جھٹی میں مہر لگا دیتا ہے ––– چلو –––"

وہ دونوں کافی کارنر میں جا کر بیٹھ گئے۔ سیٹھ نے کافی ود کریم کا آرڈر دیا۔

"اپن نے پورا ہفتہ تم کو examine کیا ہے تحسین۔ تم ہمارا مطلب کا آدمی اے .... ام تم کو اپنا مارکیٹ منیجر بنائے گا۔ اِدھر کراچی میں تمہارا ہیڈ آفس بنا ہوئیں گا۔ جلد اریا

منیجر بنائے گا —"

"لیکن سر میں تو ..... یعنی میں نے کوئی ایم بی اے وغیرہ نہیں کیا، معمولی بی اے ہوں..... میں یہاں شارٹ کورس کرنے آیا تھا....."

"سیٹھ ڈگری مگری نہیں دیکھتا، آدمی دیکھتا ہے —"

"لیکن سر —"

"بے وقوف آدمی — ام بولا تم اگر سیٹھ ہوزری والا کو ہاتھ پکڑاؤ تو پھر اپنا ترقی دیکھنا..... تم کو آبائی زمین وغیرہ سب بھول جائیں گا —"

سیٹھ ہوزری نے ایسا زینہ لگایا کہ تحسین پہلی چھلانگ میں ترقی کے سپر سونک ہوائی جہاز میں سوار ہو گیا۔ اب جو بھی فلائیٹ جاتی تھی، اُوپر ہی اُوپر نکلتی..... سیدھی نہیں جاتی تھی۔ سیٹھ ہوزری والا نے تحسین کے ساتھ ہمیشہ خصوصی سلوک کیا۔ فیکٹری میں چلتے چلتے وہ ایگزیکٹو ڈائرکٹر بن گیا۔ آدھے شیئر دلا کر فیکٹری میں ساجھا دلا دیا۔ اپنی بھانجی سے شادی کرا دی۔ جہیز میں تحسین کو تین کوٹھیاں ملیں۔ اس ساری محبت کے بدلے سیٹھ ہوزری والا نے کبھی باپ کی طرح اُس پر احسان بھی نہ دھرا۔ تحسین شکر گزار ہونے لگتا تو سیٹھ کہتا — "ارے ناں بابا ناں.... تم ام کو خدا بناتا اے — ام تم کو بتائے... سچی بات بولے یہ سارا دولت یہاں تمہارے مستک میں لکھا ہے — بس ایک کام کیا سیٹھ ہوزری والا نے.... جو تمہارے مستک میں لکھا تھا، وہ تقدیر ام نے پڑھ لیا۔ ام مستک والے سنگ متھا پھوڑی نہیں کرتا بابا — ام بس اتنا کیا کنجی پکڑا دیا تم کو، بھلے وہ ڈبو دے — امارا جے واری نہیں ہے۔ تحسین ام تم کو بتائے دولت کو دوست بناؤ تو دوست ہے — دشمن سمجھو تو دشمن.... تم دولت کو روتا ہے — لوگ تم سے محبت کرتا ہے — مجبور ہے محبت کرنے پر..... یہ بھی تمہارا مستک میں لکھا ہے۔"

سیٹھ ہوزری والے کا خاندان تحسین کے لئے ایک عجیب سا تجربہ تھا۔ وہ لوگ اسے کبھی پارسی لگتے کبھی ہندو — عورتیں سادہ کاٹن کی ساڑھیاں پہنتیں۔ چہرے پر میک اپ نہ ہوتا لیکن لاکھوں کی ایک ہی انگوٹھی اُن کے ہاتھ میں ہوتی۔ کبھی تحسین کو لگتا وہ کسی ہندوستانی فلم میں داخل ہو گیا ہے — نماز روزے کے پابند، باقاعدگی سے زکوٰۃ دینے والے یہ میمن لوگ بڑے ہی دین دار تھے۔ کسی کا حساب کتاب، اُدھار، لینا دینا ان کے

ذمہ نہ تھا۔ ان کے گھروں میں دولت ضرور تھی لیکن دولت کی نمائش نہ تھی۔ سیٹھ ہوزری والا کے خاندان نے تحسین کو دولت کے ساتھ ساتھ بڑی ٹھہری ہوئی جاں نثاری بھی دی۔

ابھی شادی کو کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ ایک دن زعفرانی بیگم نے تحسین سے کہا — "بھئی وہ آپ ہمیں ساس جی سے ملانے نہیں لے جائیں گے —"

"مجھے تو گاؤں چھوڑے دس سال ہو گئے زعفرانی — مجھے کیا پتہ گاؤں کس حال میں ہے، ماں کیا ہوئی —" تحسین نے کہا۔

"کمال ہے — آپ کو یہ بھی خبر نہیں..... کہ اماں....."

"جب میں کچھ چھوڑ دیتا ہوں زعفرانی تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ مجھے لگتا ہے مڑ کر دیکھنے والا پتھر کا بن جاتا ہے۔"

سیٹھ ہوزری والا کے خاندان کا ایک یہ بھی چمتکار تھا کہ وہ بات کے پیچھے نہیں پڑتے تھے — یہی اُن کی کامیابی کا راز بھی تھا — زعفرانی بیگم نے اس کے بعد کبھی گاؤں جانے کی آرزو نہ کی۔ زعفرانی بیگم کے ساتھ بیس برس بڑی خوشگواری سے گزرے۔ وہ بڑی معمولی باتوں سے خوش ہو جانے والی روح تھی۔ زیادہ دیر ناراض نہ رہ سکتی۔ تحسین کسی کے غم اور خوشی میں اُسی وقت تک شریک رہتا جب تک وہ غم یا خوشی اُس کے اپنے موڈ سے وابستہ ہوتی — زعفرانی بیگم نے اپنی بیٹی عالیہ کے ساتھ ایک علیحدہ یونٹ بنا لیا تھا۔ تحسین حال مست مال مست خود رو مصروفیتوں میں اپنی زندگی گزارنے لگا..... لیکن اتنا ضرور تھا کہ جب بھی وہ چھٹیاں گزارنے یورپ یا امریکہ جاتے، اکٹھے ہی جاتے۔

عالیہ جب فرسٹ ایئر میں تھی تو اس سال تحسین اور زعفرانی آسٹریلیا چلے گئے۔ سڈنی میں ابھی اُن کے قیام کو دوسرا دن تھا جب اُن کے بیڈ روم میں فون کی گھنٹی بجی۔ زعفرانی بیگم غسل خانے میں تھی۔

"یس....."

"کراچی سے فون ہے، پلیز ہولڈ آن....."

کراچی سے عالیہ بول رہی تھی — "میں ابھی ابھی.... ہولی فیملی سے آ رہی ہوں۔ گرینڈ پا سیٹھ ہوزری والا روم نمبر گیارہ میں ہیں۔ پاپا اُن کی حالت بہت critical ہے

— آپ لوگ فوراً آجائیں..... ماما کہاں ہیں؟ —— "

"نہا رہی ہیں....."

"دراصل پاپا..... ابھی میں جھوٹ کہہ رہی تھی..... انکل ہوزری والا از ڈیڈ.... آج صبح سات بجے..... آپ اور ماما.... فوراً پہنچ جائیں....." فرسٹ ایئر کی لاابالی بولی۔

عالیہ رو رہی تھی۔ اُس نے ماں کا بھی انتظار نہ کیا اور فون بند کر دیا۔

زعفرانی بیگم باتھ روم میں سے لپٹی لپٹائی باہر آ گئی —— "کیا ہوا —— ؟"

"سیٹھ ہوزری والا ختم ہو گئے —— "

"کیسے..... کب.....؟"

تحسین نے لمبا سانس کھینچ کر کہا —— "ہولی فیملی میں تھے .... ہارٹ فیل ہو گیا۔ فائین مین.... نائس مین ...."

"آپ جا کر سیٹیں بک کرائیں، میں سامان باندھتی ہوں —— "

تحسین کھڑا ہو گیا — فیصلہ کن لمحات میں وہ اسی طرح یونانی دیوتاؤں کی طرح سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر ایستادہ ہو جاتا۔

"زعفرانی —— یہ ہمارا ہولی ڈے ہے۔ سارا سال ہم گدھوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ ہم یہ چھٹی Deserve کرتے ہیں۔ فرانس میں ہوٹل بکنگ ہو چکی ہے۔ وہاں سے امریکہ کا سارا شیڈول فکسڈ ہے۔ ہوائی جہاز، ہوٹل بڑی مشکل سے بک ہوئے ہیں۔ پھر اتنی ساری مصیبت سے پروگرام بنا ہے۔ ٹھیک ہے سیٹھ ہوزری والا بہت اچھے آدمی تھے لیکن جنازے میں شریک ہونا ایک Ritual ہے۔ تم سمجھو اگر وہ زندہ ہوتے تو ہمیں ایسا کرنے دیتے؟ —— "

پہلی بار زعفرانی اپنی ریڑھ کی ہڈی پر کھڑی ہوئی۔

"انکل کے مجھ پر بڑے احسان ہیں تحسین —— میں واپس جا رہی ہوں، آپ میرا ٹکٹ بنوا دیجئے۔"

تحسین کو زعفرانی کے انداز نے بڑی سختی عطا کر دی اور اُس نے کھڑے کھڑے فیصلہ کیا کہ زعفرانی بیگم کے دباؤ میں آ کر وہ کبھی بھی کراچی نہیں جائے گا۔

زعفرانی بیگم اکیلی کراچی سدھاری... تحسین اُسے چھوڑنے کمرے سے بھی باہر نہ

نکلا۔

وہ پارک کی بنچ پر گم سم بیٹھا تھا۔ چار ہفتے کی چھٹیاں گزار کر وہ کراچی لوٹنے کے بجائے لاہور آ گیا تھا۔ فائیو سٹار میں سامان رکھ کر وہ اچانک اس پارک میں آ بیٹھا۔ اُس کے دل میں کسی سے ملنے کی خواہش نہ تھی۔ وہ ایک مدت کے بعد تنہائی میں اپنے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔

لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے سڑکیں، باغ اندھیرے تھے۔ قریب ہی فوارہ آنے جانے والی ٹریفک کی روشنی میں طلسماتی سا لگ رہا تھا۔

میں کون ہوں؟

کہاں ہوں میں؟

کیا میں کسی مقام پر کسی وقت موجود بھی تھا کہ نہیں؟

کئی چہرے، کئی صورتیں اُس کے ذہن پر دستک دے رہے تھے جیسے کوئی تتلی سردی کے موسم میں شیشے سے اندر آنا چاہے —— لیکن شیشوں سے اندر آیا نہیں جاتا۔

تحسین کے ذمہ اپنوں کے کچھ اُدھار تھے، کچھ دینا لینا بنتا تھا۔ لیکن وہ نہ کبھی پہلے نہ اب اُس کے مدار میں داخل ہو سکتے تھے۔ وہ بار بار کبھی ماں.... کبھی سنا بیگم.... کبھی زعفرانی کے متعلق آنسوؤں کے ساتھ سوچنا چاہتا تھا ——

لیکن اُس کی آنکھیں خشک تھیں —— اب وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ کتنے بدنصیب ہوتے ہیں جو ساری زندگی محبت نہیں کر سکتے۔ وہ صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا دل اللہ کی طرف سے بند ہو جاتا ہے۔ ختم اللہ علی قلوبھم یہی کیفیت ہے جس میں دل پر قفل پڑ جاتا ہے اور محبت قلب کے اندر داخل نہیں ہو سکتی ——

ایک ہوائی جہاز ہولے ہولے ایئرپورٹ کی جانب اُتر رہا تھا۔ تحسین کے اندر کہیں بڑی احساس محرومی نے جنم لیا۔ اُس نے آہستہ آہستہ اَن دیکھے خدا سے کہا —— "اگر تو مجھے اتنی دولت، اتنی محبت نہ دیتا —— اور صرف ایک بار مجھے کسی سے قلبی لگاؤ محسوس کرا دیتا تو شاید میں آج تیرا مشکور ہوتا۔ میرے رب! جب تو کسی کے دل پر مہر لگا دے تو پھر وہ محبت کرنے کے تجربے سے کیسے گزرے؟ اُس کے بنجر میں شکرگزاری کا پھول کیسے اُگے؟.... فرعون ہو کر وہ انسان کیونکر کہلائے میرے آقا کیونکر؟"

اسی وقت سڑک اور پارک کی بتیاں روشن ہو گئیں —— لوڈشیڈنگ ختم ہو گئی.... فوارہ نظر آنے لگا ——

ایک چھوٹی سی لڑکی دور سے بھاگتی اُس کی طرف آئی اور اُس کے پاس بنچ پر بیٹھ گئی۔

لڑکی نے سرخ فراک اور لمبی سیاہ جرابیں پہن رکھی تھیں۔

"انکل آپ اکیلے آئے ہیں —— ؟"

"ہاں....."

"آپ کو ڈر نہیں لگتا ——"

"جو ہمیشہ اکیلے ہوں ناں اُنہیں عادت ہو جاتی ہے۔"

اس جملے کو سمجھنے کے لئے لڑکی بہت چھوٹی تھی۔

اُس نے فراک کی جیب سے چھوٹا سا ٹشو نکالا اور تحسین کی گال پونچھتے ہوئے بولی —— "انکل آپ رو رہے ہیں، اتنے بڑے ہو کر؟"

"نہیں تو!"

"انکل آپ پلیز نہ روئیں۔ خدا سے شکایت کریں، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

جب لڑکی اُس کی آنکھیں پونچھ چکی تو اپنا گیلا ٹشو جیب میں ڈال کر بولی —— "انکل تھینک یو کہیں، میں نے آپ کے آنسو صاف کئے ہیں۔ آپ کی ماما نے آپ کو تھینک یو کہنا نہیں سکھایا......"

تحسین نے واپس جاتی لڑکی کو دیکھ کر آہستہ سے کہا —— "نہیں بیٹے، کسی نے مجھے تھینک یو کہنا نہیں سکھایا...... یہی تو ساری مصیبت ہے۔"

اسباق الثلاثہ

کسیلے گھاس کی دھونی اُس کے حلق میں تھی اور آنکھوں سے آنسو بے ساختہ بہہ رہے تھے۔ اُلٹا لٹکے رہنے کے باعث غلام رسول کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ صرف قمیض پہنے ہوئے تھا، کمر سے نیچے اُس کے کوئی کپڑا نہ تھا۔

"سرکار... میں قصوروار ہوں —— میں مانتا ہوں لیکن ہیجڑا نہیں ہوں حضور۔"

"پھر وہی بات، مرغے کی وہی ایک ٹانگ... لٹکاؤ اُلٹا اور طبیعت صاف کر دو....."

"ایک بار، صرف ایک بار سرکار.... آخری بار میری بات سن لیں ——"

"لمبی بات کی.... تو پھر دھونی دیں گے۔ جلدی جلدی بتاؤ اور اگر اپنی صفائی میں جھوٹ بولا یا غلط کلامی کی تو یاد رکھنا ہم جن نکالنا جانتے ہیں ——"

"ناں سرکار، یقین جانیں میں قصوروار ہوں۔ غلطی مجھ سے ہوئی ہے —— لیکن میرا ارادہ اتنی بڑی غلطی کا نہیں تھا جناب عالی.... اچانک.... جیسے فلم میں انسان امریکہ پہنچ کر گاڑیوں میں پھرتا ہے —— میموں کے ساتھ شغل کرتا ہے.... ایسے ہوا.... میں خود اپنے اندر چھپے ہوئے شیطان سے واقف نہیں تھا سرکار۔ بیگم صاحبہ کے سرکار مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ جب پچھلے سال میری بیوی بیمار ہوئی تو پورے پانچ ہزار میرے ہاتھ میں پکڑا کر بیگم صاب بولی —— یہ لو پانچ ہزار، اگر کچھ اور کی ضرورت پڑے تو فون کر دینا —— اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے نمبر لکھ کر دیا۔ ہماری بیگم صاب بہت اچھی ہیں سرکار، دل کی بڑی نرم ہیں —— میرے اندر خدا جانے کب کی ناشکر گزاری چلی آ رہی ہے؟!"

"ہوں —— تم حرام زادے ہو —— اول درجے کے....."

"نہیں سرکار، میں حرام زادہ نہیں ہوں۔ آپ میرے گاؤں چل کر پوچھ لیں،

سب اس بات کی گواہی دیں گے کہ غلام رسول دل کا نرم اور ہاتھ کا سخی ہے——"

"کیا کسی انسان کے لئے دل کا نرم اور ہاتھ کا سخی ہونا کافی ہے غلام رسول.....؟"

غلام رسول سوچ میں پڑ گیا —— آج تک وہ اپنے آپ کو ایک اچھا انسان ہی سمجھتا آیا تھا۔ باورچی خانے کی چھوٹی موٹی چوری کے علاوہ اُس نے کوئی بڑی بددیانتی بھی نہ کی تھی۔ مکھن، ملائی، کیک، بسکٹ نگاہ بچا کر کھا لینا —— وقت بے وقت چائے بنا کر پینا —— اپنے لئے پراٹھے تل کر کھانا —— پھل کی باسکٹ سجاتے وقت تھوڑا بہت منہ مار لینا —— لیکن دوسرے خانساموں کی طرح اُس نے کبھی بازار میں خرید و فروخت کے وقت کمیشن لی تھی نہ سودے میں سے پیسے بچائے تھے۔ جب کبھی وہ باورچی خانے سے نکلتا، خالی ہاتھ نکلتا۔

بیگم صاحبہ کے پاس آنے سے پہلے وہ تین کوٹھیوں میں خانساماں گیری کر چکا تھا اور ان تین خوشحال گھرانوں میں رہ کر اُس نے تین سبق سیکھے تھے۔ پروفیسر صاحب کے گھر علم و فضل کے دریا بہتے تھے۔ ہروقت دانشور، اہلِ قلم، اخباروں کے نمائندے جرنلسٹ اور پڑھنے کو اوڑھنا بچھونا سمجھنے والے پڑھاکو طالب علم آتے رہتے۔ پروفیسر صاحب کی بیگم کمپلسری سبجکٹ والی اس مہمان داری سے بہت کھجتی تھیں لیکن ساتھ ساتھ یہ اُن کے گھر کا طرہ امتیاز بھی تھا کہ گھر کی چوکھٹ پر ناصیا فرسا قسم کے لوگوں کا کھٹ رہتا۔ پروفیسر صاحب کے علم و فضل کا دبدبہ دُور دُور پھیلا تھا۔ وہ کتابوں کے اس قدر رسیا تھے کہ رات گئے تک اُن کے بیڈ لیمپ کی روشنی جلتی رہتی اور جتنی بار غلام رسول اُٹھ کر باہر جاتا، وہ کھنگار کر اُن کی کھڑکی کے پاس سے گزرتا تاکہ اُنہیں پتہ چل جائے کہ اپنا غلام رسول آ جا رہا ہے ——

پروفیسر صاحب غلام رسول سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ وقت بے وقت چائے بنا کر اُن کی اور مہمانوں کی تواضع کرتا۔ بیگم صاحبہ بچوں میں مشغول رہتیں اور رزق کم ہونے کی وجہ سے خست اور احمق پن سے گزارہ کرنے کو سگھڑ پن شمار کرتیں۔ اُن کا بڑا بیٹا فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور نئے نئے پَر پُرزے نکالنے کی وجہ سے غلام رسول کو کبھی کبھی تھپڑ، گالی سے بھی نواز دیتا..... لیکن غلام رسول نے ان چھوٹی چھوٹی فرسودہ باتوں کا کبھی بُرا نہیں منایا۔ وہ جانتا تھا کہ چاکری میں دل کشادہ رکھنا پڑتا ہے۔ اگر انسان عزت

بے عزتی کے مسئلوں میں پڑ جائے تو پھر نوکری چھوٹ جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب کی دونوں بیٹیاں چھوٹی تھیں غلام رسول نے اُنہیں نیم کے درخت پر جھولا ڈال دیا تھا۔ اُن کا سارا دن اُسی کے گرد کٹتا۔ غلام رسول کے ساتھ اُن کا کوئی سروکار نہ تھا۔

پروفیسرنی صاحبہ خود سارا دن باورچی خانے میں گھسی رہتیں۔ اُنہیں پکانے کی ترکیبیں بتانے کا بہت شوق تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ غلام رسول سے بہتر باورچی ہیں۔ اسی لئے ڈوئی چلانا، نمک مرچ چیک کرنا، بوٹی کی گلاوٹ دیکھنا، چپاتی کو توے پر الٹ دینا اور اس جیسے اَن گنت کام کرتے رہنا جن سے وہ مشغول نظر آئیں، اُن کے دن بتانے کے طریقے تھے۔

سرکاری رہائش میں غلام رسول کو دوسرا سال تھا جب اچانک غلام رسول میں ایک تبدیلی آ گئی —— ریڈیو باورچی خانے میں ہمہ وقت رواں رہتا تھا۔ جب سارا خاندان ٹیلی ویژن دیکھتا وہ بھی باورچی خانے سے فارغ ہو کر پائے دان کے پاس جا بیٹھتا۔ پانچویں پاس تھا، پروفیسر صاحب سے اخبار، رسالے لے جا کر کوارٹر میں پڑھتا —— جب بہت زیادہ انفرمیشن غلام رسول کے کمپیوٹر میں فیڈ کر دی گئی تو اچانک اُسے زبان لگ گئی —— پہلے تو وہ موقع محل دیکھ کر بات کرتا تھا۔ پھر ہولے ہولے فیملی کی باتوں میں دو چار لطیفے اور حاضر جوابیاں موقع محل کی مناسبت سے ٹھونک کر اُسے اندرونی سرکل میں جگہ مل گئی۔ سب اُس کی باتوں سے ایسے محظوظ ہوتے جیسے بندر کا تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ اب جب کبھی پروفیسر صاحب سے اہلِ دانش، ادیب، جرنلسٹ ملنے آتے تو غلام رسول چائے پلاتے وقت طرح مصرعہ ضرور پیش کر دیتا۔ پروفیسر صاحب اُردو کے ایک اخبار میں بڑا مقبول کالم بھی لکھتے تھے۔ اس اخبار کی سرکولیشن لاکھوں میں تھی اور اسی تناسب سے پروفیسر صاحب کے قاری بھی تھے۔ کالم والا اخبار رول کر بغل میں داب پروفیسر صاحب اپنی ایم اے معاشیات کی کلاس لینے جاتے تھے۔ اسی اخبار کے باعث جگہ جگہ کالم کی تعریف وصول کرنے میں اُنہیں سہولت بھی رہتی۔

غلام رسول کبوتروں کے ڈربے سے نکل کر اونچی اُڑانیں لینے لگا۔ تاڑ کا سا قد، متناسب جسم، کھلی کھلی آنکھیں، سپرمین سی تیزی..... غلام رسول بڑی بڑی زبانیں بولنے لگا تھا۔ جب گاؤں سے نیا نیا آیا تھا تو پروفیسرنی صاحبہ کو لگتا پیپل تلے کا بھتنا ہے، اب اس کی

حیثیت پیر مغاں کی سی ہو گئی۔

اس روز پروفیسر صاحب کے گھر میں پریس کانفرنس تھی۔ چند ہفتے پہلے پروفیسر امجد نے کچھ ایسی باتیں اپنے کالم میں لکھی تھیں جن پر بڑے دھڑے کی لے دے ہو رہی تھی۔ چند اخباروں کے نمائندے چھوٹے سے سرکاری بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ دو کیمرہ مین سٹل تصویریں کھینچ رہے تھے جب غلام رسول چائے کی ٹرالی لے کر اندر داخل ہوا۔

پروفیسر امجد اپنی اہمیت سے اترائے ہوئے بلاخوف و خطر بازو، ہاتھ، گردن، آنکھیں سارے جسم کو بروئے کار لا کر اپنے نظریے بیان کر رہے تھے۔

"ہماری فلاح اسی میں ہے کہ ہم جمہوریت کو اپنائیں اور سچے دل سے اس کی پیروی کریں...."

ایک نمائندے نے ذرا سا آگے ہو کر پوچھا "سر تیسری دنیا میں خواندگی کم ہے —— غریبی نے ہمارا بھرکس نکال دیا ہے —— طبقاتی معاشرہ ہے —— جوائنٹ فیملی سسٹم، برادری سسٹم میں سوسائٹی بٹی ہے —— کیا ایسی صورت میں بھی جمہوریت ہی کا ساتھ دینا ہو گا؟ ——"

"جمہوریت اور پھر جمہوریت اور پھر جمہوریت ...." پروفیسر غرائے "جمہوریت ہمارا واحد علاج ہے لیکن جہاں تعلیم عام نہ ہو..... وہاں ووٹ کون دے اور کیوں دے اور پھر ووٹ کی..... ان پڑھ آدمی کے ووٹ کی.... حیثیت کیا ہو؟ ——"

پتہ نہیں غلام رسول پر کیا گزری وہ چائے کی پیالی چھوڑ کر بڑے اعتماد سے آگے بڑھ کر بولا —— "سرکار..... جمہوریت نہیں چلے گی تیسری دنیا میں..... جب تک مساوات نہ ہو، جمہوریت کا بوٹا کیسے لگ سکتا ہے یہاں..... ہمیں تو ایک شیر شاہ سوری دلا دیں جو کلکتہ سے پشاور تک سڑک بنا دے..... ہمیں تو ایک وڈیرا ایسا دلا دیں جو مزارعوں کا لہو نہ پیئے، ان سے انصاف کرے..... ہمیں جمہوریت نہیں چاہیے سرکار.... گائے، بھینسیں، بکریاں جمہوریت کا کیا بنا دیں گی سرکار.... ہمیں تو جدھر ہانک لے جائیں گے، چلے جائیں گے.... ہمیں تو ایک اچھا گڈریا لا دیں عالی جاہ جس کے دل میں ہمارا غم ہو..... ہم جمہوریت کا ڈھونگ رچا کر کیا لیں گے —— جمہوریت کا سرکار تعلیم سے نہیں، مساوات سے تعلق

ہے..... آپ سچ جانیں جہاں ووٹ ہی برابر نہ ہوں وہاں جمہوریت کیسی؟" کیمرے مڑ کر غلام رسول کی تصویریں بنانے لگے۔ نمائندوں نے جلدی جلدی غلام رسول کی باتوں کے نوٹ لینا شروع کر دیئے۔

پروفیسر امجد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غلام رسول کو لتاڑ کر باہر نکال دیا۔

رات کو جب باورچی خانے میں صاحب آئے تو غلام رسول اپنا پہلا سبق سیکھ چکا تھا ——

"میں بے انصاف نہیں ہوں ورنہ تیری تنخواہ روک لیتا —— یہ لو اپنے پیسے اور یاد رکھو زبان کھولنے سے پہلے اپنا درجہ، مقام ضرور پہچان لینا چاہیے —— اناڑی کی بندوق نہ بنو، آدمی بنو۔ اپنی حیثیت پہچانو —— پاؤ آدھ پاؤ میری بھی غلطی ہے، تم جیسے جوکر کی باتوں پر خوش ہوتا رہا —— اب سمجھ آئی کہ مورپنکھ لگا کر کوّا مور نہیں بن جاتا۔ منہ کھولنے سے پہلے سوچو کس سے بات کر رہے ہو..... تم کون ہو اور وہ کون ہے..... گٹ آؤٹ ایٹ ونس!"

سرکاری بنگلے سے نکل کر غلام رسول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسے پروفیسر صاحب اور اُن کا گھرانہ اپنا اپنا لگنے لگا تھا۔ گھر سے نکالتے وقت کسی نے اُس سے یہ نہیں پوچھا کہ بھائی غلام رسول کیا تم بھی ہمیں چھوڑنا چاہتے ہو کہ نہیں.....! ہاں اتنی بات اُس کی سمجھ میں ضرور آ گئی کہ برابر کی بات کرنے کے لئے بھی جمہوریت کی نہیں، مساوات کی ضرورت تھی اور ابھی.... مالک نوکر برابر نہیں تھے۔

یہ نوکری بلاوجہ چھوٹ گئی، اُس کی حماقت کی وجہ سے۔ چھ مہینے بڑی عسرت اور بے کاری میں گزرے۔ پھر اڑ بھنبیری ساون آیا —— غلام رسول ان دنوں ایک بہت بڑی کوٹھی میں مزدوری کر رہا تھا جب اچانک اُس کی ملاقات کوٹھی کے مالک سے ہو گئی، جو آرکیٹیکٹ کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا "میں بڑی مشکل میں ہوں آج کل —— بیگم صاحبہ یورپ گئی ہوئی ہیں، خانساماں اچانک بھاگ گیا....."

اس وقت غلام رسول نے آگے بڑھ کر عرض کی —— "سر میں خانساماں ہوں۔ میرا باپ بھی کرنل ہاکنز کا خانساماں تھا۔ جب کرنل ہاکنز ریٹائر ہو کر لندن گیا سرکار تو میرا ابا بھی ساتھ گیا تھا۔ پر دل نہیں لگا، واپس آ گیا۔ سات کورس کا کھانا اکیلا پکا لیتا ابا جناب عالی

بغیر مسالچی کے۔"

ملک صاحب اُسے کار میں بٹھا کر اپنے ساتھ گلبرگ لے گئے۔

جن دنوں وہ دیہاڑی کرنے ڈیفنس والی کوٹھی پر جایا کرتا تھا تو وہاں ملک صاحب کے متعلق ٹھیکے دار، مستری اور مزدور لوگ بڑی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ملک صاحب حال ہی میں اکیسویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے تھے۔ اُن کی دو کوٹھیاں گلبرگ میں تھیں اور یہ تیسری ڈیفنس میں بن رہی تھی۔ واسا میں ڈائرکٹر رہے تھے اور لمبا ہاتھ مارا تھا۔ رشوت اتنی دھڑلے سے لیتے تھے کہ سارے عملے کو خبر تھی لیکن کوئی مُنہ سے بات نہ نکالتا تھا۔ ملک سے باہر کئی بنکوں میں اکاؤنٹ تھے۔ فرانس میں دو شاندار ولا اور لندن میں ایک اپارٹمنٹ عموماً کرائے پر چڑھے رہتے۔ وہ کہا کرتے کہ تیسری دنیا میں صرف دولت کام آتی ہے، یہاں میرٹ راستہ کھولتا ہے نہ شرافت نجابت —— بس ہتھیلی گرم کرنے سے کھل سم سم کا سا اثر ہوتا ہے۔ جب غلام رسول نے اپنی تنخواہ سنی تو اُسے چکر سا آ گیا۔ سترھویں گریڈ میں پہنچ کر اُس نے دل میں سوچا کہ واقعی دیر آید درست آید —— بڑی تڑپراہٹ کے ساتھ بڑی تیزیوں کے ہمراہ اُس نے اپنی اہلیت دکھانا شروع کر دی۔ پہلے اُس کے کھانے سادہ اور سروس معمولی تھی۔ اب اُس نے چائنیز اور کونٹی نینٹل کھانوں کے علاوہ بیکنگ بھی سیکھ لی۔ فاسٹ فوڈ اور بجی بنانے کا بھی ماہر ہو گیا۔ گھر کے پچھواڑے تندور میں خمیری، فطیری روٹیاں لگاتا۔ اُس کے نان، کلچے، سندھی پراٹھے دُور دُور مشہوری پا گئے —— اس قدر اعلیٰ خانساماں، تس پر سارا گھرانہ اُس کی خاموشی کی تعریف ہر ملنے ملانے والے سے کرتا —— آپس میں سارا خاندان اُسے jewel پکارتا۔ اس بجھ کاگ کی مثال دوسرے ملازموں کو دے کر ڈرایا جاتا، اُن کی کارکردگی کو ڈاؤن گریڈ کیا جاتا۔ غلام رسول یا تو فوج کا بیٹ مین لگتا یا پھر کسی انگریز کا ملازم —— وقت کی پابندی، کام کا سلیقہ، صفائی ستھرائی..... بہت سی خوبیاں غلام رسول میں تعریف ہی سے پیدا ہو گئیں۔

لیکن اس قدر سمپورن خانساماں میں بھی ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ جس طرح کبھی کبھی ثابت سموچہ خوش رنگ سیب اندر سے خراب نکلتا ہے ایسے ہی بیگم صاحبہ پر غلام ایک بھٹ بھیڑیا ثابت ہوا..... رات کھانے سے فارغ ہو کر کوارٹر میں ڈیزرٹ کولر لگا کر غلام رسول نماز پڑھ رہا تھا۔ رات کے ڈنر پر دس بارہ مہمان بھی تھے جنہوں نے خانساماں

کے پکیرے کی بہت تعریف کی تھی۔ ایک صاحب تو چند تندوری پراٹھے پیک کروا کے ساتھ لے گئے تھے.... اس وقت بیرا جمیل داخل ہوا اور بڑی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا —— "نماز پڑھ کر اندر چلے جانا، بیگم صاحبہ نے فوری طلب کیا ہے ——"

جس چکریلے انداز میں بیرے نے بات کی اور جس ترنت طریقے سے وہ پلٹا، غلام رسول کو تھوڑی سی سندک تو لگ ہی گئی لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ اُس نے کہاں ٹھوکر کھائی، کون سی حرکت سے بیگم صاحبہ کے خط ضامنی کو پار کیا۔ نماز ختم کر کے اس نے عافیت کی دُعا مانگی کیونکہ اتنی اچھی نوکری پا کر وہ بھی بزدل ہو چکا تھا..... آسائش نے اُسے بھی بودا کرنے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ باورچی خانے میں جوتی اُتار کر وہ قالینوں پر چلتا، دروازے آہستہ آہستہ بند کرتا، گھٹنے سے گھٹنا ٹکراتا، بیگم صاحبہ کے پرائیوٹ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

بیگم صاحبہ بھاری کندھے اور کولہے والی خاتون تھیں۔ اُن کا چہرہ ازبکی، ہاتھ پاؤں فرانسیسی اور آواز پنجابی تھی۔

"سلام علیکم سر ——"

بیگم صاحبہ کچھ پڑھنے میں مشغول تھیں، اُن کے ہاتھ میں گھروں کی سجاوٹ بڑھانے والا ایک ضخیم رسالہ تھا۔ معمول کے مطابق وہ سلام کرنے کے بعد خاموش ہو گیا۔ چند منٹ بیگم صاحبہ نے بڑے جانچ پڑتال کی خاموشی اختیار کی پھر اہتمام سے رسالہ بند کیا، دونوں ہاتھ گود میں رکھے اور محاسبے کی آواز میں بولیں —— "مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی غلام رسول....."

خانساماں نے منمنا کر "جی سر" کہا..... وہ ابھی تک سمجھ نہ پایا تھا کہ مواخذہ کیوں، کیسے اور کس لئے کیا جا رہا ہے! ——

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم اتنے میسنے اور کمینے ہو ——"

بازپرس کی اصلی وجہ ابھی تک غلام رسول پر نہ کھلی تھی۔

"تم سمجھتے تھے اُلّو کہ مجھے خبر ہی نہ ہو گی..... حرام زادے تم چوری چوری بالائی آمدنی بناؤ گے اور مجھ تک بات ہی نہ پہنچے گی۔ چور آدمی تم سو مرتبہ رازداری سے پیسے بناؤ، مالک کو لوٹے جاؤ..... تمہارا کیا خیال ہے کبھی بھید نہیں کھلتا ——"

وہ پھر "یس سر" کہہ کر خاموش رہ گیا۔

"کل میں پھل والے کے پاس گئی تو..... مجھے پتہ چلا کہ انگور تو ساٹھ روپے کلو ہیں، تم نے مجھے سو روپیہ کلو لکھوائے ——"

"جی سر غلطی ہو گئی ——"

"اب تو ڈرائیور، بیرا، صفائی والی مریم سارے لوگ گواہی دیتے ہیں کہ تم نے ہر دوکان پر کمیشن مقرر کر رکھی ہے —— ہم نے تم کو اتنی بڑی تنخواہ پر رکھا —— ایسا کوارٹر دیا جس میں ہیٹر، ڈیزرٹ کولر اور پنکھا لگا ہے —— استری مفت، گرم ٹھنڈے پانی کی سہولت موجود..... میڈیکل فری..... اور تم نے ہم کو ہی لوٹنا شروع کر دیا....."

غلام رسول کو اپنی نوکری کی آخری گھڑیاں نظر آ گئیں ——

نظریں جھکا کر وہ شائستگی سے بولا —— "سر غلطی ہو گئی، معاف کر دیجئے۔ آئندہ سے یہ غلطی نہیں ہو گی۔"

"پاکستان کے عوام ہی سارے چور ہیں، اسی لئے اُوپر کوئی درست آدمی نہیں آتا۔ حکومت کیسے چلے جب بے ایمانی کا یہ عالم ہو —— ہر چیز مل رہی ہے اور پھر بھی بے ایمانی سے باز نہیں آتے۔ اُوپر کی آمدنی کا ایسا چسکا پڑا ہے —— ایسا چسکا پڑا ہے کہ مُنہ سے چھوٹتی نہیں..... میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی..... سوچتے کیا ہو!"

اس کے بعد بیگم صاحبہ نے اپنی شائستگی، تعلیم اور کلچر چھوڑ کر بے تکان گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ غلام رسول کو جب یقین ہو گیا کہ نوکری رہتی نظر نہیں آتی تو اُس نے اس پوچھ پچھار سے حوصلہ پا کر کہا —— "بیگم صاحبہ —— ہم غریبوں کی کیا چوری..... لوگ تو بنک خالی کر گئے، پاکستان کی معیشت تباہ کر دی..... پہلے اُن کا محاسبہ ہونا چاہیے..... ہم غریب کیا چوری کریں گے بیگم صاحبہ..... پہلے اُوپر والوں کی خبر لیں —— بڑا مال تو اُنہوں نے ہی لوٹا ہے —— اُنہوں نے ہی غریب آدمی کو چوری کرنے کا حوصلہ دیا ہے —— ہم تو اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں سر جی۔"

بیگم صاحبہ تو طیش میں بھتنی بن گئیں۔ جھپاک سے اُٹھ کر پورے ہاتھ کا وہ تھپڑ رسید کیا کہ غلام رسول اپنے جننے والی کو یاد کرنے لگا ——

"تمہاری یہ جرأت، اتنی ہمت....." پھر گالیوں کی بوچھاڑ ——

"احمق! جیسے لوگ ہوتے ہیں، ویسے حاکم اُن پر مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو صرف اُوپر والوں کا قصور تھا۔ سارا قصور تم غریبوں کا ہے —— یاد رکھو —— چوری چوری ہوتی ہے، لاکھ کی چوری اور روپے کی چوری ایک ہی بات ہے۔ خبردار جو اپنی معذرت میں زبان کھولی —— تم لوگوں نے ہرے پاسپورٹ کی قدر کھوئی —— تم جیسے بے قاعدہ لوگوں نے ہمارے ملک میں بیرونی ممالک کا سرمایہ آنے نہیں دیا —— تم جیسے بدبختوں نے ملک کو قرضوں کے بوجھ تلے نڈھال کر دیا۔ تمہاری غریبی مٹانے کے لئے حکومت کو دشمنوں کے ساتھ تجارت کرنی پڑتی ہے۔ تم جیسے عوام جس ملک کے ہوں، اُس ملک کی قسمت کیسے جاگ سکتی ہے..... جس ملک کے عوام چور، بے ایمان، فریبی ہوں اُس ملک کا کیا بن سکتا ہے —— اُوپر کے لوگوں کو کیا دوکھنا دے رہے ہو؟ سارا قصور عوام کا ہے —— بے دین، بد اخلاق، دُکھ دینے والے، ٹنٹے باز..... اس لئے نعرے لگائے تھے قیام پاکستان کے وقت؟ لوٹنے کے لئے مانگا تھا پاکستان —— دُور ہو جاؤ میری نظروں سے..... میں تم جیسے ملک دشمن کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ منشی جی کے ساتھ حساب کر لینا..... صبح نظر نہ آؤ مجھے —— گٹ آؤٹ ایٹ ونس......"

غلام رسول اس احتساب کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ ملک صاحب کی کوٹھی میں کسی سمراٹ کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ سارے نوکروں کا حاکم، اندر باہر کی چابیوں کا رکھوالا، ہر فون سننے پر قادر، صاحب اُس کا متوالا، بیگم اُس کی پکی ووٹ..... یہ تو اچانک بے موسم کے اولے گرے۔ دنگ رہ گیا۔ صاحب سے معافیاں مانگیں۔ بیگم صاحب سے بار بار کہا کہ جو چور کی سزا وہی میری، ایک چانس اور دیں۔ بیگم صاحبہ کی ڈکشنری میں کوئی آئندہ درج نہ تھا۔ خلاصی پیشہ غلام رسول سے دبتے تھے، اب اُنہوں نے بڑے بن کر تسلیاں دینا شروع کیں۔ دل میں خوش، اُوپر سے مسمے چہرے بنا کر وفد کی صورت بیگم صاحبہ کے آگے پیش ہوئے۔ معافی مانگی —— جب بیگم صاحبہ نے سب کو نکال دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو مُنہ لٹکائے باہر سرونٹس کوارٹر میں آ رہے اور غلام رسول کو یہی مشورہ دیا کہ چپکے سے راستہ ناپنے میں ہی عافیت ہے۔

غلام رسول کوٹھی سے اس طرح نکلا جیسے کوئی راجہ بن باس قبول کرے اور جنگل سدھارے..... لیکن اس بار غلام رسول قسمت کا دھنی نکلا۔ جس بیکری سے غلام رسول

سودے خریدتا تھا اور سامان پر دس فی صدی کٹوتی وصول کرتا تھا‘ اپنا چھوٹا سا صندوق اور گٹھری لے کر وہ وہاں پہنچا۔ اس بار اُس کا ارادہ گاؤں لوٹ جانے کا تھا۔ وہ کیک پیسٹری کے سیکشن میں اپنے گاؤں کا ایڈریس لکھوا رہا تھا۔ سٹور والا کافی مصروف تھا۔ اپنی ڈائری میں نام پتہ لکھنے کے لئے اُس کے پاس وقت نہ تھا لیکن غلام رسول نے اُس سے ہزاروں روپے کی خریداری کی تھی۔ اُس نے غلام رسول کا پتہ چار فون اور کئی سودے بیچنے کے درمیان مکمل کر لیا.... اس وقت مسز مہتاب شوخ وشنگ لباس میں داخل ہوئیں۔

دانش صاحب بڑے پولشڈ بینکر تھے۔ حکومت کے فنانس منسٹر اُن کے ذاتی دوست تھے۔ وہ آئی ایم ایف کی میٹنگوں میں پاکستان کی معیشت سے متعلق پالیسیوں کا دفاع کرتے۔ بنیادی طور پر وہ وکیل تھے۔ بنک نے پہلے اُن کو اوپیریشن میں رکھا‘ پھر فارن ایکسچینج میں مانجھا اور اس کے بعد litigation کے ڈپارٹمنٹ میں اُن کی کلا جاگی —— چڑھتے چڑھتے وہ وائس پریذیڈنٹ ہو گئے۔ اب شہر کے تمام قابل ذکر وی آئی پی اُن کے ذاتی دوست تھے۔ اُن کا سوشل سرکل بڑے قابل ذکر صنعت کاروں‘ سیاسی لیڈروں اور دانشوروں کا گلدستہ تھا۔

جس وقت مسز مہتاب شام کی چائے کے لئے پیسٹری کیک منتخب کر رہی تھیں‘ غلام رسول شیشے کا دروازہ پش کر کے باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔

”بھئی تم نے مجھے خانساماں تلاش کر کے نہ دیا —— بڑی تکلیف ہے ہمیں —— تمہیں پرواہی نہیں۔“

اس وقت غلام رسول کی قسمت نے آواز دے کر دربدری سے بچایا۔ چھوٹی ٹرنکی اور گٹھری ڈکی میں ڈال وہ بیگم مہتاب دانش کی کوٹھی پر راج ہنس کی طرح پہنچا۔ پہلی ہی پارٹی میں غلام رسول کی واہ واٹیسو کے پھول کا سا رنگ لائی۔ ایسا سلیقہ‘ سگھڑپن دکھایا کہ بیگم مہتاب نے رات کے وقت دانش صاحب سے کہا ”پتہ نہیں آج تک ہمیں ایسا آدمی کیوں نہ ملا! یہ تو گویا کسی نیک کام کا اجر ہے۔ سارے رونے دُھل گئے۔“ دوسرے دن دبے پاؤں غلام رسول کھانے کے کمرے کے دروازے میں دستہ بستہ آ کھڑا ہوا۔ ”سر میں اندر آ سکتا ہوں؟“

بیگم صاحبہ نے نظر تحسین سے دانش کی طرف دیکھا‘ گویا وہ اُس کے آداب کی

تعریف کر رہی ہوں۔

”آجاؤ —— بھئی“

غلام رسول نے قریب آ کر سارا حساب اور بقیہ ریزگاری بیگم صاحبہ کے پاس تپائی پر رکھ دی۔

”سر یہ چیک کر لیں ——“

بیگم مہتاب دانش نے حساب دیکھا‘ جمع جوڑا‘ ریزگاری گنی اور پرس میں ڈال لی۔

”یہ حساب تم نے خود لکھا ہے؟ ——“

غلام رسول نے اثبات میں سرہلایا۔

”پڑھے لکھے ہو؟ ——“

”جی سر‘ پانچویں جماعت تک ——“

اُس نے پروفیسر صاحب کے گھر اَن گنت رسالے‘ کتابیں‘ اخباریں پڑھی تھیں۔ پھر مذاکرے‘ مباحثے بھی کانوں سے گزرے تھے۔ وہ ڈگریوں سے تو ناآشنا تھا لیکن انفرمیشن کی حد تک اُس کا کمپیوٹر سوفٹ ویئر سے بھرا پڑا تھا۔

”اچھا بھئی غلام رسول اب تم کو ذرا میری مدد کرنا ہو گی۔ جب تک سیکرٹری روما نہیں آتیں‘ آپ کو سارے فون بھی اٹینڈ کرنے پڑیں گے۔ میں ذرا اڈے والوں کے پاس جا رہی ہوں‘ تم نیچے آفس میں بھی جھانکتے رہنا —— آج صاحب اور میرا لنچ باہر ہے —— باہر ملازموں کے لئے بڑے گوشت کے دو پیکٹ نکال کر اُس میں کچھ ڈال لو —— ہم رات کو سوپ اور کچھ لائٹ فوڈ لیں گے ——“

”جی بہتر ——“

دانش صاحب کی کوٹھی چھ کینال میں پھیلی تھی۔ نچلے پورشن میں بیگم صاحب کا آفس‘ ڈرائنگ روم اور فارمل مہمانوں کے رہنے کے لئے ایک سویٹ آف رومز تھا۔ آفس کا بڑا کمرہ سامنے تھا جس میں بیگم مہتاب دانش ڈزائنر کپڑے کمپوز کرتی تھیں۔ آفس سے ملحق کمروں میں درزی خانہ تھا۔ چار درزی اور ایک کٹر کھچا کھچ قینچی چلاتے تھے۔ ان کی چائے کا انتظام بھی نچلے پورشن میں ہی ایک چھوٹے سے کچن میں ہوتا‘ صرف سپرویژن غلام رسول کرتا تھا۔

ایک روز غلام رسول دست بستہ بیگم مہتاب کے سامنے پیش ہوا۔

"سر وہ درزی خانے کے کچن کا دودھ بھی ختم ہے اور چائے کی پتی بھی۔ اس کے لئے کیا حکم ہے؟"

"تو تم خرید کر لا دو غلام رسول..... اور دوسری بات یہ درزی خانہ نہیں ہے، یہ مہتاب بوتیک ہے — تمہیں معلوم ہے شہر میں میری بوتیک کے کتنے شوروم ہیں؟"

غلام رسول نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"دو شو روم تو گلبرگ میں ہیں۔ ایک پر Casual wear بکتا ہے اور دوسرے Pace والے میں فارمل کپڑے ہیں۔ ایک ڈیفنس پر شاپ ہے۔ ایک لنک روڈ کی سپر مارکیٹ میں.... ایک ماڈل ٹاؤن میں —— ابھی اس کی ایک برانچ اسلام آباد میں بھی کھلی ہے۔ سوائے جب ہم لوگوں کو entertain کریں۔ باورچی خانے کا کام زیادہ نہیں..... ہاں مہمانوں کی ٹرولی — قہوہ، چائے، کافی .... یہ سب چٹکی بجنے پر حاضر کرنا ہو گا..... میں اور صاحب تو زیادہ تر باہر ہی کھانا کھاتے ہیں۔"

بیگم صاحبہ مولے کی طرح تھیں۔ اُن کا جسم ہرنی کا دماغ پارہ، حرکات مشینی تھیں۔ گھر پر ہوتیں تو ٹریک سوٹ قسم کا لباس پہنتیں۔ اگر باہر سے آ کر لباس تبدیل کرنے کا وقت نہ ملتا تو پیٹی کوٹ اور بغیر آستینوں کا بلاؤز پہن کر بھنبیری کی طرح سارے گھر میں گھومتی پھرتیں۔ ڈریس ڈیزائنر اُن کے پاس اُوپر والے پورشن میں ہی آ جاتا اور بیگم صاحبہ پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں ملبوس اُس کے پاس بیٹھ کر نئے لباس ڈیزائن کرتیں، رنگ میچ کرتیں۔ اس کے علاوہ فوٹو گرافر کا اُوپر آنا جانا رہتا، رسالے والوں کے نمائندہ لوگ بھی بلا روک ٹوک آتے جاتے۔ اس کام کو بیگم صاحبہ جس بڑے پیمانے پر کر رہی تھیں، اُس میں دو باتیں واضح تھیں۔ ایک تو اُن کے پاس وقت کی کمی تھی..... دوسرے وہ بلاوجہ جھجک، حیا اور فضول بناوٹی قسم کی شرم کو پسند نہ کرتی تھیں۔ ہر سال وہ اپنے کپڑوں کی نمائش کے لئے یا تو امریکہ جاتیں یا یورپ۔ اس نمائش کی تیاری میں اُنہیں مہینے درکار ہوتے — اپنے کپڑوں کے اشتہاروں کے لئے اُنہیں ماڈل گرلز اور لڑکے بھی درکار ہوتے جو گھر پر آ کر اُن کے لباس پہن کر تصویریں کھنچواتے۔ کئی ماڈل گرلز جنہوں نے شروع میں اُن کے لباسوں کے لئے اشتہاروں میں کام کیا تھا، اب ٹی وی اور فلم کی قابل ذکر فنکار بن

چکی تھیں۔

میڈیا اور لباس کی دُنیا غلام رسول کے لئے نیویارک سٹی کا سا گھراؤ تھی۔ اُس نے کبھی عورتوں کو کھلے بندوں سگریٹ پیتے، فحش لطیفوں پر ہنستے، بال لہراتے، کندھے اُچکاتے، اپنے جسم کو نمائش کے لئے پیش کرتے نہ دیکھا تھا۔

غلام رسول کو یہ سب کچھ دل سے پسند آیا.......

غلام رسول کو پتہ چلا کہ دراصل وہ اسی ماحول کا اصلی تیراک تھا۔ وہ یہاں رہ کر اس قدر خوش تھا کہ اس سے پہلے ایسی خوشی کا کوئی خواب بھی اُس کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ نیچے درزی خانے میں جاتا تو فیشن کے رسالے، گرم کڑک چائے اور شاندار گاہک خواتین سے ملاقات ہوتی۔ کچھ اپر کلاس کی بیگمات اپنی بیٹیوں کے پورے پورے جہیز مہتاب بوتیک سے بنوا رہی تھیں۔ وہ دفتر سے کھسکتی درزی خانے میں گھس آتیں۔ دو تین اڈے والے گیراج میں سلمیٰ، بادلا، ستاروں کا کام کرتے تھے اور کشیدہ کاری کے ماہر تھے۔ ان سے اندرون شہر کی گوسپ بھی غلام رسول کو سننے میں آتی۔ شہر کی گلیوں میں اپنے رنگ کی رنگینی، قتل و غارت، اغوا کے قصے تھے۔ اوپر جاتا تو ہر وقت ٹیلی ویژن پر نظر پڑتی۔ بیگم صاحبہ کو سارا دن ٹیلی ویژن دیکھنے کا وقت نہ ملتا لیکن ٹیلی ویژن ہمہ وقت آن رہتا۔ اس پر ڈش کے میوزک پروگرام جاری رہتے۔ دُھنی ڈانس اور جنسی ہیجان ابھارنے والے گیت اور ناچ دیکھ دیکھ کر غلام رسول کا دل نہ بھرتا تھا۔ جونہی بیگم صاحبہ کی سپورٹس مرسیڈیز گیٹ سے باہر جاتی، غلام رسول گیت اور ناچ کی اس بے مہار دنیا میں گم ہو جاتا۔ ان نوجوان گانے والوں کو موسیقی ریاض سے نہ ملتی تھی۔ بس جو گیت تھا، تازہ پکے پھل کی مانند تھا..... تھوڑا ترش، تھوڑا میٹھا، تھوڑا قدرتی کڑواہٹ لئے ہوئے —— اس موسیقی میں ایک خوبی بدرجہ اتم تھی کہ اسے سنتے ہی آدمی اس کے ردھم میں گم ہو جاتا اور نچلے دھڑ میں ناچنے کی اُمنگ پیدا ہو جاتی۔ دیکھتے دیکھتے غلام رسول ناچنے کا ماہر ہو گیا۔ وہ بیگم صاحبہ کی عدم موجودگی میں پھڑک پھڑک کر ناچتا۔ ذرا سی پریکٹس سے گلا بھی سر میں ہو گیا۔ پروفیسر صاحب کے گھر میں اُسے باورچی خانے میں بھی محنت کرنا پڑتی تھی اور پڑھنے میں بھی کافی وقت صرف ہوتا تھا، یہاں ٹیلی ویژن سے تعلیم حاصل کرنے میں علم کا کوئی دخل نہ تھا۔ غلام رسول کے بالوں کا سٹائل بھی بدل گیا۔ نیچے ٹیلر ماسٹر سے کف بند قمیضیں

اور خوبصورت جیکٹس سلوا لیں۔ اب وہ آسانی سے دانش صاحب کے گھر کا غریب رشتہ دار لگنے لگا۔

اب جبکہ غلام کا حلیہ بیگم صاحبہ کی بوتیک کے عین مطابق ہو گیا' ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس روز نچلے آفس میں جرمنی کے ایک اخبار کا نمائندہ کچھ تصویریں بنانے کے لئے آیا بیٹھا تھا۔ تینوں ماڈل گرلز آ پہنچی تھیں۔ بیگم صاحبہ تھوڑا سا نروس ہو رہی تھیں کیونکہ ماڈل زبیر نہ جانے کہاں رُک گیا تھا۔ اُس کے گھر فون کئے۔ جس ایڈورٹائزنگ کمپنی میں وہ ملازم تھا' وہاں بھی کئی فون کھڑکائے۔ تینوں ماڈل گرلز تیار بیٹھی تھیں۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں وہ جرمن فوٹوگرافر سے کافی فلرٹ کر چکی تھیں اور اب اُن کی انگریزی ختم ہو گئی تھی۔ آخری بار جرمن نے اپنی کلائی والی گھڑی سے سویٹر کا کف ذرا اُونچا کر کے بیگم مہتاب دانش سے کہا "آئی ایم افریڈ —— اب اگر آپ کا ماڈل نہیں آتا تو میں تصویریں نہیں بنا سکتا۔ مجھے ایئرپورٹ پہنچنا ہے ——"

بیگم صاحبہ آئیڈیاز کی عورت تھی۔ وہ بھاگی بھاگی اُوپر والی منزل میں پہنچی اور پانچ منٹ میں غلام رسول کو مغلیہ عہد کا خوبصورت لباس پہنوا کر نیچے لے آئیں۔ جب سلیم شاہی جوتی' خوبصورت تاج نما ٹوپی اور لمبے مخملی توب میں غلام رسول گلاب کا پھول سونگھتا ہوا سیڑھیاں اُترا تو تینوں ماڈل لڑکیوں نے سیٹی بجائی اور جرمن فوٹوگرافر نے لمبا سا "واؤ" کہہ کر کیمرے کا زاویہ بنانا شروع کر دیا۔

"یہ مغلیہ شہزادہ ہے —— ؟" جرمن فوٹوگرافر نے سوال کیا۔

"ہم نے اسے شہزادہ سلیم بنا کر پیش کرنا ہے ——" اس کے بعد بیگم صاحبہ نے فر فر انارکلی' نور جہاں اور حرم کی زندگی پر بے جوڑ اور تخیلاتی کہانیاں سنانا شروع کر دیں۔

فوٹوگرافر نے اوپر تلے اتنی تصویریں لیں کہ شٹر بند ہونے اور کھلنے میں وقفہ ہی مشکل سنائی پڑتا تھا۔ جرمن جب کام سے فارغ ہو گیا تو اُس نے چھوٹی سی ڈائری میں ماڈل گرلز کے نام پتے اور جسم کے تین بنیادی ناپ لکھے۔ اس کے بعد وہ غلام رسول کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں غلام رسول کا نام پوچھا —— تو بیگم صاحبہ نے فوراً خود انفرمیشن دینا شروع کر دی۔

"یہ پرنس ہے —— اس کا اصلی نام تو غلام رسول ہے لیکن فیملی میں سب اسے

پرنس کہتے ہیں۔ تم بتاؤ یہ پرنس سلیم لگتا ہے ناں ——" جرمن نمائندہ لڑکیوں سے بھی زیادہ غلام رسول کا معتقد ہو گیا اور جرمنی میں اپنے گھر کا ایڈریس اُسے دیا۔

تینوں ماڈل لڑکیوں نے فلمی انداز میں ایک بار پھر سیٹیاں بجائیں' اُونچے اُونچے "واؤ" کہا اور ہنسنے لگیں..... یوں لگ رہا تھا گویا یہ کوئی ڈش کا پروگرام ہو رہا ہے ——

جھوٹ سچ ملا جلا کر جرمن نمائندے کو ایئرپورٹ چھوڑنے خود بیگم صاحبہ اپنی سپورٹس مرسیڈیز میں گئیں۔ غلام رسول کو ماڈلز اپنے ساتھ وین میں لے گئیں۔ سارا راستہ وہ غلام رسول کو پرنس کہہ کر ہی مخاطب کرتی رہیں۔ جب ان ماڈل گرلز کو ڈراپ کر کے غلام رسول گھر واپس آیا تو اُس کا دل اور دماغ دونوں ساتویں آسمان پر تھے۔ وہ دیر تک ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا رہا اور مختلف پوز بنا کر گلاب کا پھول سونگھتا رہا۔

اس دن کے بعد غلام رسول کا نام پرنس پڑ گیا۔ رات کو بیگم صاحبہ نے ہنس ہنس کر دانش کو صبح کے واقعات سنائے اور بار بار غلام رسول کو پرنس کہہ کر پکارا —— اب جب بھی وہ اُس سے کافی' ڈرائی فروٹ' قہوہ مانگتیں' پرنس کہہ کر ہی آرڈر کرتیں۔ مسز مہتاب دانش کا اکلوتا بیٹا حسن ابدال میں تعلیم پا رہا تھا' فون پر اُسے بھی بتایا گیا کہ غلام رسول کو اب سب پرنس سلیم کہتے ہیں۔ اور سارے ملنے والوں کو جرمن فوٹوگرافر کی تفاصیل کے ساتھ ساتھ اُس واقعے کا حوالہ بھی دیا جاتا جس میں غلام رسول نے مغلئی شیروانی کے اشتہار کے لئے ایک جرمن اخبار کے لئے تصویریں کھنچوائی تھیں۔

ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ غلام رسول ایک اور شبخون کا شکار ہوا۔ بیگم صاحبہ ایک کزن کی ڈھولک پر گئی ہوئی تھیں۔ دانش صاحب کسی میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد میں تھے۔ فریج میں سے اپنی پسند کے کھانے نکال کر غلام رسول نے مائیکروواوون میں گرم کئے۔ پیٹ بھر کر روسٹ' قورمہ' کوفتے سندھی پراٹھوں کے ساتھ کھائے اور فارغ ہو کر ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تو اُس نے مغربی پاپ موسیقی سنی لیکن اُسے کالے امریکن ناچتے گاتے پسند نہ آئے۔ وہ یہ جان نہ سکتا تھا کہ سفید امریکی نے کمال عقل مندی سے نیگرو امریکی کو اپنی سنجیدہ زندگی کے طاقت ور بہاؤ میں شمولیت سے روک دیا تھا۔ کالے امریکن کھیلوں اور موسیقی میں خلق کو تفریح مہیا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور سفید امریکی موسیقی اور کھیلوں میں اس کی شمولیت کو اتنا زیادہ پروجیکٹ کرتا تھا کہ کالے امریکی

اتنی شہرت پا کر علم، سائنس اور ملکی ترقی میں اپنے پیچھے رہ جانے پر کچھ اتنے افسردہ بھی نہ تھے —— ڈش کے سٹیشن ہلا جلا کر وہ ایسے ناچ گانے تک پہنچ گیا جس میں لڑکیاں لڑکے تو مشرقی تھے لیکن موسیقی برصغیر پاک و ہند کی نہ تھی..... لباس مغربی اور ناچ گانے جنسی ہیجان ابھارنے والے تھے۔

اس موسیقی میں کچھ ایسی لے، تھرک، دف دف تھی کہ غلام رسول پہلے تو صوفے پر بیٹھا تھرکنے لگا، پھر اُس نے اُٹھ کر ناچنے والوں کے ساتھ قدم ملائے اور اپنے جسم کو آزاد کر کے جنسی ہیجان میں تڑپنے پھڑکنے لگا..... اُسے علم نہ ہو سکا کہ کب اور کس دروازے سے مہتاب دانش اندر داخل ہوئی۔ گو ریپ موسیقی کے الفاظ ہندوستانی تھے لیکن حرکات مغربی تھیں جن میں کاؤ بوائز، میکسکو کے غصے اور جنسی انگیخت نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ گانا ختم ہونے پر جب اُس نے اکیلے ہی تالی بجائی تو ساتھ ہی بیگم صاحبہ نے اپنی تالیاں بھی شامل کر دیں۔

”سوری بیگم صاحبہ —— “ وہ یکدم آسمان سے زمین پر آ گیا۔

”نہیں نہیں ..... تم بہت اچھا ناچ رہے تھے غلام رسول ..... میں تمہارا شو دوبارہ دیکھتی لیکن میری طبیعت بہت خراب ہے۔ مجھے کپکپی لگ رہی ہے۔ ایک قدم اور میں اُٹھا نہیں سکتی۔“ بیگم صاحبہ کھڑی کھڑی لڑھک گئیں۔

پرنس نے بھاگ کر اُنہیں سہارا دیا۔ بیگم صاحبہ نے آرگنزا کی آرپار نظر آنے والی پشواز پہن رکھی تھی، جس کے نیچے سلک کی سلپ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس قدر سردی کے باوجود اُن کے تن پر کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔

”ہائے میں مر جاؤں گی پرنس..... صاحب کو فون کرو۔ ڈاکٹر کو بلاؤ.... جلدی جلدی غلام رسول، میں مرنے والی ہوں۔“

ایک بار پھر وہ غلام رسول کے بازوؤں میں لڑھک گئیں اور ان کے دانت کٹکٹانے لگے۔ غالباً ڈھولک والے گھر میں اُنہیں سردی لگ گئی تھی..... اور دیر تک ناچتے رہنے کی وجہ سے اُن کا سٹیمنا بھی ختم ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ لڑکیوں کی طرح نازک اور دھان پان تھیں۔

بڑے مودب انداز میں وہ بیگم صاحبہ کو اُٹھا کر ماسٹر بیڈ روم میں لے گیا۔ اُنہیں ماسٹر

بیڈ پر لٹایا۔ پیروں کے کھسے اتارے۔ ہیٹر جلایا، کمبل اُوڑھایا۔ بیگم صاحبہ بے ہوش سی تھیں یا کسی اور دنیا میں تھیں، اُنہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں غلام رسول کا ہاتھ لے کر کہا —— ”ذرا میرے پرس میں سے ڈائری نکالو اور ڈاکٹر عباس کو فون کرو —— وہ فوراً آ جائیں .....“ ڈاکٹر عباس کو فون کرنے کے بعد اُس نے اسلام آباد ہوٹل میں دانش صاحب کو فون کیا۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ حسن ابدال فون نہ ہو سکا.....

اب مہتاب دانش پر رونے کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ اُونچے اُونچے سسکنے، آہیں بھرنے اور ہچکیاں لے لے کر کہنے لگی —— ”سب کو اپنی پڑی ہے —— کسی کو میری فکر نہیں —— دانش کو اپنی میٹنگوں کی زیادہ فکر ہے۔ اس اُلّو کے پٹھے، حرام زادے صغیر کو کتنی مشکل سے پالا —— اسے کیا ماما مر جائے یا زندہ بچے —— موج لوٹو.... مزے کرو.... میں کام کر کر کے مر گئی، کھپ گئی —— کسی کو کیا —— اللہ کرے دانش مر جائے..... کبھی وقت پر کام نہیں آیا اُلو۔“

رونے دھونے، واویلا مچانے کے دوران کبھی کبھی وہ بلبلا کر کہتی —— ”اور مجھے پتہ ہے ذرا میری آنکھ لگی، تم نے کوارٹر میں بھاگ جانا ہے۔ تمہارے جیسے لٹیرے میں نے کئی رکھے ہیں۔“

غلام رسول نے بار بار اُسے تسلی دی کہ وہ بھاگنے والوں میں سے نہیں ہے..... اور ان ہی تسلیوں کے درمیان پرنس کہیں اپنی اوقات بھول گیا!

گھانس کی کیسلی دھونی نے اُس کے سینے اور حلق میں آگ سی لگا دی تھی۔ اُس کے تن پر صرف ایک کرتا تھا جس کی اب دھجیاں بکھر چکی تھیں۔ غلام رسول نے اتنے بید کھائے تھے..... اتنے مکوں، گھونسوں، تھپڑوں سے نوازا گیا تھا کہ اب اُس کی آنکھیں الگ الگ دیکھنے لگی تھیں.....

”نہیں نہیں تھانے دار جی، بیگم صاحبہ کا کوئی قصور نہیں..... اُنہوں نے تو مجھے بڑی عزت دی..... مجھے پرنس بلاتی تھیں..... میں ہی اپنی اوقات بھول گیا تھا جی..... ہر انسان کی یہی بیماری ہے سر جی، جب اُسے طاقت مل جاتی ہے تو پھر اُسے یاد نہیں رہتا وہ کون ہے..... میں بھی بھول گیا تھا غلام رسول کو —— سچی میں اپنے آپ کو پرنس ہی سمجھنے لگا تھا..... مائی باپ صرف بادشاہ سبکتگین اپنی پرانی پوستین نکال کر دیکھا کرتا تھا..... نہ دیکھتا تو وہ بھی بھول

جاتا سارا کچھ..... پروفیسر صاحب اچھے آدمی تھے سر..... میں ہی تب بہک گیا تھا..... مجھے کیا لینا تھا جمہوریت سے..... مجھے کیا لینا تھا مساوات سے..... اوئیں..... کچھ تھوڑی سی پی کر بہت زیادہ بہک جاتے ہیں سر، میں بھی غلام رسول کو بھول گیا.....“

”ہمیں دھمکاتا ہے..... ہمیں سکھاتا ہے..... لمبا ڈالو..... اور طبیعت صاف کر دو۔“

اس بار اُس کی طبیعت اتنی صاف کی گئی کہ دوبارہ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

غلام رسول اپنا قصور مان کر ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا تھا!

کج کلاہ

ڈاکٹر فرید احمد مختلف تجربات سے گزرا۔ تعجب ہے تو فقط اس بات پر کہ ہر چھوٹے بڑے تجربے سے اس نے ایک ہی سبق سیکھا۔ اس کے قلب کی ساخت، کردار کی بنت، حالات کی کروٹ نے اسے کبھی اپنے وجود سے پرے دیکھنے کی مہلت نہ دی۔ یوں سمجھئے مناظر تو بدلے، واقعات بھی الٹ پھیر میں آئے پر دل پر اثر ایک ہی نوعیت کا ہوا —— اس کی زندگی میں سارے واقعات نے اسے صرف حب جاہ کا سبق سکھایا..... اپنی کج کلاہ میں انا کا پھول سجانے کا شعور!

یہ بہت پہلے کی بات ہے!

ابھی ڈاکٹر فرید کے جسم اور روح میں جھگڑا پیدا نہ ہوا تھا۔ جسم اور روح ریل پٹڑی کی طرح ساتھ ساتھ ایک ہی منزل کو جاتی تھیں۔ ابھی ambition نے اسے دو راستے، دو منزلیں، دو ترکیبیں اور دو خدا نہ دکھائے تھے۔ ابھی وہ لوگوں کے ہمراہ اور اپنے ساتھ امن، شانتی اور شفقت کے ساتھ رہ سکتا تھا۔ اس کے رویے انصاف پر مبنی اور اس کا عمل اندر باہر ایک تھا۔

لیکن ڈاکٹری کے امتحانوں کے بعد ہاؤس جاب کے دوران اسے ایک عام لیکن احساس کی حد تک انوکھا تجربہ ہوا۔ اس کی ڈیوٹی ان دنوں ایمرجنسی میں تھی۔ جو بھی مریض آتا، کسی ناگہانی آفت سے تڑپتا تڑپتا آتا۔ ایمرجنسی کے ہاؤس جابر خاص طور پر بے چین رہا کرتے۔ انہیں کھانے پینے اور سونے کا خاطر خواہ وقت نہ ملتا۔ ڈاکٹر فرید کو بھی ڈیوٹی دیتے پورے بہتر گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ بے خوابی کا شکار کھلی آنکھوں کچھ نہ دیکھ رہا تھا جب حمیرا وھیل چیئر پر نیم مردہ حالت میں لائی گئی۔ اس کے ساتھ اس کی ہمسائی تھی جو موٹی تازی،

کسی کسائی، آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور بدن کو کالی چادر میں لپیٹے تھی۔

حمیرا کا سارا جسم جابجا آگ لگ جانے کے باعث جلا ہوا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ چہرے پر جل جانے کا کوئی نشان نہ تھا اور باقی سوختہ جسم کے اوپر یہ چہرہ عجیب سا لگ رہا تھا۔

میڈیکل ایڈ دینے کے دوران پڑوسن بولی — "ڈاکٹر صاحب اس حمیرا بیچاری کا دنیا میں کوئی نہیں۔ ایک نابینا ماں ہے جو کسی کام جوگی نہیں۔ پتہ نہیں باقی خاندان والے کون ہیں، کیا ہیں۔ کبھی پتہ ہی نہیں چلا۔ میں تو اس کی چیخیں سن کر دیوار پھاند اس کے گھر پہنچی۔ جانے آگ کیسے لگی، پر ایسا منظر میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ اس کے تو سارے کپڑے جل رہے تھے۔ اس کی قسمت اچھی میں نے اسے کمبل میں لپیٹ کر باہر گھسیٹا ورنہ یہ تو بھسم ہو جاتی ساری کی ساری......"

ڈاکٹر فرید کو پڑوسن بڑی بہادر اور ہمت والی نظر آئی جو حمیرا کو ہسپتال تک لے آئی۔

"یہ ٹھیک ہو جائے گی بیچاری؟ —"

"دیکھئے، پندرہ دن کے بعد بتا سکتے ہیں کچھ —"

اس دن کے بعد پڑوسن بھی کبھی نظر نہ آئی۔ ایک دن حمیرا کی نابینا ماں آئی تھی لیکن وہ بھی محلے کے ایک لڑکے کی منت سماجت کے بعد ہسپتال پہنچی۔ سارا وقت خاموشی سے بیٹی کا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی، حمیرا سے کوئی بات کی نہ کسی نرس سے کلام کیا — اس کے بعد وہ بھی غائب ہو گئی۔

حمیرا کا چہرہ معصوم بچے کا سا تھا۔ اس پر سندھی لوگوں جیسی بولتی آنکھیں جڑی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر فرید نے ایک روز سٹاف سے منت کی.... "سسٹر یہ بالکل لاوارث ہے۔ سب سے کہہ دیں کہ اس کا ذرا زیادہ خیال رکھیں — یہ میری request ہے —"

پہلے تو نرس بامعنی انداز میں مسکرائی.... پھر آہستہ آہستہ وہ بھی حمیرا پر ریشہ خطمی ہو گئی۔

"کیسی ہو؟ —"

"ٹھیک ہوں —" حمیرا بولی۔

"ہمت سے کام لو — جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے —"

"ہاں جی —"

ڈاکٹر فرید جب حمیرا کو دیکھنے آیا تو حمیرا نے اس پر ٹکٹکی باندھ لی، جیسے ڈاکٹر کوئی مسیحا ہو۔

"کیسی ہیں آپ؟ —"

"ٹھیک ہوں جی —"

"اچھا یہ بتائیں آپ کے کوئی بہن بھائی، کوئی ایسا رشتہ دار نہیں جو آپ کی دیکھ بھال کے لیے آ سکے —؟"

"ہمارا تو کوئی نہیں ہے جی۔ ایک ماما تھا، وہ جی دوبئی چلا گیا کئی سال ہوئے — کبھی خط بھی نہیں لکھا۔"

ڈاکٹر فرید نے حمیرا کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی ہمدردی کے ساتھ کہا — "آپ فکر نہ کریں، ہم سب آپ کے لیے ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ابھی جنرل وارڈ میں جگہ نہیں ہے۔ جونہی بیڈ خالی ہوا، ہم آپ کو شفٹ کر دیں گے۔"

ہسپتال والے جو کچھ کر سکتے تھے، خیرات کے طور پر سب نے مل جل کر اس کے لیے کیا۔ اتنے فنڈز نہیں تھے کہ اس کا کچھ مہنگا علاج یا ٹیسٹ کیے جا سکتے۔ لیکن جو میسر آ سکا، اس میں دریغ نہ کیا — ہولے ہولے حمیرا جان پکڑنے لگی۔ ایمرجنسی سے جس روز اسے جنرل لیڈیز وارڈ میں شفٹ کیا گیا، حمیرا خود وہیل چیئر میں بیٹھ کر گئی۔ جاتے وقت وارڈ نرس اسے ڈاکٹر فرید کے پاس لے گئی۔

"سر جی آپ کا بہت بہت شکریہ...... آپ لوگوں کی ہمدردی نے مجھے زندہ کر دیا...... ورنہ...... جی...... جی......" وہ اس قدر خالی تھی کہ اس کے آنسو نکلے نہ آواز، بس کسمسا کر رہ گئی۔ وہ ڈاکٹر فرید کی محبت میں مبتلا تھی نہ ہی اس کی شکر گزار، بس یہ کوئی تیسرا جذبہ تھا جس کے لیے ابھی نام ایجاد نہیں ہوا۔

ڈاکٹر فرید نے بھی ایک بات سمجھ لی..... کہ کبھی کبھی تسلی و تشفی دوا سے بھی زیادہ پراثر ہوتی ہے۔ وہ غریب مریض جو مہنگی مہنگی ادویات اور جدید ٹیسٹ نہیں کروا سکتے، بارہا رشتہ داروں اور دوستوں کی جھوٹی سچی توجہ حاصل کر کے صحت مند ہو جاتے ہیں۔ تسلی، تشفی سے بھی روگ ہرن ہو جاتا ہے — پانچ سال کی کشٹ بھری پڑھائی کے بعد ڈاکٹر فرید

کو علم ہوا کہ دوا اگر جسم پر اثر کرتی ہے تو دعا اور تسلی روح کو شفایاب کر دیتی ہیں..... دونوں مل جل کر اور الگ الگ بھی صحت کی منزل کو پا سکتے ہیں۔

تجربہ معمولی اور عام سا تھا!

نتیجہ بھی بارہا پہلے لوگ اخذ کر چکے تھے..... لیکن ڈاکٹر فرید نے اس نسخے کو مریض کے لیے نہیں، اپنی ہر دل عزیزی کے لیے اپنایا۔ جس طرح انگریز حکمران دیانت کو پالیسی کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا ایسے ہی فرید احمد نے مریضوں کے ساتھ ہمدردی، میٹھے بول، تسلی، تشفی کو پالیسی بنا لیا۔ وہ اس قدر اولوالعزم تھا کہ اس رویے میں بھی اس نے صرف اپنی شہرت، کامیابی، نیک نامی اور دولت کا سربستہ راز تلاش کر لیا۔ رفتہ رفتہ اس کی مسکراہٹ جھوٹی، تسلی کھوکھلی اور تھپکی بے معنی ہوگئی۔ اب اس کا رویہ جسمی طور پر نیک اور روحی طور پر پتھریلا تھا۔ لوگ اس کے کالر میں سجے کارنیش اور دہن سے نکلے میٹھے بولوں کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکتے۔

ہاؤس جاب کے دوران اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کبھی پرائیوٹ کلینک کا مالک ہوگا۔ وہ ایک متوسط گھرانے کا ہونہار فرد تھا جہاں معاشیات اور اقدار بڑے سکھ کے ساتھ مل جل کر رہ رہی تھیں۔ اس کے دل میں لٹے لٹے بالوں والے فریدا کا خیال کبھی نہ ابھرا حالانکہ وہ اپنے باپ سے اس کی بہت باتیں سن چکا تھا..... نہ ہی کبھی اس نے سٹیٹس اور معیار زندگی بلند کرنے کے خواب دیکھے گو ان کے لشکارے بھی اس کے ارد گرد بہت پھیلے تھے۔ ابھی اس کے جسم اور روح کے درمیان بحث کا آغاز شروع نہ ہوا تھا..... وہ دونوں توام بچوں کی طرح ایک ہی پالنے میں خوش تھے — ابھی انا کا بوٹا چھوٹا تھا، اس میں پھول پتے نہ آئے تھے۔

یہ بھی بہت بعد کی بات ہے —

جب ڈاکٹر فرید احمد شہر کا مشہور ترین ڈاکٹر بن گیا۔ ہسپتال میں ملازمت کے دوران ہی اس کے جسم نے بغاوت کر دی تھی۔ وہ بہت کام کرنے کے بعد اسی تناسب سے اس کا معاوضہ بھی چاہتا تھا۔ اسی لئے صبح کے وقت وہ ملازمت کرتا اور شام کو چار گھنٹے کلینک پر گزارتا۔ یہیں اس کی روح شیشے کے کیپسول میں بند جسم کے ساتھ تو رہنے لگی لیکن منہ میں انگلی ڈال کر سوچتی رہی کہ..... کیا اس کے لئے بھی ڈاکٹر فرید کو کچھ وقت سیرابی کا مل

سکتا ہے کہ نہیں؟ — لیکن روح تو دور کی بات ہے، وہ تو اپنے بیوی بچوں کی محبت میں بھی گوندھا نہ جا سکا —

اس کے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا کہ وہ گھر والوں کی قربت میں رہ کر ان کو بہتر طور پر جان سکتا۔ فرید احمد کی خوبصورت، پڑھی لکھی، شائستہ بیوی کو بھی خاموشی اختیار کرنا پڑی کیونکہ کلینک کی آمدنی سے وہ بھی اپنے کئی حصوں میں بٹے ہوئے وجود کو شانت کر سکتی تھی۔ شادی کے سفر میں فرید احمد تو حاصل نہ ہوا لیکن دولت مل گئی..... اور اس بوتل میں بند دولت کے جن نے اس کی کئی چھپی، ان کہی، چاہی، ان چاہی خواہشات کا بازار کھول دیا۔ اس کی مصروفیت کا عالم یہ ہو گیا کہ لبنیٰ کو یہ بھی بھول گیا کہ وہ فرید احمد کو کیوں حاصل کرنا چاہتی تھی! ہاتھ اور دستانے کی طرح فرید احمد اور لبنیٰ ساتھ ساتھ رہنے لگے اور ان دونوں کی شناخت بھی قائم رہی، ہاں دونوں کی انا کے رنگ برنگے پھولوں نے روح کو کفن کی طرح ڈھانپ لیا۔

اچانک کلینک کے دوران ایک شام فرید احمد کے ہاتھ وہ نسخہ آ گیا جس پر عمل کرنے سے انسان اپنی طاقت بڑھا سکتا ہے۔ اس نے ہاؤس جاب والے سحر القلوب کے تعویذ کے ساتھ اس نسخے کو روح کے بند کیپسول کے اندر چھپا لیا۔ تمام ایجادات اور علم کی طرح طاقت کا یہ نسخہ بھی حادثاتی تھا۔

اس شام بادل گڑگڑا رہے تھے۔ فرید نے اپنی بیگم اور بچوں کو کسی ہوٹل میں ڈنر کھلانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ سارا دن اس کی روح کسی بیوہ عورت کی طرح رو رو کر اس سے اپنا حصہ مانگتی رہی — وہ کلینک پر پانچواں مریض دیکھ رہا تھا، جب بغیر اطلاع کے آفس کا دروازہ کھلا اور اجنبی آتے ہی پھٹ پڑا — "ڈاکٹر صاحب میری بیوی مر رہی ہے، آپ اللہ واسطے میرے ساتھ چلیں — صرف دس منٹ کے لئے۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

فرید کے سامنے ایک ستر سالہ عورت سلک کی ساڑھی پہنے، ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں سجائے اپنے بریسٹ کینسر کے آپریشن کی تفصیلات بیان کر رہی تھی۔ نووارد کے پیچھے کھڑے پی اے نے اپنی صفائی میں کہا "ڈاکٹر صاحب! میں نے ان کو بتایا تھا کہ میں کسی کو بغیر اجازت اندر جانے نہیں دے سکتا۔ لیکن یہ مانے نہیں، مجھے دھکا دے کر اندر گھس

آئے ہیں۔ میرا قصور نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔"

"سر..... ڈاکٹر صاحب پلیز مجھے پروٹوکول کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ آپ پلیز دس منٹ کے لئے میرے ساتھ تو چلیں، وہ مر رہی ہے — میری بیوی زاہدہ....."

ڈاکٹر فرید احمد نے بڑے تحمل سے کہا — "آپ ویٹنگ روم میں مریضوں کی قطار دیکھ آئے ہیں۔ آپ انتظار کر لیں تو میں ان کو دیکھ کر آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں —"

یہاں تک ڈاکٹر اور مرن کنارے مریضہ کے شوہر کی آوازیں نارمل تھیں۔ لیکن اب شوہر آگ پکڑ گیا — وہ چلا کر بولا — "یہ چوتھا کلینک ہے جس سے مجھے خیر نہیں پڑی۔ کیا شہر کا ہر ڈاکٹر پروفیشنل لٹیرا ہے؟ پیسہ کمانا اور دھکے دینا ہی صرف آپ کا پروفیشن رہ گیا ہے؟" اس آواز سے ڈاکٹر کا رد عمل تیار ہوا۔ وہ برفیلی آواز میں بولا — "میں نے اپنی کلینک کا نام بڑی مشکل اور ڈسپلن سے بنایا ہے۔ ابھی نکل جاؤ ورنہ مجھے نکالنا آتا ہے۔"

بوسنیا کے سربوں کی طرح فرید احمد خفیہ طاقتوں سے لیس تھا جبکہ نالائق شوہر بوسنیا کے مسلمانوں کی طرح فقط جذبہ ہی جذبہ تھا۔ ٹکراؤ کی حالت میں نقصان شوہر نے قبول کئے اور کچھ دیر بے عزتی برداشت کر کے کلینک سے روانہ ہو گیا۔

اس سے پہلے کئی بار ایسے ہی تجربات سے ڈاکٹر فرید احمد دوچار ہوا تھا لیکن کسی تجربے نے اسے طاقت کا نسخہ نہ سجھایا تھا — یہ واقعہ بھی حادثاتی تھا اور اچانک پیش آیا۔

اس سے پہلے ڈاکٹر فرید احمد مریضوں اور لواحقین کے ساتھ گستاخی کر کے پشیمان ہوتا۔ معافی مانگتا، احساس جرم کا شکار رہتا، کبھی کبھی موقعہ مل جاتا تو توضیحی جملوں سے اپنا بیان بھی جاری کر دیتا — لیکن اچانک، بالکل حادثاتی طور پر اسے گستاخی اور بے عزتی کو بھی استعمال کرنے کا طریق آ گیا۔

تجربات بھی عجب شے ہیں، ہر شخص ان سے اپنی مرضی کا سبق سیکھتا ہے۔ کچھ تجربات بار بار ہوتے ہیں اور انسان ان سے کچھ سیکھ نہیں پاتا۔ اپنے اپنے کردار اور استعداد کی بات ہے۔ سہیل نے اسی واقعے سے ایک اور قسم کی تعلیم حاصل کی جبکہ ڈاکٹر صاحب کو حب جاہ کا، طاقت کا، آگے بڑھنے کا ایک اور نسخہ ہاتھ آ گیا۔

ڈاکٹر فرید کو یہ واقعہ بھول گیا لیکن چند ہی دن بعد شوہر بڑی دیدہ دلیری اور منہ

زوری سے پھر آن موجود ہوا۔ ڈاکٹر فرید احمد اس وقت ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے مینجر کو بے خوابی کے متعلق لیکچر نما مشورہ دے رہے تھے۔

سہیل نے ڈاکٹر کی لمبی میز پر ہاتھ رکھ کر کہا — "ڈاکٹر صاحب! اس دن آپ نے میری بیوی کا بڑا اچھا علاج کر دیا، میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ اچھا کیا آپ میرے ساتھ نہ گئے۔"

یادداشت پر دباؤ ڈال کر ڈاکٹر بولا — "اگر تم کچھ دیر انتظار کر لیتے بھائی تو میں ضرور چلتا —"

سہیل نے اپنی کلائی سے گھڑی اتار کر میز پر رکھ دی اور بولا — "یہ بطور شکریہ سر، میں جانتا ہوں آپ کے قابل نہیں لیکن — اس روز مجھے بے عزتی کے نسخے کی بڑی ضرورت تھی ڈاکٹر صاحب...... زاہدہ سے پہلے میرا علاج ہو گیا۔ میں ساری عمر خوف سے لرزتا رہا۔ گھر لوٹتے ہوئے میں نے سوچا..... زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا، زاہدہ مر جائے گی — میں اور بچے تنہا رہ جائیں گے۔ آپ نے ایک ہی نسخے میں میری سب سے بڑی بیماری نکال دی جڑ سے...... میں ہر خوف سے نکل کر ایک ہی خوف میں داخل ہو گیا...... جب میں آپ کے پاس آیا تھا..... تو میں ڈاکٹر کو خدا سمجھ کر آیا تھا۔ آپ میرے ساتھ چلے جاتے تو میں سمجھ نہ پاتا..... کہ خدا اور چیز ہے — پتہ ہے ڈاکٹر صاحب، واپسی پر جب میں گھر پہنچا تو زاہدہ بیٹھی چائے پی رہی تھی — اور خدا وہاں موجود تھا......"

وہ جلدی سے پلٹا اور باہر نکل گیا۔

ایک ہی واقعے سے سہیل اور ڈاکٹر فرید نے الگ الگ نتائج اخذ کیے۔ ڈاکٹر فرید احمد نے یہاں بھی حب جاہ کا ہی سبق سیکھا۔ سہیل کی گھڑی دیکھ کر اسے کامیابی کا احساس ہوا — اپنی طاقت کا اعتراف......

ہاؤس جاب کے دوران بنائی ہوئی پالیسی نے اس کا رویہ نرم اور لجاجت آمیز بنا رکھا تھا۔ گو اس رویے نے اس کی نیک نامی میں بڑے اہم اضافے کیے تھے، لیکن سہیل والے واقعے نے اسے ایک نئی طاقت کا احساس دلایا۔ وہ انگریزوں کا بہت قائل تھا۔ اتنی تھوڑی نفری کے ساتھ اتنے بڑے ملک پر حکومت کرنا ان کی درست پالیسی کی وجہ سے تھا۔ انگریز نے پھوٹ ڈال کر حکومت کی۔ جاگیردارانہ نظام مستحکم کر کے اپنی جڑیں مضبوط

کیں۔ وہ قید بھی کرتا تھا اور سر کے خطاب سے بھی نوازتا تھا۔ اب ڈاکٹر فرید کو پتہ چلا کہ لوگ بے عزتی سے بھی کھنچے چلے آتے ہیں۔ کبھی گلے لگالیا، کبھی دھکا دے دیا۔ کبھی تحفہ دے دیا، کبھی پگڑی اچھال دی۔ کبھی ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھایا، کبھی پہچانے بغیر قریب سے نکل گئے۔ لیکن اپنے رویے کی، کسی غلطی کی کبھی کوئی وضاحت پیش نہ کی۔ لوگ پہیلی سے خوش رہتے ہیں۔ جو سمجھ میں آجائے، اس سے اوب جاتے ہیں۔ جو سمجھ میں نہ آئے، اس کی کھوج میں رہتے ہیں۔ جہاں ان کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے، اسی چوکھٹ پر ماتھا رگڑتے ہیں۔ جاگیردار کی چوکھٹ پر مزارعہ بار بار آتا ہے، بھاگ نہیں جاتا۔ جس جاگیردار کے ہاتھوں مزارع کی عزت لٹتی ہے، اسی کے ہاتھوں مزارع کو سر پر پگڑی رکھوانے کا شوق بھی ہوتا ہے۔ جس قدر عقل انسان کو خودداری اور خودمختاری سکھاتی ہے اتنا ہی انسان جذبات کے ہاتھوں مغلوب بھی رہنا چاہتا ہے۔ اب ڈاکٹر فرید آری کی طرح چلنے لگا..... نیچے جاتا تو تسلی اور تشفی سے کاٹتا، اوپر اٹھتا تو تلوار کی طرح کچھ باقی رہنے نہ دیتا۔

اسی رویے نے لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت اور خوف کو جنم دیا۔ اب لوگ پہلے سے بھی زیادہ گرم جوشی سے اس کی جانب بڑھنے لگے..... حالانکہ محبت اور خوف دو علیحدہ پٹڑیاں تھیں اور اس کے جسم اور روح کی طرح ان کا نقطۂ اتصال کہیں نہ تھا۔ اس دوہری طاقت نے اس کے جسم اور روح کا سفر بالکل الگ کر دیا اور دونوں ایک دوسرے سے بے خبر رہنے لگے۔ جن باتوں سے اس کا جسم توانا ہوتا، روح لاغر ہونے لگتی اور جن آدرشوں سے روح میں توانائی آتی، ان سے جسم کمزوری محسوس کرنے لگتا۔

کچھ سال طاقت کی اس پالیسی پر عمل کرتے گزر گئے۔ شہر میں اس کی مشہوری پھیلانے والے دو گروہ بن گئے۔ کچھ مریضوں کا خیال تھا کہ وہ محبت ہی محبت ہے جبکہ کچھ اس کے رویے سے خوف زدہ تھے۔ انہیں ڈاکٹر فرید احمد کی سمجھ نہ آتی، لیکن ایسی کوئی وجہ نہ تھی جو ان کے خوف کی وضاحت کر سکتی۔ علاج معالجے سے کہیں زیادہ اس کا رویہ اس کی شہرت کا باعث ہوا۔ وہ زیادہ بدکلامی یا بدزبانی نہیں کرتا تھا لیکن کچھ ایسا ٹھنڈا شاور چلا دیتا کہ امیر آدمی بطور خاص گھبرا جاتا۔ متمول آدمی خوشامد کا عادی ہوتا ہے۔ اتنے سارے لوگ اس کی جی حضوری کا دم بھرتے ہیں کہ وہ یخ بستہ رویوں کا عادی نہیں رہتا۔ ڈاکٹر فرید بھی طوائف کی طرح جان گیا کہ امیر آدمی اندر ہی اندر کہیں خوشامدی لوگوں سے

تھک چکے تھے اور اپنی بے عزتی سے لطف اندوز ہونے کوٹھے پر جاتے تھے۔ اب وہ امیروں کے ساتھ نرمی سے پیش نہ آتا — ان کے ساتھ اس کی پالیسی تھی کہ کھینچنا کم اور دھتکارنا زیادہ۔ وہ زبانی کلامی تو امیر لوگوں کو کمتری کا احساس نہ دلاتا لیکن موقع محل دیکھ کر ایسے رویے اختیار کرتا جہاں کسی امیر مریض کو یہ بات پتہ چل جاتی کہ وہ ڈاکٹر فرید کے سامنے نہ صرف جسمانی طور پر علیل اور کمزور ہے بلکہ اس کی دولت کے ڈھنڈار تلے اس کی روح، کردار اور شخصیت بھی کچھ ایسی مضبوط نہیں۔

آہستہ آہستہ کلینک پر درمیانہ طبقہ اور غریب لوگ کم ہونے لگے۔ کچھ تو اس کی وجہ کلینک کا ڈیکور تھا۔ اطالوی اور سوئس طرز کا فرنیچر، المونیم کی کھڑکیوں کے آگے ورٹیکل بلائنڈز، کارپٹ، دو تین میز پر دھرے فونوں کے علاوہ Cellular فون، کمپیوٹر، چھوٹے موٹے سائنسی گیجٹ، آہستہ بولنے والی نرسیں، الماریوں میں آراستہ کتابیں..... ان گنت خوبصورت بکھیڑے — سادہ زندگی بسر کرنے والوں کے استعمال میں یہ چیزیں نہیں تھیں۔ ان کی سکڑی شخصیتیں یہاں پہنچ کر اور بھی سکڑ جاتیں۔ وہ آواز گرا کر، کرسی پر آگے کو ہو کر بیٹھتے اور ان کی کمر میں خواہ مخواہ گولائی آجاتی۔ انہیں مہنگی دوائیں اور ان گنت ٹیسٹ بھی گھبرا دیتے۔ ایسا مہنگا علاج ان کی دسترس میں نہیں تھا..... لیکن زیادہ مصیبت ڈاکٹر صاحب کی Frequency کی تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کمفرٹیبل محسوس نہ کرتے — تیز روشنی میں آجانے کی وجہ سے جیسے آنکھیں چندھیا جائیں ایسے ہی غریب لوگ ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر پہنچ کر اپنی بیماری کو فضول اور اپنے آپ کو بے مایہ سمجھنے لگتے......

یہ کام کچھ ایک دن کا نہ تھا!

بلکہ کئی سالوں پر پھیلا تھا۔ دھیرے دھیرے ڈاکٹر فرید احمد امیروں کا ڈاکٹر اور بڑا اہم کنسلٹنٹ بن گیا۔ اس کا وقت امیروں میں گزرنے لگا اور اس کے رویے فیوڈل لارڈز کے سے ہوگئے۔ فرید احمد ایک خوبصورت آدمی تھا۔ وہ فرانسیسی سوٹ، سلک کی ٹائیاں، اطالوی جوتے پہنتا۔ اس کی کلائی پر لاکھوں کی گھڑی ہوتی، چہرے پر Featherless عینک۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے میں تکبر کی چاشنی اور بات سننے کا انداز ایسا ہوتا جیسے کوئی پرانا لطیفہ سنتا ہو۔

ان گنت امیر لوگ اس کے حلقۂ ارادت میں بندھتے گئے۔ ان ہی میں آر کیٹیکٹ جہاں زیب بھی تھا۔ شہر کی کئی قابل ذکر کوٹھیاں، پلازا، شاپنگ سنٹر، بنکوں کی عمارتیں، ہوٹل اس کے ڈیزائن شدہ تھے۔ وہ شہر کا بڑا ہی قابل انجینئر تھا اور اس کی اپنی Consultancy کمپنی تھی جس میں نوجوان نئے خیالوں کے ساتھ اور پرانے آر کیٹیکٹ اپنے تجربے کو لیے ہر وقت اس کی کمپنی کو تازگی اور مضبوطی عطا کرتے رہتے۔

جہاں زیب بلڈ پریشر، کمر کے مستقل درد، گلے کی سوزش، نیند کی کمی، اجابت کی بے قاعدگی، بھوک کے بغیر کھانے کی عادت، دانتوں کے درد، آنکھوں کی کمزوری جیسی کئی عارضی اور مستقل بیماریوں میں مبتلا تھا۔ ان عارضوں کی وجہ سے ڈاکٹر فرید کے ساتھ اس کی ملاقات کافی اوپر تلے ہونے لگی۔ جسمانی عارضوں کے علاوہ اسے کئی ایسے مسائل بھی درپیش تھے جو وہ ڈاکٹر فرید سے بحث میں لا کر اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرتا۔ ٹریفک، عورتوں کے حقوق، مہنگائی، ملکی حالات اور اس میں سیاسی دھڑے بازی، شہر کی صفائی، مشرقی لوگوں کی جہالت اور ترقی نہ کر سکنے کی سکت، سڑکوں کی حالت، غلاظت کے انبار، رشوت، سفارش، تعلیم..... یہ وہ ٹاپک تھے جن پر ڈاکٹر اور جہاں زیب گھنٹوں باتیں کرتے رہتے — ان ہی پر کیا موقوف تھا، شہر کے ان گنت امیر لوگ اور ان کی بیویاں بڑی بڑی دعوتوں پر، فائیو سٹار ہوٹلوں میں، بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت کے بعد ان ہی عنوانات پر بڑی لمبی بحثیں کیا کرتے تھے۔

جہاں زیب پینتالیس کے لگ بھگ تھا۔ اس عمر میں اس کی زندگی کی کامیاب داستان دیو مالائی ہو چکی تھی۔ وہ بڑے دیدہ زیب ڈیزائنر کے کپڑے پہنتا، سفید سیاہ چیک کے کوٹ، جل سے چپکائے ہوئے لمبے بال، امریکیوں جیسی تیز چال، اتھلا پتھلا انداز زیست، اپنے کام میں مستعدی کے علاوہ ہر activity میں سستی، عورتوں سے بیشتر وقت دوری اور بسا اوقات بہت زیادہ خلط ملط، بچوں میں عدم دلچسپی، نئے ماڈل کی کاروں سے والہانہ عشق، عمر ڈھلی عورتوں کی کمپنی میں خوش — جہاں زیب عمر کے پرکشش عہد میں تھا، جب مرد دولت اور سٹیٹس پا لیتا ہے۔ اس میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ وہ جلد ہی ڈاکٹر فرید احمد کا سرفہرست دوست بن گیا۔

ایک روز جب شام کو آمد بہار کی ہوا جھول رہی تھی، وہ دونوں لان میں سفید

کرسیوں پر چھپی ہوئی لائیٹوں کی روشنی میں بیٹھے تھے۔ جہاں زیب کو ڈاکٹر پر پیار آ گیا۔

"تمہارے متعلق ڈاکٹر بہت سی کہانیاں شہر میں پھرتی ہیں۔ اصلی اور سچی کون سی ہے؟"

"کہانیاں جنم دینے میں تم مجھ سے کچھ کم تو نہیں ہو —" ڈاکٹر بولا۔

"چونکہ سوال میں نے پوچھا ہے اس لیے جواب آپ دیں — لیکن سچا ہو۔"

"اور اگر سچا جواب مجھے خود معلوم نہ ہو تو —؟" ڈاکٹر بولا۔

"جہاں تک اور جس قدر آگہی ہو، وہی بیان کریں —" جہاں زیب نے اپنی گھنی مونچھوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی پرت در پرت ہے — کون سی بیان کروں..... ہسپتال کی — کلینک کی یا نجی —؟"

"نجی — اور وہ بھی بہت ہی پرسنل! آج قریب ہونے کو جی چاہتا ہے۔"

ڈاکٹر نے مختصر لمحے توقف کیا اور پھر بولا "شادی کی تھی، چلی نہیں۔ دو تین بے خیالی کے عشق کیے۔ چند دوست بنائے لیکن نباہ نہ ہو سکا۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا ایک رابطے کا بچپن جوانی اور بڑھاپا نہیں ہوتا؟ ہر رشتہ وقت کے ساتھ بوڑھا ہو کر مر نہیں جاتا —؟"

"تمہارے بیوی بچے —؟"

"تھے..... دو بیٹے، ایک بیوی — پودے کو پانی نہ دو تو سوکھ جاتا ہے — بیوی بچوں کو وقت نہ دے سکو تو وہ بھی سسک سسک کر مرجھا جاتے ہیں۔ دونوں بیٹے اپنی ماں کے ساتھ کینیڈا چلے گئے۔ کبھی کبھی خط آ جاتا ہے، کبھی فون پر خیریت معلوم ہو جاتی ہے اور بس —"

"طلاق؟"

"نہیں جہاں زیب، امیر آدمی سے عورت عموماً طلاق لینا پسند نہیں کرتی۔ Separation مسئلے کا حل ہے — علیحدگی — ضروریات پوری اور ذمہ داری صفر — اور تم — تم زیب؟ —"

"اکیلا — تنہا — ابھی میری Success story مکمل نہیں ہوئی۔ جب میں شادی کے لیے وقت نکال سکوں گا تو پھر کسی کو گھر باندھوں گا۔ زنجیر سے بندھے ہوئے کتے

کو بھی سیر پر لے جانا پڑتا ہے — وہ تو بھرپوری کی پوری عورت ہوگی، توجہ کے بغیر کیسے جیئے گی!"

بڑی دیر تک وہ دونوں فلسفیانہ انداز میں شادی اور زندگی کے متعلق موشگافیاں کرتے رہے۔ پھر اچانک جہاں زیب نے ڈاکٹر فرید احمد کی زندگی بدل دی۔

"کبھی آپ کو خیال آیا کہ آپ اس قدر محنت کیوں کر رہے ہیں جب کہ آپ کو اس سارے پیسے کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں —؟"

"بس مجھے دولت اچھی لگتی ہے — میں دولت کو استعمال کرنا جانتا ہوں — اس کی افادیت کو سمجھتا ہوں —"

کچھ دیر جہاں زیب خاموشی سے اپنی گھنی اور لچھے دار مونچھوں کو بل دیتا رہا، پھر آہستہ سے بولا "کبھی خیال آیا کہ اگر...... اگر دولت بغیر مشقت کے مل جائے تو کیسا؟"

"کبھی سوچا نہیں۔ دولت حاصل کرنے کے لیے تو محنت کرنا ہی پڑتی ہے —" ڈاکٹر بولا۔

"اگر...... اگر کبھی بغیر محنت کے دولت حاصل ہونے لگے تو کیا اسے ہضم کر لیں گے؟..... خودبخود بیٹھے بٹھائے بغیر کچھ کئے دولت کو خمیر لگ جائے، دولت رول ہونے لگے — دولت کو invest کرنے کا کبھی آپ کو خیال آیا ہے؟ سٹاک ایکسچینج، شیئرز، ہلکا پھلکا سودی اضافہ نہیں بلکہ...... ہر دن کے ساتھ رقم کا ان گنت انڈے بچے دینا...... آج کچھ کل کچھ......"

ڈاکٹر فرید احمد نے اپنے کان میں انگلی پھرائی اور چند لمحے توقف کے بعد بولا — "میں پہلے ہی کافی امیر ہوں — ایک بیوی، دو بچے کینیڈا میں افورڈ کرتا ہوں — پھر کبھی سوچا نہیں —"

"میں بھی کافی امیر ہوں ڈاکٹر فرید — لیکن کبھی آپ نے دولت کو بطور طاقت کے Imagine کیا ہے؟ —"

"طاقت کے —؟" اس طاقت سے ابھی وہ نا آشنا تھا!

"کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ساری ڈاکٹری، ساری انسانی ہمدردی کے باوجود آپ اس قدر طاقت ور نہیں ہو سکے جتنی طاقت آپ کو دولت دے سکتی ہے — آخر انسان

کیوں جیتا ہے؟ اس کا کوئی Goal، کوئی منزل، کوئی Priority ہوتی ہے ناں؟ —"

ڈاکٹر غیر شعوری طور پر جانتا تھا کہ انسان ہر لمحے رب بننا چاہتا ہے۔ سب سے بڑا نشہ حب جاہ کا ہے — کار کا دروازہ کوئی اور کھولے..... غسل خانے میں کپڑے کوئی اور لگائے...... فائل کوئی اور پیش کرے..... فون پہلے کسی اور کان سے لگے...... ان چھوٹی چھوٹی طاقتوں سے آگے نکل کر جاگیردار کی طاقت، سرمائے دار کی طاقت، مذہبی لیڈر کا دبدبہ، تریاہٹ کی طاقت...... کئی قسم کی طاقتیں اور ان کے نشے اس پر اچانک کھلے...... ابھی چند لمحے پہلے اس کے پاس طاقت کے دو فارمولے تھے لیکن اس علم کی عمر پرانی ہو چکی تھی۔ "میں نے کبھی سوچا نہیں — جہاں زیب — میں امیر لوگوں کا ڈاکٹر ہوں، میں نے کچھ کم دولت نہیں کمائی —"

"اب آپ ریٹائر ہونے والے ہیں، آپ کو سوچنا چاہیے۔ شائد آپ کلینک بھی چلانا نہ چاہیں —"

"پھر سارا وقت میں کیا کروں گا؟ — میرا مقصد کیا ہوگا زندگی کا —؟"

"آپ دولت کو آنے تو دیں — دولت اپنے ساتھ بڑی مصروفیت لاتی ہے" —

"لیکن لوگ — لوگ —؟ میں اکیلا کیا کروں گا دولت کو —؟"

"شہد کی مکھی پھول پر آتی ہے خودبخود — لوگ کھنچے جاتے ہیں دولت پر — کھینچنا نہیں پڑتا انہیں — دولت میں ایسی کشش ہے..... جو اسے پسند کرتا ہے، وہ بھی اور جو پسند نہیں کرتا، وہ بھی...... مقناطیسی طاقت ہے دولت میں —"

ڈاکٹر فرید احمد نے کبھی سوچا تو نہیں تھا لیکن لفظ کی طاقت، تلوار کی طاقت..... ہر قسم کی طاقت کا نشہ محسوس کر سکتا تھا۔

یہ ریٹائر ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے اور کلینک بند ہونے کے بعد کی بات ہے!

جہاں زیب گلبرگ کے مین بلیوارڈ میں ایک سات منزلہ سپر مارکیٹ بنانے والا تھا۔

ڈاکٹر فرید احمد نے اسی سکیم میں اتنا اثاثہ لگا دیا کہ صبح ہسپتال اور شام کلینک بند ہو جانے کی کمی محسوس نہ ہوئی — کچھ عرصہ روپیہ پھولنے بڑھنے اور اپنے جیسے امیر لوگوں سے رابطے بنانے میں صرف ہوا۔

عورتوں کے چونچلے اٹھانے کے امکانات

بیرونی ممالک کے سفر

بازاروں کے چکر

لیکن یہ تجربات ہلکی ورزش کی طرح تھے، اس کے جسم نے انہیں محسوس نہ کیا۔

وہ محنت کا عادی تھا۔ زندگی میں ایسی فراغت سے اسے چڑ ہونے لگی —— ایسے میں اس نے اپنے اوقات بھرنے کے لیے مذہب کی طرف توجہ دی۔ وہ ایسی کتابیں پڑھنے لگا جن میں اولیاء کی زندگی اور ان کے ملفوظات، مرقومات، حالات درج تھے۔ ہولے ہولے وہ مذاہب کے تقابلی مطالعے میں غرق ہوگیا۔ اس کی سوجھ بوجھ بڑھنے لگی، علمی سطح بلند ہونے لگی۔

لیکن عجب سی بات ہے کہ دنیا کا سفر جسم اور روح کا سانجھا سفر ہے۔ کچھ لوگ جسم کو اس درجہ پامال کرتے ہیں کہ روح تو بہت آگے نکل جاتی ہے لیکن جسم انہیں پیچھے ہی گھسیٹتا رہتا ہے۔ مذہب کے راستے پر بھی سڑک دو رویہ ہے..... جسم کا سایہ روح پر پڑتا ہے اور روح کی تنویر جسم پر۔ راستہ کہیں درمیان میں ہے —— شدت میں یک طرفہ نہیں۔ مذہب کے تمام rituals جسم کے لیے ہیں اور مذہب کا essence روح پر اثر کرتا ہے۔ اگر وضو کیے بغیر نماز ادا کی جائے تو روح کی برتری تو قائم ہوگی لیکن جسم کی پاکیزگی کا نقدان ہوگا۔ ایسے ہی تمام احکامات دو رویہ ہیں۔ روزہ جسم کا بھی ہے اور روح کا بھی —— حج روح کی بالیدگی کے لیے اہم ہے اور جسم کی عاجزی کے لیے۔

لیکن ڈاکٹر فرید احمد کو علم کی ہتھکڑی لگ گئی تھی۔ وہ باعمل مسلمان نہ ہوسکا، بس علم کے پنکھ لگا کر اڑنے لگا۔ جب اس کی اڑانیں فضا میں قوس قزح کی طرح بکھرتیں تو لوگ متحیر ہو کر دیکھتے —— سنتے...... مبہوت ہوتے —— دیکھتے رہ جاتے۔

اب ایک نیا دور شروع ہوا!

پہلے تو نجی بحثیں چلیں۔ آپس میں دوستوں کے درمیان اس کے علم کا جھنڈا بلند ہونے لگا۔ پھر چرچے ہونے لگے۔ اقتصادی، سیاسی، ذاتی مسائل میں بندھے لوگ اپنے مسائل سلجھانے کے لیے کبھی کبھی کسی دوست کے ساتھ اس کے گھر آنے لگے۔ ایک اخباری نمائندہ ریٹائر ہونے پر اس کے تاثرات لینے کے لیے آیا اور اسے جمعہ کے روز "آپ کے مسائل" کا کالم لکھنے پر مجبور کر گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب فرید احمد کو فرار ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ایک پنکھ ٹوٹا ہوا تھا..... ایک ٹانگ نہ تھی..... ایک آنکھ میں بصارت نہ تھی۔ وہ نیکی کو بھی فارمولے کی طرح استعمال کرنے لگا۔ وہ اسلام کے جوہر کا عاشق تھا حالانکہ جسم عمل میں روح کے ہمراہ تھا اور ان دونوں کی جہت، رخ اور آمادگی کے بغیر درمیانی راستے پر چلنا بیکار تھا۔

یہی وہ وقفہ تھا جب صوفیائے کرام کی باتیں اس کے کالم کا حصہ بن گئیں اور اس کا اپنا قول و فعل الگ الگ سمت میں سفر کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کالم نے اس کی شہرت کو ہوا دی۔ اب وقت، بے وقت زمانے کے ستائے ہوئے لوگ اس کی طرف بڑھنے لگے۔ مسائل کی پوٹلی بغل میں دبائے لوگوں کا تانتا لگ گیا۔

اور پھر یہی وہ وقت تھا جب ڈاکٹر فرید احمد اصل راستہ تلاش کرنے اور اپنی فلاح پانے کے بجائے ایک بار پھر حب جاہ کا شکار ہوگیا۔ وہ سمجھنے لگا کہ وہ لوگوں کا بھلا کر رہا ہے، لوگوں کی مدد پر آمادہ ہے حالانکہ ہر انسان کی عقیدت اس کے اپنے تاج میں ایک نیا نگینہ تھا ——

ایک بار پھر اس کے اپنے نفس نے دلدل میں پھنسا دیا!

اپنے علم کو اپنے عمل درست کرنے کے بجائے اس نے لوگوں کو اپنی علمی دسترس سے مرعوب کرنا شروع کر دیا۔ اس کی گفتگو سے متاثر ہو کر لوگ اس کے ہاتھ چومنے لگے۔ شہرت کا یہ دور سب سے خطرناک تھا۔ روح پژمردہ ہو کر کیپسول میں دم توڑ گئی۔ جسم بے عمل رہ کر پھیلتا چلا گیا۔ مذہبی تجربے سے بھی ڈاکٹر فرید احمد کو سحر القلوب کا تعویذ ہی ملا جسے وہ انگریز کی طرح پالیسی بنا کر استعمال میں لایا..... اسے اپنی فلاح کا راستہ نہ بنا سکا۔

تجربات بھی عجب ہیں۔ کچھ لوگ بار بار مختلف تجربات سے گزرتے ہیں اور ہر بار ایک ہی سبق سیکھتے ہیں۔ ایسے ہی بدنصیبوں میں سے ایک ڈاکٹر فرید احمد بھی تھے۔ ہر تجربے سے اس نے تکبر، حب جاہ، انا ہی کا سبق لیا..... اور تعجب یہ ہے کہ اسے علم ہی نہ ہوا کہ وہ کس دلدل میں گر گیا ہے!

شطرنج چال

"آپ سر پھر کھول کر بتائیے ناں — انسان کس قدر مختار ہے اور کتنا مجبور؟ اس کا اپنا ارادہ نتائج پر کہاں تک حادی ہے اور نتائج اس کے ارادے سے کیسے آزاد ہیں؟" دراز قد، ماڈل جیسی ایک لڑکی نے سراسیمہ آواز میں پوچھا۔

پروفیسر نے بورڈ پر نظر ڈالی۔ وہاں بائی نومیئل تھیورم وحدت الشہود کی طرح لکھی تھی۔ پہلے ایک اکائی اور پھر اس اکائی کے برابر پر تو...... ٹکڑے...... چھوٹے چھوٹے اجزا میں منقسم چھوٹی چھوٹی وحدتیں..... "تم کو ایسے سوالوں سے کیا غرض! جم کر پڑھائی کرو اور امتحان میں اپنی پوزیشن بہتر بنانے کی کوشش کرو — ورنہ آگے چل کر مشکل ہوگی۔"

سارے طالب علم اسمبلی کے ممبران کی طرح ڈیسک بجانے لگے۔ ماڈل سی لڑکی اچانک اوئے اوئے کی زد میں آ گئی۔

"سر آپ کو معلوم نہیں ہم نوجوان کس ابتلا سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے ماں باپ کی دی ہوئی اقدار چلتیں نہیں۔ وقت سارے کا سارا مادے میں ڈھل گیا ہے، مادہ اقتصادیات کی نذر ہو چکا ہے — ہم مجسم سوال ہیں سر...... ان سوالوں سے جب تک ہمیں چھٹی نہیں ملے گی، ہم پڑھائی کر سکتے ہیں نہ زندگی ہی میں کچھ کر سکتے ہیں —"

پروفیسر نے اپنی پرانی ٹائی کی گرہ ذرا ڈھیلی کی اور جیسے اپنے آپ سے بولا —

"برخوردار سوال تو صرف ایک ہے — جواب صدیوں سے مختلف نکلتے آتے ہیں۔ زندگی ہر انسان سے صرف ایک سوال پوچھتی ہے — تم کو جو کچھ ملا تھا اس کا تم نے کیا بنایا؟ جواب ازل سے ابد تک مختلف نکل رہے ہیں۔ زندگی آپ کو کچھ خوبیاں دیتی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ کچھ خرابیاں ہیں، کچھ handicaps ہیں۔ کچھ مثبت واقعات، کچھ منفی

مواقع ملتے رہتے ہیں اور یہی مواقع قوس قزح کی طرح فضا میں تحلیل بھی ہو جاتے ہیں۔ کسی کو پرچہ حل کرنے کے لیے ستر برس ملتے ہیں کسی کو بہت کم عرصہ..... ہر بار سوال وہی ہے..... تم نے اپنی گیلی مٹی کا کیا بنایا؟ — پیالہ، پرات، دیا، گھگھو گھوڑا — گلدان یا پھر اس کا کچا گھروندا بنا کر خود ہی لات مار دی — جواب مختلف نکلا کرتے ہیں، سوال وہی ہے۔"

صراحی سی سڈول لڑکی کھڑی ہو گئی اور پہلے سے زیادہ سراسیمہ آواز میں بولی —

"یہ بتائیے سر کیا انسان جواب نکالنے پر قادر ہے؟ کیا سارا جواب اس کی مرضی سے نکلتا ہے کہ جواب in parts کبھی انسان کی مرضی کے تابع ہے اور کبھی کسی بڑی طاقت کی رضا سے نکلتا ہے؟ — ہم مجبور ہیں کہ خود مختار؟ بتائیے سر!"

پروفیسر چند لمحے اپنی عینک پرانے گندے رومال سے صاف کرتا رہا، پھر بولا —

"آج میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ آج کا زمانہ کہانیوں کا دور نہیں — تم سب میڈیا کے ہاتھوں روح کے تحیر سے محروم ہو چکے ہو۔ اب انسان حیرت میں جانے کے لیے وائیلنس کا سہارا لیتا ہے۔ اتنا تشدد کہاں سے آئے جو تحیر کا باعث ہو! پھر بھی آج ایک پرانی کہانی سنو — تمہیں ازلی سوال کے کئی جواب خود سوجھ جائیں گے —"

پروفیسر کی آنکھوں میں کسی داستان گو کی چمک تھی۔ اس کے لب عیار اور مسکراہٹ دل نواز ہو گئی۔ ہاتھوں میں نرت اور انداز میں لے آ بسی —

"یہ بڑی پرانی بات ہے —

پھر تو چل سو چل...... آگے سے آگے...... زنجیر سے زنجیر ملی — راستہ نئے راستے میں گم..... چل چلا..... چل سو چل..... تم نوجوان کیا سمجھتے ہو زندگی کے عجائبات کسی ایک زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں..... کیا اللہ کا جادو کسی ایک عہد، کسی خاص طبقے، کسی ایک انسان کے ساتھ وابستہ ہے؟ — سنا ہے بخارا میں ارسلان بیگ کے زمانے میں جب ملا نصر الدین کو گرفتار کرنے کی مہم جاری تھی، درمیانے قدو قامت اور درمیانی شکل و صورت کی ایک عورت تنگ و تاریک گلی میں اپنے چار بچوں سمیت رہتی تھی۔ اس کا زین ساز شوہر ایک عرصہ سے لاپتہ تھا۔ وہ عموماً گلی کی نکڑ پر چادر پھیلا کر ٹوپیاں، چاقو، تپائیں، جوتے بازار سے خرید کر اس چادر پر پھیلا دیتی اور معمولی نفع پر انہیں بیچ کر گزر بسر

کرتی۔ گو شکل و صورت گل جان کی سادہ اور کشش کے بغیر تھی لیکن اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی جادوئی چمک تھی کہ راہ چلتے رک جاتے اور بات کرنے پر مجبور ہوتے۔ گل جان کے پاس ایک خوبصورت پنجرہ تھا جس میں دو طوطے ہمیشہ رہتے۔ گل جان کا خیال تھا کہ ان میں سے ایک اس کا زین ساز شوہر تھا جو ایک مدت سے گم گشتہ تھا۔ اگر قضا کار کبھی طوطا مرجاتا تو گل جان ایک نیا طوطا خرید کر پنجرے میں بند کرلیتی..... اپنے شوہر کی غیر موجودگی کی وہ متحمل نہ ہوتی۔

ایک روز سر پر پنجرہ اٹھائے وہ قصاب کی دوکان پر پہنچی۔ یہاں ایک بوڑھے، یوسف صورت، دھلے دھلائے پیر فرتوت سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ بزرگ معتبر زمانہ تھا لیکن خانہ داری کے امور سے لاچار — گل جان جب گوشت لینے قصاب کی جانب بڑھی تو پرُامید، پرکشش چمک کے ساتھ اس نے خوبصورت بزرگ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے کوندے دیکھ کر پیر فرتوت کے دل میں ایک سسکی جاگی۔ بلاتکلف اپنا عندیہ عورت سے بیان کیا کہ گھرداری کے عذابوں سے عاجز آچکا ہوں، تو اگر گھر سنبھالے تو بڑھاپے میں سکون پاؤں۔ گل جان کو کسی ستارہ شناس نے بتا رکھا تھا کہ جھرمٹ قوس میں ابلاہ ستارے عقرب کے عینی ستاروں کے خلاف ہیں۔ وہ کوئی قدم اٹھانے کی مجاز نہیں کہ یہ وقت دافع بلا نہیں، مصیبت میں پھنس جائے گی۔ لیکن جعفر سود خور نے اس کی زندگی تنگ کر رکھی تھی۔ وہ اس کے گھر سے تمام نئے برتن، کپڑے، لحاف زبردستی چھین لے جاتا۔ اس نے بزرگ سے حامی بھرلی اور گویا ہوئی کہ.... اے دین دار! یہ طوطے کی جوڑی خریدی ہے، بچوں تک پہنچا آؤں — پھر تیرے حضور آتی ہوں۔

پیر فرتوت بولا — چل کر گھر کا راستہ دیکھ لے، پھر اپنے بچوں کو اطلاع دے آنا۔
اس لمحے تک گل جان اپنے ارادے کی مالک، اپنے فعل پر حاوی تھی لیکن ستاروں کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پنجرے کو سر پر سنبھالتی پیر فرتوت کے پیچھے قدم مارتی محل نما عمارت تک پہنچی کہ جس کی برجیاں آسمان میں کھوئی ہوئی تھیں اور پھاٹک در دالان، دالان در غلام گردش کھلتا۔ غلام گردش اتنے فراخ کہ ہاتھی بھی آسانی سے گردش کرسکتے تھے۔

جس وقت پیر مرد موتیوں کی آبدار تسبیح پھیرتا بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوا طائفے دار، حقہ بردار، مور چھل جھلانے والے لڑکھڑاتے بھاگتے آن حاضر ہوئے۔ پیر

فرتوت ایک تخت پوش پر آراستہ ہو کر دم درست کرنے لگا۔ گل جان دست بستہ ہمکلام ہوئی کہ آقا اجازت دے، یہ طوطے کی جوڑی اپنے بچوں تک پہنچا آؤں۔

بزرگ کے دل میں پھر سسکی جاگی۔ طنطنے سے بولا — سن اے حقیر چیونٹی! میں زائچہ شناس ہوں۔ تیرے طوطوں پر ایک نظر ڈالی۔ قیافہ لگایا کہ ستارہ الشعلہ جو ضرب کی علامت رکھتا ہے اور جو بدیہی طور پر دل کی سمت میں الٹے پاؤں چلتا ہے اور ستارۂ الغفر جو عدد میں تین اور مثل عورت کے نقاب کے لرزاں رہتے ہیں، اس وقت آویزش کی صورت میں ہیں۔ میں تجھے قصاب کی دوکان پر آگاہ نہ کرسکا اس لیے ساتھ لے آیا۔ ٹھہرتی ہے تو ٹھہر.... جا، نہ رہنا چاہے تو تیری مرضی لیکن ایک بات ہے کہ آج ٹھہرا منگل اور ستارہ مریخ کی کروٹ کا دن۔ وہ نہ ہو کہ امیر کے پیادے تجھے اس ہیت کذائی کے باعث کہ طوطوں کا پنجرہ سر پر ہے اور پاؤں میں جوتی تک نہیں، تجھے ملا نصرالدین کا جاسوس گردانیں اور پکڑ لے جائیں۔ تیری بے کسی تیری بے حرمتی کا باعث بنے اور تیرے بچے دربدر ہوں —

گل جان عورت تھی لیکن خودمختار۔ اپنے ارادے کی پختگی کے باعث خوف سے آزاد تھی اور اپنے فعل کی عقوبت سے نا آشنا — دل میں گمان گزرا کہ پیر فرتوت کہیں کوئی جال نہ پھیلاتا ہو، ستاروں کے نام و قیام سے متاثر نہ ہوئی۔ نتائج کے اندھے کنویں کو پس پشت ڈال کر بناوٹی دہشت سے بولی — تو ٹھیک کہتا ہے بزرگ دین دار — پر میری ممتا اس بات کی مقتضی ہے کہ بچوں کو اطلاع دیے بغیر کہیں قیام نہ کروں ہرچہ بادا باد مجھے اجازت دے کہ گھر پہنچوں اور جلد لوٹ آؤں —

ٹیڑھی گردن والے بزرگ نے ایک لمبی سسکی بھری اور بادل نخواستہ اجازت دی۔ محل نما عمارت سے کوئی پون کوس دور گئی تھی کہ ایک پہرے دار ملا — طرح دار اور بلا کا حسین، آنکھ میں شربت دیدار گھلا ملا — رنگت میں گلاب کی پتیوں کی نرمی، ہونٹوں کے کنارے مسکراہٹ سے ہمکنار، ہاتھ سڈول، کندھے مضبوط، سینہ چوڑا — پہرے دار کو شک گزرا کہ نقاب کے اندر کوئی بھڑوا مردوا ہے کہ بھیس بدل کر کنسوئیاں لیتا ہے، امیر کے بدخواہوں سے ملا ہے۔ فوراً تلوار سے نقاب پلٹ دیا۔

گل جان نے مشکل سے پنجرہ سنبھالا اور گلی کی دیوار کے ساتھ خوف سے سٹک

گئی۔ سوچنے لگی کہ کیا واقعی تقدیر کا پھندا آگے آگے چلتا ہے اور انسان کو گرفتار کراتا ہے؟ کیا انسان اتنا خود مختار ہے کہ اپنی مرضی سے اس پھندے کو پھلانگ جائے؟ کیا ستارہ شناس واقعتاً تقدیر کے جال کو دیکھ سکتا تھا؟ — گل جان پُرامید رہنے کی عادی تھی — ساری عمر خود مختار رہی اس لیے پنجرے پر الٹے نقاب کو اتارتی ہوئی مسکرائی — اس کی نگاہوں کی خیرا کن چمک کو دیکھ کر پہرے دار اس کی جان کے درپے ہوا۔ ڈرا دھمکا کر سوندھی مہک والی کو زیر دام لانا چاہا پر حربہ کارگر نہ ہوا۔ گھر پہنچانے کا دم دلاسہ دے کر گھوڑے کے پیچھے بٹھایا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ گل جان نے سوچا طوطوں کی ننھی ننھی سی جانیں، کیا جانے بارش کا ریلا تیز ہو جائے۔ گھوڑے پر سوار ہوئی۔

اب کیسے کہیں گل جان کی خود مختاری نے اس کا راستہ بدلا کہ تقدیر نے اس کے پیروں میں رسی باندھ کر گھسیٹا..... تو طالب علموں اس قدر جان لو کہ گل جان خود گھوڑے پر سوار ہوئی۔ تقدیر نے موقعہ بہم کیا، ارادے نے لبیک کہا۔ پہرے دار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دشت کی جانب مڑا۔

پھر تو چل سو چل.....

چلا چل.....

راستہ معین..... وقت طے..... حالات مقرر.....

اپنے ارادے سے یا تقدیر کی ایما سے ایک کال کوٹھری میں جا کر گل جان کو اتارا کہ در و دیوار جس کے شکستہ، اندر جانے والا دروازہ شکستہ تر، دیواروں پر جالے..... چارپائی جھلنگا، فرش غبار سے اٹا ہوا — پہرے دار نے سر سے پگڑی اتاری اور گل جان کے قدموں میں رکھ کر کچھ اس طور گڑگڑا کر ملتجی ہوا کہ گل جان کے حواس قائم نہ رہے۔ حسن ظاہری نے پورے طور پر اسیر کیا۔ اپنے ارادے سے واپس جانے کا خیال پس پشت ڈالا۔ جب تک پہرے دار اس کے ساتھ رہتا، گل جان سر سے پاؤں تک اس کے عشق میں یوں غرقاب رہتی کہ بچوں تک کا خیال نہ آتا — جونہی جوان رعنا شہر کی طرف چلا جاتا، وہ سوچتی۔

یا مظہر العجائب یہ سب کیا ہے؟ — پل بھر پہلے پیر فرتوت کے محل میں کھڑی تھی کہ نعمتیں، عنایتیں سب بہم تھیں — کچھ دیر بعد تقدیر نے یہ پلٹا کھایا کہ اس کال کوٹھڑی

میں لا بٹھایا جہاں پانی نام کی شے بھی کوسوں دور ہے۔

بچوں کی یاد ستاتی تو سوچتی کہ چلی جاؤں — پر جو فیصلہ نظر کی ایک بھول چوک سے شروع ہوا، اب سنگین عشق میں منتج ہو چکا تھا۔ حسن ظاہری اس پہرے دار کا اس درجہ یکتا تھا کہ اس کی موجودگی میں گل جان جان بکف رہتی اور اس کی غیر موجودگی میں انتظار اسے نیم بے ہوش رکھتا۔

سوچتی..... بچے اکیلے ہوں گے، بھاگ جاؤں۔

خود مختار ہوں، کسی کی پابند نہیں۔

پر تقدیر کے ہاتھوں مجبور تھی.....

سنا ہے تقدیر کے پاس بھی کئی ہتھکنڈے ہیں۔ وہ ان ہی سے راستے روکتی اور راہیں وا کرتی ہے —

یہ بھی تم طالب علموں نے سن رکھا ہو گا کہ روح جمال کی طرف کھنچتی ہے۔

عشق کبھی بدہیتی کی طرف مائل نہیں ہوتا کہ روز ازل سے یہ بھی طے تھا کہ انسان کی روح از خود ازلی جمال کی طرف راغب رہے.....

جہاں تک خود مختاری کا تعلق تھا، بھاگ جانا چاہتی۔

جہاں تک تقدیر مجسم جمال بن کر حائل تھی، جنگل میں رہنے پر مجبور تھی۔

پھر تو گل جان برسوں تڑپی..... ہولے ہولے دل سے بچوں کا خیال بھی جاتا رہا۔

ایک پھول سی بچی کو جنم دیا۔ ہر چند وقتاً فوقتاً بچوں کی یاد ستاتی، لیکن عشق تقدیر صورت اٹل تھا۔ یوسف پہرے دار بن ساری دنیا اندھیر تھی۔ اس کے ساتھ سارا دشت مثل جنت لہلہاتا تھا۔ دن کو ہونکتی رہتی، رات کو کسی سائل کی طرح پہرے دار کے قدموں میں جا گرتی۔

سوچتی کہ چکر کیا ہے! —

میں یہاں کیوں ہوں اور جانے پر قادر کیوں نہیں.....؟

پھر تو چل سو چل..... چلا چل

ہوا یوں کہ رُت کی طرح حالات بھی بدلتے ہیں۔ جس سوراخ سے ہوا نہیں آتی وہاں سے اژدھا بدن سکیڑتا آ نکلتا ہے۔ ایک روز دشت میں دور سے نکتہ بھر دھول اٹھی۔

امیرارسلان بیگ کا ایک پھرتیلا جاسوس گھپ اندھیرے میں سرپٹ دوڑتا پہرے دار کے ٹھور ٹھکانے کی تلاش میں پہنچا۔

پہرے دار شفق کو رات میں ڈھلتے دیکھتا تھا۔ اونگھ سرقہ بالجبر کی مانند اس کے بدن پر چھائی تھی۔ پھول سی بچی بازو پر بے خبر سوتی تھی۔ سارے دن کے ہنگامے سے بدن چور، اٹھ کر جاسوس کو تیغ پر نہ چڑھا سکا۔ شہد اور تمباکو نے بدن کو آرام کی طرف راغب کر رکھا تھا۔ مدافعت نہ کر سکا۔ سچیت جاسوس ساونت آدمی دبے پاؤں حملہ آور ہوا۔ شلک اڑائی، مشکیں کس لیں اور گھوڑے پر اوندھا ڈال کر چمپت ہوا۔

گل جان پانی بھر کر لوٹی تو کیا دیکھتی ہے بچی خاک میں لتھڑی مردہ حالت میں بے دم پڑی ہے اور یوسف بے مثل کا کہیں پتہ نہیں — ماتھا ٹھنکا — جان گئی معاملہ بے ڈھب ہے۔

پھر تو طالب علموں چل سو چل

چلا چل.....

پل سے دوسرا پل

گھڑی سے دوسری گھڑی

کوس سے اگلا کوس

سارا دشت جان مارا۔ پاؤں زخمی، روح نڈھال..... پہرے دار کو تلاش کرتی دربدر شہر پہنچی۔ سر پر پنجرہ..... پنجرے میں ادھ موئے طوطے تھے — اس جوکھم کے باوجود نہ رنگت مدھم پڑی نہ آنکھوں کی چمک ماند۔ راہ چلتوں سے راستے پوچھتی، اپنا حال زار چھپاتی ایک سود خور کے پاس پہنچی کہ کچھ قرض لے کر زمانے کے روندن سے بچ نکلے — سود خور کریہہ منظر نے جو روکڑ دیا اس کی شرط یہ لگائی کہ پیش خدمت بنی رہ، سود معاف کر دوں گا۔ اصل سے گل جان نے ضرورت کی اشیاء لیں اور بسیرے کو عافیت جانا۔ دشت پیمائی سے چھٹکارا ملا تو گل جان اور طوطے فراغت سے سوئے اور اپنے رب کا شکر بجا لائے۔

چندے خیر سے گزری لیکن ایک رات کریہہ صورت جھانسو سود خور پچھلے پہر چراغ مانگنے کے بہانے حجرے میں آن گھسا اور ارادہ کیا کہ گل جان کو چھوڑے۔ ارادۂ

شہوت بھانپ کر گل جان نے بے کسی سے چراغ کی جانب نگاہ کی۔ آنسو رواں ہوئے اور چمک آنکھوں کی دھملی پڑ گئی۔

کانپتے ہاتھوں سے چراغ پکڑایا تو سود خور کی کلائی تک آئے ہوئے کلابتونی کپڑے نے شعلہ پکڑا — سود خور بھک رہ گیا۔ اس عمودی روشنی میں آپا دھاپی کا خیال جاتا رہا، سنتے ہیں کہ شہوت سے انترگیانی بھی بدھی میں نہیں رہتا۔ آگ نے ساری شہوت وداع کر دی۔ آناً فاناً سود خور کا چکنا جسم دھڑام گرا۔ گل جان نے جان کی امان پائی — فائدہ اپنی خود مختاری کا اٹھایا۔ پنجرا طوطے کا اٹھایا۔ حجرے سے بھاگی۔ اپنی طوفانی زندگی پر کف افسوس ملتی باہر نکلی۔ چاند پورا تھا۔ اسی روشنی میں بھٹکتی بھاگتی گئی۔ بارے ایک جگہ عافیت کی نظر آئی تو بیٹھ کر سوچنے لگی۔

کیا چراغ تقدیر کی صورت تھا؟

کیا میں از خود بھاگی کہ یہ بھی ارادہ کہیں بیرون سے میرے اندر داخل ہوا؟

میری تجویز نے میری جان بچائی کہ چراغ نوشتہ تقدیر کا سبب ہوا؟

سارے شہر میں سرگرداں، غلطاں و پیچاں اپنے سوالوں کا جواب ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ ایک سہ پہر کو آندھی سے پہلے کا سماں تھا، ایک سقہ گھنٹی بجاتا سامنے سے وارد ہوا۔ آدمی ہنس مکھ، خدا ترس نظر آیا۔ فقیرنی نے احوال بلاکم و کاست سارا بیان کیا۔ بچوں کے گم ہونے کا ماجرا سنایا۔ سقہ دو بھاشیا تھا۔ ایک بولی زبان کی سمجھتا، ایک دل کی۔ اس بپتا کو سن کر امید دلائی کہ یہاں سے کچھ ہی دور ایک کوچے میں ایک نوجوان گم سم ایسا ہے جو اپنی ماں کے گم ہونے کی داستان سناتا ہے۔ تو چل کر دیکھ، شاید تیرے دودھ کی خوشبو اس سے آتی ہو۔

دونوں آگے پیچھے روانہ ہوئے۔

گزر ایک تنگ گلی میں ہوا۔ ایک پکے چبوترے پر گل جان کو بٹھا کر سقہ نے اپنا مشکیزہ اتار کر رکھا اور گویا ہوا — دیکھ نیک دل! تو یہاں بیٹھ کر میری راہ دیکھ، میں اس نوجوان کو کھوجتا ہوں۔ سقے نے سامنے والی ڈیوڑھی پر دستک دی۔ ذرا سا پٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ گل جان یہ نہ دیکھ پائی کہ دروازہ کھولنے والا کون ہے۔ پہر دو پہر منتظر رہی لیکن سقہ برآمد نہ ہوا۔ دفع الوقتی کے لیے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ پھر راہ چلتوں سے باتیں

کرنے لگی۔ ایک راہ گیر سے سوال کیا کہ..... سامنے والے مکان کا مالک کون ہے؟ راہ چلتے نے کہا — برسوں پہلے یہاں ہنگامہ ہوا تھا۔ مالک مکان گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بیس سال سے گھر خالی پڑا ہے — سن غیرت مند! یہ کوچہ پارساں ہے۔ اس گھر کی اشیاء کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ یہاں راستے میں اشرفیاں پھینک دے، کوئی ایمان گنوانے کے خوف سے ایک اشرفی نہ اٹھائے گا — ایک نوجوان کبھی کبھی ادھر آ کر روتا ہے۔ پتہ نہیں وہ اصل میں مالک ہے کہ غم زدہ!

سارا دن گل جان نے کئی مرتبہ دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے مقفل دروازہ نہ کھلا۔ شام ڈھلے گل جان آخری بار دروازے تک گئی تو پٹ آدھا کھلا پایا۔

سوچا اندر جا کر سقے کو تلاش کروں۔

خوف مانع ہوا کہ اجنبی گھر، ان دیکھا کوچہ —

خوف بھی مثل تقدیر کے کبھی کبھی از خود راہیں بند کر دیتا ہے لیکن گل جان کہ خود مختار تھی، اپنے ارادے سے اندر داخل ہوئی۔

یا بندہ خدا مقام حیرت سارا گھر آراستہ اور ایک نفس بھی موجود نہیں..... نیک صفت سقے کا نام و نشان نہیں۔ چولہے پر ہنڈیا چڑھی پکتی ہے۔ طاق میں تازہ پھل خوشبو چھوڑتے ہیں۔ سوندھی خوشبو والے نان چنگیر میں دھرے ہیں۔ لیکن میزبان کا شائبہ تک نہیں — آوازیں دیں، بلایا۔

کوئی برآمد نہ ہوا تو گل جان نے دروازہ مقفل کر کے خوب کھایا۔ پانی تلاش کیا تو تمام نل سوکھے، برتن خالی۔ سارے میں پانی کا سراغ نہ پایا۔

بھاگ کر باہر چبوترے تک گئی۔ طوطے کا پنجرہ اور مشکیزہ اٹھا اندر لائی۔ چاندی کی کٹوری میں پانی انڈیلا تو امیر ارسلان بیگ کے عہد کی اشرفی کھٹاک سے کٹوری میں گری۔ دروازہ مقفل کر لیا۔ اب جو مشکیزہ الٹایا تو پانی کے ساتھ ساتھ اشرفیوں کی برسات ہونے لگی۔

اب تو چل سو چل

چلا چل

وقت گزرنے کی شرط

رہنے بسنے کی قید..... تقدیر اور ارادے کا سنجوگ.....

سنا ہے گل جان پھر بڑھی پھونس ہوئی — اندر ہی اندر وہ اس نوجوان کی راہ دیکھتی رہی جو کبھی کبھی اسی ڈیوڑھی پر آ کر سوگوار رویا کرتا تھا..... کہیں اس کے دل میں امید کہتی کہ یہ نوجوان اسی کا فرزند ہے۔

نچلی منزل میں گل جان کا قہوہ خانہ ہے — وہ کبھی کبھار نوجوان کی تلاش میں نیچے آتی ہے۔ اس کا سارا وقت تسبیح و ثنا میں گزرتا ہے۔ زائچے بنا کر دیتی ہے لیکن کسی سے کچھ وصول نہیں کرتی۔ امیر وقت اس کی خدمت میں حاضری دیتا ہے۔ لوگ اسے دانائے روزگار ہیپو کریٹس، حکیم بو علی سینا، الکندی فارابی، ابو بصرہ کے ہم پلا مانتے ہیں۔ عمائدین، دانا، وزرا کا تانتا بندھا رہتا ہے — وہ زائچہ بنانے سے پہلے ایک بار ضرور کہتی ہے..... میں زائچہ بنا دوں گی — لیکن ایک سوال کا جواب نہیں دوں گی..... انسان کا ارادہ کہاں تک کامیاب ہے اور اس کی تقدیر کس قدر حاوی ہے؟ — یہ دو قوتیں باہم دگر دست و گریبان ہیں کہ ہم راز و دم ساز — ارادہ مجبور ہے یا کلی حاکم — تقدیر گھیرنے والی ہے کہ چھاپہ ڈالنے والی — بس یہ بات یاد رکھ، زائچہ بن جائے تو اس کو صرف تنبیہہ جان..... یاد رکھ زندگی ایک ہی سوال پوچھتی ہے..... تو نے اپنی گیلی مٹی کا کیا بنایا؟"

ساری کلاس سکتے میں آ گئی۔

پھر ماڈل جیسی دراز قد سراسیما لڑکی اٹھی اور کھلے بالوں کو ہاتھ کی پشت سے اٹھاتے ہوئے بولی — "سر کچھ کلیئر نہیں ہوا اس کہانی سے..... کیا انسان مجبور ہے کہ خود مختار؟ — کہاں تک اس کا ارادہ خود چلتا ہے اور کہاں پہنچ کر اس کی قسمت اسے دبوچ لیتی ہے؟"

پروفیسر نے کچھ دیر تک پائپ پر توجہ دی، پھر اسے سلگائے بغیر بولا — "تم جانو کہ اللہ نے ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی — مرد عورت زوج..... رات دن زوج..... نیکی بدی جوڑا..... حتیٰ کہ پہاڑ بھی Male اور Female ہوتے ہیں..... دل میں لہو بھی زوج کی شکل میں رہتا ہے، گندا لہو اور صاف لہو ساتھ ساتھ..... اگر صرف پوزیٹو کرنٹ سے روشنی پیدا کرو گی تو بجلی نہیں جلے گی، پھر نیگیٹو کرنٹ بھی ملانا پڑے گا..... ایسے ہی انسان کی خود مختاری اور قسمت بزوج ہیں..... ساتھ ساتھ ریل کی پٹڑی کی طرح چلتی ہیں۔ جہاں دونوں کا میل

ہوتا ہے، وہاں کرنٹ پیدا ہوتے ہیں۔ ترقی کا بقعہ نور..... بربادی کا گھپ اندھیرا..... سب ان دونوں کے ملاپ سے ہے —"

ایک دراز قد منفی سوچ کا نوجوان اٹھا۔ ابھی صبح ہی وہ اپنے والدین کو نوٹس دے کر آیا تھا کہ اب وہ اپنے آبائی گھر میں نہیں رہے گا۔

"سر آخر میں گل جان جس حویلی میں داخل ہوئی، وہ معجزہ نہیں تو کیا ہے۔ قسمت کی دھنی تھی تو انجام کار کامیاب ہوئی —"

"قسمت کی دھنی بھی تھی اور ارادے کی بھی..... اگر وہ خالی حویلی دیکھ کر بھاگ جاتی تو —؟"

دراز قد لڑکی نے پوچھا — "اور سردہ نوجوان..... وہ غمزدہ نوجوان —؟"

"وہ ہر دور میں ہوتے ہیں۔ ہر مقام پر رہتے ہیں۔ اسی کلاس میں تلاش کرو تو مل جائیں گے جنہیں قسمت اور ارادہ دونوں خوش نہیں کر سکتے — پہچان لو..... آس پاس"

آہستہ آہستہ، ایک ایک کر کے کلاس کے سارے لڑکے کھڑے ہو گئے.....

پروفیسر نے مسکرا کر کہا — "بھئی یہ اس دور کا وائرس ہے..... میں اس مایوسی کو اچھی طرح نہیں جانتا..... اب کامیاب بھی ناخوش ہے..... اور ناکام بھی سوگوار..... یہ ایڈز سے اگلی بیماری ہے جس کے Syndromes کو ابھی میں پورے طور پر جان نہیں سکا۔ کچھ بھید پایا تو عرض کروں گا، صرف اتنا جان پایا ہوں کہ مایوسی کا وائرس قوی تر ہے اور اس کا علاج شاید لیبارٹری میں نہ ہو پائے۔"